READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ

سچی کہانیاں

September
2016

امجد صابری کا زندگی نامہ

اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

☆...... "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆...... ایم اے راحت کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ "زرد لومڑی" اور کاشی چوہان کا ناول "زہر عشق"

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ

سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے   جلد: 33 - شمارہ: 09   ستمبر: 2016ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی ... OB-7 تالپور روڈ، کراچی

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 53 ڈالر / قانونی مشیر محمد شیرازی ایم ایم ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں جگ بیتیاں اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابل یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com



مقدر

وزیراعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف صاحب نے طویل مدت کے بعد بہت سنجیدہ بیان دیا، وہ کہتے ہیں کہ سنجیدہ سیاست کنٹینر پر چڑھ کر نہیں ہوتی بالکل درست! سنجیدہ سیاست زمین پر پاؤں ٹکا کر ہی کی جاسکتی ہے۔ خان صاحب کی طرز سیاست کے تو بہت سے لوگ قائل نہیں۔ کیونکہ سیاست کھیل تماشہ، گانا بجانا نہیں۔ یہ واقعی میں بہت سنجیدہ عمل ہے۔ لوگوں کا مجمع تو بندر والا بھی لگا لیتا ہے۔ منجن والا بھی خوش ربا باتیں کر کے اپنا منجن بیچ ڈالتا ہے۔ کپڑے بیچنے والی کمپنیاں ہوں یا موبائل فون بنانے والے، جوتے بیچنے والے ہوں یا لولی پاپ تیار کرنے والے، سب بینڈ باجے، ناچ گانے کے ساتھ اپنی مصنوعات کی تشہیر کرتے ہیں۔ لوگ دلچسپی سے ایسے اشتہارات دیکھتے ہیں اور خریدتے بھی ہیں مگر جوتا بیچنا یا لولی پاپ بیچنا بہت مختلف ہے سیاست سے، سیاست میں جوتے پڑتے ضرور ہیں..... قوم کو لولی پاپ بھی دی جاتی ہے مگر پھر بھی سیاست ایک سنجیدہ طرز حکومت کی ابتدا ہے۔ اچھے سیاست دان کا کام قوم میں شعور بیدار کرنا ہوتا ہے۔ ناچ گانا کر کے مجمع اکٹھا کرنے والے کو تو کچھ اور ہی کہتے ہیں..... سیاست والوں سے تو اب کسی اچھائی کی توقع نہیں مگر ہم عوام اب بھی سدھر سکتے ہیں، سنبھل سکتے ہیں.....

کیونکہ معاملہ ہمارے وطن کا ہے، معاملہ ہماری آنے والی نسلوں کا ہے، معاملہ ہماری بقا کا ہے۔ آئیں عہد کرلیں کہ آئندہ کسی ایسے مجمع کا حصہ نہیں بنیں گے جہاں قوم کے بجائے ہجوم ہوگا، جہاں تقریر کرنے والا سنجیدہ سیاست دان کے بجائے بندر کا تماشا دکھانے والا ہوگا.....

ہم نے اگر صرف اتنا بھی کرلیا تو یقین مانیں ہمارا نام بھی تاریخ میں روشن حروف سے لکھا جائے گا دوسری صورت میں تاریکی ہی ہمارا مقدر ہے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

گلِ مہر کے پھول دیکھے ہیں آپ نے...... گلابی گلابی' سفید سفید ایک گچھے کی صورت۔ نظروں کو ایسے بھلے لگتے ہیں کہ آپ ہی آپ اُن پر پیار آجاتا ہے۔ اور اسی طرح کا موسم آج کل ہماری طرف بھی رہا۔ گیلی گیلی دھوپ کے گچھے برساتا بادل راجا' مسرتیں برساتا رہا۔ محبتوں کی ہلکی سی دستک' ایک آہٹ بھی بھی کدورتیں صاف کردیا کرتی ہے۔ سنہری سنہری کونجیں جب کوکتی ہوئی' لمبی اڑان بھرتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے ان میں کسی راکٹ کا انجن فٹ کردیا گیا ہے۔ مدھم مدھم چراغ اوڑھتی آنکھیں بھی اس منظر کو دیکھ کر مسکرا اٹھتی ہوں گی۔ لگتا ہے مسکراہٹوں کے ٹھنڈے گلاب ہمارے پاس رہے نہیں ہیں۔ مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ کچھ ساتھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وزیر جذباتی ہوجاتے ہیں۔ اُف!! اس پر ایک رحم محبت میسج سروس بھی ہے۔ بہت کوشش کی کہ اپنے کام سے کام رکھا جائے۔ اور کام بھی کیا...... بس لکھو اور لکھتے جاؤ کیکن نہیں...... ہم سو سے زائد تحریریں شائع ہونے کے بعد بھی خود کو طفلِ مکتب سمجھتے ہیں۔ کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ درجن بھر ایوارڈ تو میری شیلف میں بھی میری محنت اور ادب سے محبت نے میرے نام کیے ہیں۔ کبھی کام سے فرصت ہی نہ ملی کہ اس طرف دھیان دیا جائے۔ اب چونکہ سمجھنے سمجھانے کا زمانہ گزر گیا ہے اس لیے 'عظیم لکھاری' ہمارے پرچے میں شاید نہ چھپ سکیں۔ ادب کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں کے لیے بہت سارے دوسرے راستے پھول بچھائے منتظر ہیں۔ اُن سب کو فی امان اللہ اور اب صرف میرٹ ہی سب سے بڑا ہتھیار ہوگی۔ عظیم لکھاریوں سے گزارش ہے کہ اپنے تبصروں میں یا کالز پر تردیدیں اور صفائیاں پیش کرنے سے گریز کریں۔ ساتھیو! ایوارڈ تقریب کی تاریخ کا اعلان بہت جلد کردیا جائے گا۔ آیئے اب ہم اپنی محبتوں کے طلسم کدے کا رخ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں۔ حسن ابرار رضوی۔ ساہیوال سے۔ کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کررہے ہیں۔ ماہ اگست کا سچی کہانیاں بہت جلد مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوبصورت پیش کیا گیا ہے۔ منزہ سہام نے ایدھی کے نام اداریہ بہت اعلیٰ لکھا اور کاشی بھائی نے احوال کی محفل بہت زبردست سجائی ہے، تمام احوالی خوش اخلاقی سے محوِ گفتگو ہیں۔ ہر چہرہ کھلکھلا رہا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سما رہا ہے۔ ممتاز احمد صدارت کی کرسی پر بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور مجید احمد جائی سر جھکائے حکم کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ صائمہ مجید، ایم اے راحیل، کنزہ ملک، سونیا خان، ایم مجاہد حسین جائی، سید ملازم حسین شیزازی، عمارہ ناز، غزالہ کرن، بشریٰ کنول نے بہترین احوال لکھے مبارک باد۔ عشال احمد نواب کو خوش آمدید، آتے

رہے گا جناب۔ اِن کے ساتھ تمام نئے آنے والوں کو خوش آمدید اور پرانے احوالیوں کے لئے سلامتی کی دُعائیں۔ ایدھی کے نام لکھی نظم پیاری تھی، کہانیوں میں لائف بوائے ہر بار عمدہ ہوتی ہے۔ بہت کچھ سکھاتی ہے یہ تحریر۔ رب کا انصاف، وہ پھر زندہ ہوگئی، وہ فرشتہ، بیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، بندر کا پنجہ، کے ساتھ ساتھ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سب سے اچھوتی تحریر ''رات کا مسافر'' تھی، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کو بہت بہت مبارک باد۔ قبول ہو۔ زہر عشق کی کمی محسوس ہوئی، زرد لومڑی نے چاشنی برقرار رکھی۔ بھارت میں بلیک لسٹ اچھی جارہی ہے اس کے علاوہ مستقل سلسلے اعلیٰ چل رہے ہیں۔ پُراسراریت سے بھرپور شمارہ دل جیت گیا۔ تمام پرچے کو خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔

☆: پیارے احسن! تبصرہ اچھا کیا تم نے۔ سلامت رہو۔

⋈: عشال احمد نواب کی ملتان شریف سے آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ماہ اگست کا سچی کہانیاں پُراسرار نمبر 2 ملا۔ ٹائٹل بہترین مزین کیا گیا ہے۔ نچلے کونے میں چڑیل کی تصویر ڈرا رہی ہے۔ منزہ سہام نے اداریہ اعلیٰ لکھا۔ عبدالستار ایدھی اور تمام مرنے والے کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ راحت وسکون نصیب فرمائے۔ کاشی بھائی آپ کی باتیں بہت تڑپاتی ہیں۔ ممتاز احمد، مجید احمد جائی، صائمہ مجید، صبا نور، کنزہ ملک، سونیا خان، ایم مجاہد حسین جائی، احسن ابرار رضوی، ایم اے راحیل، ملک علی رضا، عمارہ ناز، غزالہ کرن، بشریٰ کنول، سید ملازم حسین شیرازی کے تبصرے خوب تھے، کہانیوں میں رب کا انصاف، وہ چتکبری بلی، آخری شرارت، بیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، بندر کا پنجہ، رات کے مسافر زبردست کہانیاں تھیں۔ قسط وار صرف زرد لومڑی پڑھنے کو ملی، زہر عشق، اور بادیان نے انتظار کی سولی پہ لٹکا دیا۔ بھارت میں بلیک لسٹ مزہ دے گیا، مستقل سلسلے بھی اچھے رہے، پُراسرار نمبر نے رونگٹے کھڑے کردیئے۔ کاشی بھائی زندہ باد، زندہ باد۔

☆: اچھے عشال! تم نے احوال میں آکر ہمارا مان بڑھایا۔ اب ہر ماہ آتے رہنا۔

⋈: آداب ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا۔ رجب والا ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں ماہ اگست کا تازہ چمکتا دمکتا شمارہ ادارہ کی طرف سے موصول ہوا۔ لفافہ چاک کیا تو سرورق نے دل جیت لیا۔ پُراسراریت سے مزین پرچہ، واہ مزہ آگیا۔ منزہ سہام نے عبدالستار ایدھی پہ اداریہ لکھ کر حق ادا کر دیا۔ عبدالستار ایدھی کا زندگی نامہ بھی سچی کہانیاں کی زینت بنائیں۔ احوال کی محفل میں کاشی بھائی سبھی احوالیوں کو اپنے پاس محبتوں کے ساتھ بٹھائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ محبتوں، چاہتوں کا درس کوئی اِن سے سیکھے۔ بڑی گہری اور غور وفکر کرنے والی باتیں کرتے ہیں۔ سبھی احوالیوں کے تبصرے بھی سپر تھے۔ میری طرح چند پرانے نام کہیں غائب ہو چکے ہیں۔ لوٹ آیئے۔ میں بھی پھر سے اس محفل میں آ گیا ہوں، مصروفیات تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں، مگر کیا کریں کاشی بھائی کی محبتیں کھینچ لاتی ہیں۔ اب دیکھو ناں، ''رات کے مسافر'' کو چھاپ کر میرا مان بڑھا دیا۔ شکریہ کاشی بھائی۔ پیارے مجید احمد جائی کی کہانی ''بیری کا درخت اور وہ'' بہت پیاری تحریر تھی۔ اس کے علاوہ، سرسوں کا ساگ، آخری شرارت، جائزہ، وہ کنگن، میرا پیچھا چھوڑ دو، رب کا انصاف، بھید بھرا گھر، فریب نظر، وہ فرشتہ، پاور آف لو، بس ذرا سی چھاؤں، خمیازہ، بندر کا پنجہ، فرعون کے مجرم، پھر سے زندہ ہوگئی، اعلیٰ

کہانیاں تھیں۔ زہر عشق اس بار غائب تھی، زرد لومڑی خوب چل رہی ہے، بھارت میں بلیک لسٹ چھایا ہوا ہے اور مستقل سلسلے بہترین جا رہے ہیں۔ اتنا پیارا پُر اسرار نمبر سجانے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆: پیارے ڈاکٹر صاحب! کہانی کی اشاعت پر آپ کو بھی مبارک باد۔ احوال میں اسی طرح آمد مسلسل رکھیں ورنہ لڑائی ہوگی۔

✂: کنزہ ملک، قاسم پور کالونی، ملتان سے تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ آزادی کا مہینہ کیا شروع ہوا ہم تو گھروں میں دب کر رہ گئے۔ سچی کہانیاں نے ذرا، دھمکا دیا ہے۔ ماہ اگست کا پُر اسرار نمبر 2 پوری آب وتاب کے ساتھ ملا، سرورق پہ بیٹھی لڑکی مسکرا رہی ہے اور نیچے نکڑ میں کوئی چڑیل دکھائی گئی ہے، جس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ منزہ سہام کا ادارہ بہت بہت پیارا تھا۔ اِس بار احوال کی محفل خوب سجی ہے۔ سبھی احوالیوں کو میرا میٹھا میٹھا سلام، نئے آنے والوں کو ست بسم اللہ اور پرانے تو ہیں ہی اپنے۔ جن احوالیوں نے مجھے یاد رکھا، اُن کو سلام، ایدھی کے نام نظم، کاشی بھیا آپ نے خوب لکھی ہے۔ بھلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ، ہائے اللہ! کیا مجھے بھی ایوارڈ ملے گا، ؟ مجھے کیسے مل سکتا ہے، میں تو ابھی ابھی وارد ہوئی ہوں۔ ویسے جن کے ایوارڈ نہیں ہوں گے اُن کو شرکت تو کرنے دیں گے ناں۔ پُر اسرار نمبر 2 کی تمام کہانیاں اعلیٰ سے اعلیٰ تر تھیں، لیکن رات کے مسافر نے تو کمال ہی کر دیا۔ جنات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا نے عمدگی سے لکھا۔ زہر عشق نہ پا کر دل غمگین ہوا۔ پاور آف لو، رب کا انصاف، وہ فرشتہ، بس ذرا سی چھاؤں، خمیازہ، بندر کا پنجہ اور میرے پیارے سر جی مجید احمد جائی کی کہانی بیری کا درخت اور وہ نے خوب مزہ دیا۔ وہ کنگن، سرسوں کا ساگ بھی خوب تھی۔ پُر اسرار نمبر پُر اسراریت میں بازی لے گیا۔ ویلڈن کاشی بھیا۔

☆: پیاری کنزہ! تمہارا تبصرہ خوب ہوتا ہے۔ رہی ملکی حالات کی بات تو حالات کی آنکھ مچولی تو چلتی ہی رہتی ہے۔

✂: ایم۔ اے راحیل سنایئے کیسے ہیں؟ آزادی کے مہینے میں پُر اسرار نمبر۔ سرورق دیکھتے ہی جان نکلتی ہے۔ پورے پرچے میں صرف اداریہ ہی تھا جو پُر اسرار نہیں تھا۔ کاشی بھائی احوال میں پُر اسرار باتیں کر رہے ہیں۔ احوال کی محفل میں سکون و راحت ہے، ہر لب پہ مسکراہٹ اور آنکھیں شرارتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ تمام احوالی ایک دوسرے کے ساتھ محو گفتگو ہیں اور ہنس ہنس کر رونقیں بڑھا رہے ہیں۔ اور یہ سب کاشی صاحب کی مہربانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے خاندان کو سلامت تا قیامت رکھے آمین۔

احوال کی محفل سے نکلے تو کہانیوں کی وادی میں سیر کرنے لگے۔ جہاں ہر کہانی ایک نئے رنگ سے خوف پیدا کر رہی تھی۔ جیسے رب کا انصاف، بیری کا درخت اور وہ، بندر کا پنجہ، میرا پیچھا چھوڑ دو، سرسوں کا ساگ، بس ذرا سی چھاؤں، پھر وہ زندہ ہوگئی، میرا دولہا، خمیازہ، منفرد کہانیاں ہیں "رات کے مسافر" زبردست کہانی تھی۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ ہر ایک نے خوب محنت سے لکھا ہے۔ زرد لومڑی نے اچھا تاثر دیا ہے اور زہر عشق نے انتظار کی سوئی پہ لٹکا دیا ہے۔ بھارت میں بلیک لسٹ محمود شام کی صحافتی تجربے کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ مستقل سلسلے بھی خوب سے خوب تر

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 78/5.L تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

مبارک باد

ہماری ہر دل عزیز ساتھی شگفتہ شفیق کی صاحبزادی کنزل تابش لندن میں ایک پیاری سی بیٹی کی امی جان بن گئی ہیں۔ادارہ ان کی دائمی خوشیوں کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ نومولود کی صحت اور درازی عمر کے لیے بھی دعا گو ہے۔

ہیں۔اب اجازت۔

☆: راحیل! خوش رہو! تبصرہ اچھا کیا ہے تم نے۔اس بار تم سے کچھ دوستوں نے جواب طلب کیے ہیں امید ہے جلد جواب دو گے۔

✉: مجید احمد جائی۔ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔مزاج گرامی! اُمید ہے خیر بانٹتے ہوں گے۔اللہ تعالی خوش وخرم رکھے آمین۔پاکستانی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں اللہ خیر فرمائے،اس دوران سچی کہانیاں کا بروقت مل جانا خوشیاں بڑھانے کا سبب بنتا ہے۔پُراسرار نمبر 2 کا ٹائٹل لاجواب تھا۔مخموری آنکھوں والی دوشیزہ مسکرا رہی تھی اور کونے میں خوفناک مناظر دکھائے گئے ہیں۔ایدھی بھی چلے گئے ،بہترین اداریہ لکھا گیا۔وہ شخصیت ہی بے مثال تھیں جو جاتے جاتے آنکھوں کا تحفہ دے گیا۔ایدھی اچھے سلام! احوال کی محفل میں کاشی بھائی بڑی گہری باتیں کر رہے تھے۔پیارے ممتاز احمد صاحب کا تبصرہ پہلے نمبر پر تھ خوشی ہوئی۔نور صباء کا خط کیا اتنا ہی بولڈ تھا جو سنسر کرنا پڑا۔سونیا خان،عشال احمد نواب،احسن ابرار رضوی،کنزہ ملک،ایم اے راحیل،ایم مجاہد حسین جائی،ملک علی رضا،نفیسہ فضل،بشریٰ کنول،غزالہ کرن،عمارہ ناز،فرزانہ گل صاحبہ،علی اصغر انصاری،خضر حیات،سید ملازم حسین شیرازی،خواجہ حسین فیصل ندیم بھٹی،کے ساتھ ساتھ سبھی کے احوال سپرہٹ تھے۔جن دوستوں نے بندہ ناچیز کو یاد رکھا تہہ دل سے شکر گزار ہوں،کچھ پرانے ساتھیوں کی خیریت مطلوب ہے جن میں سدرہ انور علی،ملک عاشق حسین ساجد،مبارک علی شمسی،صفدر علی حیدری،منشی محمد عزیز مئے،مقصود احمد بلوچ،عبدالعزیز جی آئی،شعبان کھوسہ اور بہت سے ساتھی مہربانی فرما کر احوال کی محفل میں لوٹ آئیں۔عبدالستار ایدھی کے نام لکھی گئی آپ کی نظم نے دل جیت لیا۔اس بار ایک خبر نے راتوں کی نیندیں اُڑا دی اور وہ ہے پہلی سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب ......اس بار پُراسرایت سے بھرپور کہانیاں پڑھنے کو ملیں جن میں خمیازہ،بندر کا پنجہ،وہ چتکبری بلی،رب کا انصاف،بس ذرا سی چھاؤں،فرعون کے مجرم،وہ میرا دولہا،بھید بھرا گھر،میرا پیچھا چھوڑ دو،وہ کنگن،سرسوں کا ساگ،اور سب سے بڑھ کر منفرد کہانی ''رات کے مسافر'' تھی۔ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کو مبارک باد،انہوں نے بہت ہی شاندار کہانی لکھ کر پہلی انٹری دی ہے۔اس کے علاوہ ہائیڈ پارک،تیرنیم کش،بھارت میں بلیک لسٹ فٹ جا رہے ہیں۔

☆: اچھے مجید! جلد ہی ایوارڈ تقریب کی تاریخ کا بھی اعلان کر دیا جائے گا۔

✉: نور صباء،ملت کالج قاسم پور ملتان سے لکھتی ہیں۔ماہ اگست کا سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں ہے۔سرورق اچھا ہے اور اداریہ عمدہ لکھا گیا ہے۔ادھر آپ نے آزادی کے مہینے میں پُراسرار نمبر نکال کر ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے۔رب کا انصاف،میرا پیچھا چھوڑ دو،میرا دولہا،بندر کا پنجہ،خمیازہ،پھر وہ زندہ ہوگئی،بیری کا درخت اور وہ،رات کا مسافر نے ڈرا کر رکھ دیا۔اف اللہ۔ایسا بھی ہوتا ہے،انسانوں کے ساتھ۔۔۔توبہ توبہ۔۔۔اُس کے بعد شمارہ بند اور میرے آنکھیں بھی

بند۔۔۔۔ باقی کے تبصرے سے معذرت۔۔ اللہ حافظ۔۔

☆: پیاری نور! تبصرہ بولڈ نہیں تھا تمہارا، ہاں مگر لکھتے ہوئے بہت زیادہ جذباتی ہوگئی تھیں۔ لو اب پھر سے تم جذباتی ہوگئیں۔ خط پھر سے جو کٹ گیا لڑکی!!

✉: صائمہ مجید۔ ملتان شریف۔ پُراسرار نمبر تو وقت پر مل گیا۔ سرورق عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ ایدھی بھی چلے گئے، اچھا اداریہ منزہ سہام نے لکھا۔ ایدھی صاحب پہ جتنا لکھا جائے کم ہے۔ احوال میں پہنچے تو کاشی بھیا کی دل گیر باتوں نے رُلا دیا۔ میرے پیارے انکل ممتاز احمد صدارت کی کرسی پر بڑے سج دھج کے ساتھ خوبصورت لگ رہے ہیں۔ میرے سرتاج بھی قدم سے قدم ملائے ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر احوال کی محفل روز بروز خوب سے خوب تر ہوتی جارہی ہے، نئے اور پرانے احوالیوں نے اِس میں رنگ بھر دیے ہیں۔ جنہوں نے یاد رکھا، اُن کا شکریہ اور جنہوں نے یاد نہیں کیا اللہ اُن کا بھلا کرے۔ ایدھی کے نام نظم نے متاثر کیا۔ کہانیوں میں آخری شرارت، بیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، وہ میرا دولہا، آخری فرعون، رب کا انصاف، وہ چتکبری بلی، بس ذرا سی چھاؤں، پاور آف لو، وہ فرشتہ، فریب نظر، رات کا مسافر عمدہ اور کمال کی کہانیاں تھیں۔ زہر عشق نہ پاکر دل غمگین ہوا، زرد لومڑی اور بھارت میں بلیک لسٹ خوب جارہی ہیں، لائف بوائے نے دھوم مچارکھی ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش بہترین ہیں۔ سب سے خاص بات پُراسرار نمبر کی سلیکشن تھی۔ جو کاشی بھائی نے نہایت عمدگی سے کی اور سچی کہانیاں کو سجادیا، ویری ویلڈن کاشی بھیاء۔

☆: اچھی بہن! تبصرہ بہت پیارا لکھا۔ خوش رہو۔ من کی مرادیں پاؤ۔ ہر ماہ ہمارے احوال میں آؤ۔

✉: سونیا خان۔ بستی شاہ گردیز کوٹلہ رحم علی سے عرض گزار ہیں۔ ماہ اگست کا سچی کہانیاں 4 تاریخ کو ممتاز آباد سے خریدا۔ ٹائٹل بہت جاندار تھا۔ حسینہ بیٹھی مسکرارہی تھی اور چڑیل اُس سے چڑ رہی تھیں۔ منزہ سہام نے اداریہ ایدھی کے نام لکھ کر اعلیٰ ظرفی کا ثبوت پیش کیا۔ احوال میں کاشی بھیاء تمام احوالیوں کو اپنے اردگرد جمع کیے بیٹھے ہیں۔ محبتوں کی خوشبو ہر سو بکھری ہے۔ اللہ کرے یہ محبتیں سدا سلامت رہیں۔ تمام احوال پیارے تھے۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ جن ساتھیوں نے مجھے یاد رکھا، اُن کا تھینکس۔ سچی کہانیاں ایوارڈ تقریب کروا رہا ہے۔ بڑی خوشی کی خبر ہے، اور مجھ جیسے لوگوں کو خوشی سے ہارٹ اٹیک بھی ہوجاتا ہے۔ ذرا خیال کرنا۔ ویسے لاہور میں تقریب ہو تو مزہ آجائے گا۔ کراچی، کراچی ہے اور لاہور زندہ دِلوں کا شہر ہے، اس بہانے ہم بھی دیکھیں گے کہ زندہ دل وہاں رہتے ہیں یا۔۔۔؟ آپ کی ایدھی کے نام لکھی گئی نظم بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں رب کا انصاف، بیری کا درخت اور وہ، مجید احمد جائی کی کافی دیر بعد کہانی پڑھنے کو ملی۔ بندر کا پنجہ، وہ فرشتہ، بھید بھرا گھر، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، میرا دلہا، اچھی کہانیاں تھیں۔ رات کے مسافر نے متاثر کیا۔ زرد لومڑی اچھی چل رہی، زہر عشق اور بادیاں کی کمی محسوس ہوئی، انتظار کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔ پُراسرار نمبر 2 اوور آل بہت اعلیٰ اور عمدہ پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کاشی بھیاء اور سچی کہانیاں کی ٹیم کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میری طرف سے ڈھیروں ڈھیر مبارک۔

☆: پیاری گڑیا! تبصرے کا شکریہ۔ تبصرہ مختلف مگر جامع رہا۔

✉: ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے عرض گزار ہیں۔ ''کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد اب

خواتین کی محبوب قلم کار

'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کررہی ہیں

"دامِ دل" ...... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی ...... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو ......

"دامِ دل" ...... کہانی ہے اُس ماں کی ...... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھادیا

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

"دامِ دل" ...... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ...... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول "دامِ دل"

آپ کے اپنے ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

دوبارہ اس محفل کی رونق کو بحال کرنے آیا ہوں (ارے.....) اگست کا شمارہ 3 اگست کو ملا۔ ٹائٹل خوفناک تھا۔ جولائی کا سچی کہانیاں مجھے نہیں ملا تھا۔ مینا تاج اور زمان صاحب کی وفات کا پڑھ کر ایک شاک سا لگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ لیجنڈ محمد علی باکسر 5 جون 2016ء کو 71 برس کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ اگست کے سچی کہانیاں میں ایوارڈ تقریب کا اشتہار پڑھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تقریب زندہ دلانِ شہر لاہور میں ہوگی۔ ''احوال'' میں بھی رائٹروں نے اپنے اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں دوڑ لگا رہے ہیں (لیجیے! آپ بھی اس بار شامل ہو جائیے) سبھی نے بہت اچھا لکھا لیکن کچھ لوگ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ ان میں ایم اے راحیل، سونیا خان، عمارہ ناز نے اپنے اپنے خطوط میں یہ لکھا ہے کہ ہم مقصود احمد بلوچ کی کہانی قسمت اس سے پہلے کسی اور رسالے میں پڑھ چکے ہیں۔ ان تینوں نے اس رسالے کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ (پلیز اگر کہانی آپ تینوں نے پڑھی ہے تو نشاندہی ضرور کریں۔) آخر میں سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، تمام قارئین، تمام رائٹرز کو میرا خلوص بھرا سلام۔''

☆: بہت پیارے اشفاق! اتنے دن بعد آئے بھی تو..... ارے محبت میں اتنا جذباتی تھوڑا ہو جاتے ہیں۔ تمہیں بھی چھوٹے سے بچے کی طرح سمجھانا پڑ رہا ہے۔ امید ہے ہماری محبت کا مان قائم رکھو گے۔

✉: ہرو ڈہ تھل سے ہمارے بہت پیارے قاری ساتھی خضر حیات لکھتے ہیں۔ ''اگست کا شمارہ ایک خوب صورت دلکش سرورق کے ساتھ 7 اگست کو مل گیا۔ شمارہ بہت ہی سپرہٹ تھا۔ کاشی صاحب کچھ تو خیال کریں اتنا لیٹ شمارہ کچھ تو خیال کریں (سرکولیشن والو! آپ سے کہہ رہے ہیں) سب سے پہلے تو میں آپ کو پراسرار نمبر 2 نکالنے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اتنا پیارا اور خوب صورت شمارہ..... کاشی صاحب آپ نے تو ہمارے ہر دل عزیز اور پیارے ڈائجسٹ کو کہاں پہنچا دیا۔ بے شک پراسرار نمبر 2 آپ کی محبت، محنت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں بالکل خوشامد نہیں کر رہا بلکہ دل کی بات کر رہا ہوں۔ سب کی سب کہانیاں بہت بہت ہی عمدہ، زبردست اور اچھی تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خوفناک بھی تھیں۔ دہشت ناک اور پراسرار بھی تھیں۔ میں سب کہانیاں لکھنے والوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اگست کا شمارہ اپنی مثال تھا۔ لاجواب شمارہ تھا۔ اب اجازت آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔ دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔''

☆: لو بھائی خضر! خط پورا لگا دیا۔ اب تو خوش ہونا!

✉: محمد قاسم خان بلوچ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے لکھتے ہیں۔ ''آج ایک بار پھر احوال میں شرکت کر رہا ہوں۔ تقریباً دو یا تین ماہ کام کی مصروفیت کی وجہ سے غائب رہنا پڑا۔ خط نہیں لکھ سکا لیکن سچی کہانیاں میں اتنی مصروفیت کے باوجود بھی پڑھتا رہا۔ سب نے اچھی کہانیاں اور اچھے تبصرے لکھے سب کو مبارکباد۔ اب بات ہو جائے اگست کے شمارے پر تو اگست کا شمارہ نہایت اچھے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ منزہ سہام کا ایدھی جی کے بارے میں لکھا ہوا کالم اچھا تھا۔ ان کے جذبات ایدھی صاحب کے لیے دیدنی تھے۔ احوال میں ایک بات جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ سچی کہانیاں پہلی بار پہلی ایوارڈ تقریب کروا رہا ہے۔ یہ تو بہت خوش آئند بات ہے اور کاشی بھیا کی کوشش کو اللہ پاک

سانحہ ارتحال

ہماری ہردل عزیز قاری اور لکھاری ساتھی رضوانہ کوثر کی ہمشیرہ، شبانہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ادارہ دکھ کی اِن گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔

خوب رنگ دے، آمین۔ جن جن رائٹروں کو ایوارڈ ملنے والے ہیں وہ تو آپ ضرور خوش ہوں گے لیکن اب رائٹروں کو چاہیے کہ وہ اس محفل کو کامیاب کرنے کے لیے کاشی بھائی کی کچھ ہیلپ بھی کردیں جو ان کے لیے کام کررہے ہیں۔ احوال میں پیارے پیارے ممتاز کا تبصرہ دل کو چھو کر دل میں اتر گیا۔ بہت خوب تبصرہ لکھا۔ مجید احمد جائی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سونیا خان، کنزہ ملک کے تبصرہ اچھے تھے۔ جناب ملک علی رضا بھائی آپ کا تبصرہ مختصر ضرور تھا لیکن اچھا تبصرہ تھا پسند آیا۔ عمارہ ناز کا تبصرہ دل و جان سے پڑھا۔ عمارہ ناز آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ فرزانہ نگہت کا تبصرہ بھی کمال کا رہا۔ کہانیوں میں ''فریب نظر'' پہلے پڑھی۔ جاوید راہی اس بار تو بازی لے گئے بہت بہت مبارک ''آخری فرعون'' پسند آئی۔ فرعون کے مجرم بنت حوا یہ کہانی بھی کمال کی رہی۔ ''جائز'' وقاص حسین کی کہانی بھی اچھی لگی۔ ''رات کے مسافر'' بہت پسند آئی۔ رانا حبیب الرحمن بھائی آپ کیوں ناراض ہوتے ہو۔ ہماری نیک تمنائیں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے، آمین۔ آپ کا شعر بے حد پسند آیا اور آپ سے ملاقات کرکے بے حد خوشی ہوئی آپ نے مجھے بے حد پیار اور محبت دی۔ شکریہ بھائی۔ آخر میں سب کو سلام۔''

☆: پیارے قاسم! تبصرہ ہر ماہ بھیجا کرو۔ بھائی تم سب کی محبتوں کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ تم سب ہمارے لیے کیا کرتے ہو۔ یہ ہم بھی دیکھیں گے اب۔

✉: مراد خان کوٹ رادھا کشن سے لکھتے ہیں۔ ''سلام محبت کاشی بھائی جگ جگ جیو ہزاروں سال کاشی بھائی بہت مدت بعد آج پھر آپ کی محفل میں حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے سب لوگوں کے مزاج اچھے ہوں گے۔ سچی کہانیاں تو ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے میں جہاں بھی جاتا ہوں۔ آج کل میں کسی ضروری کام کی وجہ سے بلوچستان میں رہ رہا ہوں۔ جب بھی کام سے ٹائم ملتا ہے تو میں سچی کہانیاں پڑھتا ہوں۔ اگست کا شمارہ پراسرار نمبر بہت زبردست تھا۔ کہانیوں کی بات کریں تو میرا خیال ہے سب کہانیاں اچھی تھیں لیکن کچھ کہانیاں زیادہ پسند آئیں۔ جن میں ''فریب نظر'' جاوید راہی، ''جائز'' وقاص حسین، ''رب کا انصاف'' ممتاز احمد، ''بس ذرا سی چھاؤں لی تھی'' محمد قاسم خان بلوچ ''رات کے مسافر'' ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا۔ کاشی بھائی یہ کہانیاں اس شمارے میں بہترین کہانیاں تھیں۔ ان لوگوں نے خوب محنت کی اور ان کو ان کی محنت کا پھل مل گیا۔ آئندہ پراسرار نمبر میں ان لوگوں کو خصوصی طور پر شامل کیا جائے۔ ابراہیم شوبی کی غزل اچھی تھی۔ ''تیر نیم کش'' میں رانا حبیب الرحمن، محمد قاسم خان بلوچ، ملازم حسین شیرازی کے شعر پسند آئے۔ کاشی بھائی! آپ کی محنت خوب رنگ بکھیر رہی ہے امید کرتا ہوں اگلا پراسرار نمبر اس سے بھی بڑھ کر اچھا ہوگا، والسلام۔''

☆: پیارے مراد! جم جم آؤ۔ تمہیں پراسرار نمبر پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوگئی۔

✉: ادی زرینہ جونیجو خیر پور ناتھن شاہ بورڑی شریف سے لکھتی ہیں۔ ''کاشی بھیا اگست کا شمارہ

پراسرار نمبر 2 بہت لیٹ ملا ہے۔ آپ کے پھوپا، مور شاہد حسین کی دادی کی روح کو باری تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین) اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ سچی کہانیاں ایوارڈ کی تقریب کراچی میں ہونی چاہیے کیونکہ زیادہ تر لکھاری کراچی اور سندھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (ادی! ایسا نہیں پورے پاکستان سے خصوصاً پنجاب کے رائٹرز سندھ کے ہم پلہ ہو گئے ہیں) سدرہ شاہین کا اللہ کے فضل و کرم سے آپریشن کامیاب رہا۔ سدرہ شاہین نئی زندگی بہت بہت مبارک ہو۔ سلسلہ ''مسئلہ یہ ہے'' سے ہر ماہ لاکھوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں اس سلسلے کو یوں ہی جاری رکھا جائے۔ ''احوال'' میں نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ اس مختصر وقت میں جو کہانیاں پڑھ سکی ہوں ان میں ''فریب نظر'' جاوید راہی، ''پاور آف لو'' ضرغام محمود، ''وہ فرشتہ'' حنا بشریٰ، ''بیری کا درخت اور وہ......'' مجید احمد جائی، ''لائف بوائے'' اسماء اعوان، ''فریب نظر'' جاوید راہی کی تحریریں ناقابل فراموش تھیں۔ سدرہ شاہین، مور شاہد، مجید احمد جائی، صائمہ مجید، سونیا خان، آنٹی نفیسہ فضل، عمارہ ناز، غزالہ کرن کو بہت سارا سلام اور دعائیں''۔

☆: پیاری بہن! ہمیں سب سے زیادہ خوشی آپ کو احوال میں پا کر ہوتی ہے۔ تبصرہ آپ کی محبت کا ثبوت ہوتا ہے۔

✉: ہماری نٹ کھٹ تحسین اپنے مزیدار تبصرے کے ساتھ خیر پور ناتھن شاہ بورڑی شریف سے حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ '' آنے والی عید الاضحیٰ آپ سب کو بہت بہت مبارک۔ ٹائیٹل گرل نہیں (خاتون) کے ساتھ چڑیل انتہائی خوفناک منظر پیش کر رہی ہے۔ بھئی ہم پہلے ہی ڈرے ہوئے ہیں (دور ہٹو ہمیں کچھ اپنی باتیں کرنی ہیں)۔ مبارکاں بھیا! اب کی بار تو خوب چمکا دیا ہے آپ کے شہر کو ابر رحمت نے۔ لو جی ہم آ ہی گئے ہیں، مانو احوالی تو تسلیم کر ہی چکے تھے کہ ماہدولت کوچ کر گئی ہیں۔ سوچی وی ناں ظالمو کچھ ماہ ہم حاضری نہ لگوائیں تو شاید یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ ایک تھی تحسین۔ نام تک بھلا دیا اتنا ظلم وہ بھی اس بچی کے ساتھ، جو اپنے بچپن کے کئی سال اس محبوب پرچے کے نام کر چکی ہے۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ معتبرین کے ڈسنے والو یہ مت بھولو کہ ہم چہرہ شناس نہیں، ہے ناں بھیا! ابھی اپنی ریاست قائم دائم ہے۔ جہاں پر ہماری ہر دل عزیز شہزادی سدرہ انور بھی موجود ہے۔ آج سدرہ ہم سب کے درمیان موجود ہے نئی زندگی کے ساتھ بہت بہت خوش آمدید یار۔ ادی شاواشے 'ایوارڈ تقریب' زیادہ خوشی ہونے کی ضرورت نہیں لڑکی، کون سے ہمیں ایوارڈ ملنے والا ہے۔ چلو سب کی خوشی میں خوش ہو لیتے ہیں۔ ظالماں Pizza ہی کھلا دے ہاہاہاہا...... اللہ پاک ڈھیروں کامیابیاں عطا کرے اپنے بھیا کاشی کو اور یہ ذمے داری احسن طریقے سے نبھانے کی توفیق دے (آمین ثمہ آمین) ہمیں مت بھولنا پاجی! کیا معلوم شمولیت کا چانس بن جائے۔ بہت خوشی ہوئی بھیا۔ اداریہ ''ایدھی بھی چلے گئے'' اللہ پاک عبدالستار صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین)۔ تمام نئے احوالی ساتھیوں کو خوش آمدید۔ عزیز جی آ انکل کی آمد بھی بھلی لگی خوش رہیے۔ ناصر رضا انکل کو نانا بننے پر مبارک باد۔ بہت سپاس گزار ہوں ان تمام احباب کی جنہوں نے میری تحریر پڑھی اور پسند کی۔ سلامت رہیں۔ بھیا! آپ کی محنت رنگ لائی اور پراسرار نمبر کی تمام تخلیقات عمدہ رہیں۔ خاص کر رب کا انصاف' وہ میرا دولہا ہے، بیری کا درخت اور وہ، وہ کنگن، رات کے مسافر، جائزہ، فریب نظر اچھی رہیں۔ ''زہر عشق'' کی کمی محسوس ہوئی۔ ''تیر نیم کش'' اور ''ہائیڈ پارک'' میں تمام شہ پارے اعلیٰ

سچی کہانیاں کا یادگار 'عشق نمبر'

محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے

بلکہ ہم تو کہتے ہیں

عشق کا تجربہ ضروری ہے

ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے

عشق نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟

یہ واردات ہوئی تو آپ عشق کی ہتھکڑی میں قید ہوئے یا بس دیکھتے ہی دیکھتے، عشق نے آپ کو کسی اور جہان میں پہنچا دیا۔

سچی کہانیاں کے صفحات پر بہت جلد 'عشق کی وارداتیں، عشق کی گھاتیں، عشق کی فتح اور عشق کی ناکامی سے جڑی وہ کہانیاں، جن سے ابنِ آدم اپنی زندگی میں ضرور گزرا ہوگا۔

تو پھر بس تھوڑا سا انتظار اور......

بہت جلد، **عشق نمبر** آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

لکھاری ساتھیو سے التماس ہے کہ اس منفرد نمبر کے لیے عامیانہ تحریروں سے گریز کریں۔ امید ہے آپ کی منفرد اور اچھوتی عشق بیتیاں، اس نمبر کو چار چاند لگا دیں گی۔

اپنی تحریریں ہمیں اس طرح ارسال کریں کہ 20 ستمبر تک موصول ہو جائیں۔ 20 ستمبر کے بعد موصول ہونے والی تحریریں عشق نمبر میں شامل نہیں کی جائیں گی۔ نوٹ فرمالیں۔

(اگر آپ اپنی عشق کہانی بھیجنا چاہتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے...... پورے اعتماد کے ساتھ سچے عشق کے واقعات بھیجیں۔ کرداروں کے نام اور مقام ہم خود تبدیل کرلیں گے)

اکتوبر 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: --

مکمل پتا: --



اکتوبر 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ---------- تعدادِ صفحات: ----------

نام: --

مکمل پتا: --

فون/سیل نمبر: --



اکتوبر 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ---------- مصنف: ----------

دوم، عنوان: ---------- مصنف: ----------

سوم، عنوان: ---------- مصنف: ----------

نام: ---------- شہر: ----------

رہے۔ چلتی ہوں۔ اجازت۔''

☆: ارے نٹ کھٹ لڑکی! بابا آرام سے ایک ہی سانس میں دیوان پڑھ دیتی ہو۔ خوش رہو۔ خدا تمہیں اسی طرح ہنستا مسکراتا رکھے۔ بہنیں ہنستی مسکراتی ہیں تو بھائی شاد رہتے ہیں۔ تبصرہ زبردست کیا تم نے لڑکی۔ اب اگلے ماہ آنا نہ بھول جانا۔

✉: مسکان بھٹی کی شام کے بھٹیاں سے پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''سچی کہانیاں ملتے ہی دل خوش ہوگیا۔ سرورق ڈراؤنا کم اور خوب صورت زیادہ تھا۔ احوال میں صائمہ نور محبت کے پھول برساتی نظر آئی۔ سونیا خان نے بچپن یاد دلا کر رلا دیا۔ نٹ کھٹ کنزہ ملک کا اندازِ بیان پسند آیا۔ بشریٰ کنول کی صلاحیت کا کیا کہنا۔ غزالہ کرن حسد کے تیر برساتی نظر آئیں۔ عمارہ ناز کا تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ کہانیوں میں جاوید راہی واقعی نمبرون کے مستحق تھے۔ کیا خوب تحریر لائے۔ حنا بشریٰ کی ''فرشتہ'' ایمان افروز کہانی تھی۔ اتنے خوب صورت انداز میں تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں نیکی کا مدو جزر پیدا کر دیا۔ محمود شام کا سفرنامہ معلومات اور دلچسپی سے بھرپور ہے۔ ممتاز احمد کی ''رب کا انصاف'' سمجھ نہیں آئی۔ ماریہ یاسر کا ''سرسوں کا ساگ'' میں مکھن اور مکئی کی روٹی کی کمی تھی۔ ''بیری کا درخت'' پسند نہیں آئی۔ ''آخری شرارت'' میں موت نے خوب شرارت کی۔ پھر زندہ ہوگئی، پاور لو، چٹکیری بلی پسند آئی۔ ہائیڈ پارک سوچ نگر سے سجا میلہ ہے۔''

☆: مسکان بھٹی! خوش آمدید! اگلے ماہ احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ آپ جلدی جلدی میں یہ کیوں لکھنا بھول گئیں کہ آپ کی پہلی آمد ہے۔

✉: مقبول حسین نیازی خانیوال سے لکھتے ہیں۔ ''اگست کا پراسرار نمبر 1 میں نے لاہور جاتے ہوئے سفر کے دوران اوکاڑہ کے ایک بک اسٹال سے خریدا، ٹائیٹل بہترین تھا۔ منزہ سہام نے جو الفاظ ایدھی صاحب کے لیے تحریر کیے یقیناً قابل تعریف تھے۔ ایدھی صاحب بلا شبہ ایک عظیم انسان تھے اللہ ان کو اجر عظیم عطا کرے۔ تبصرے بڑے اچھے تھے سبھی لوگوں کی تحریروں کو دیکھا تو جاوید راہی کی ''فریب نظر'' بہت پسند آئی۔ ''رب کا انصاف'' ممتاز احمد نے بھی کمال کی کہانی لکھی۔ ''بیری کا درخت اور وہ'' مجید احمد جائی، ''بھید بھرا گھر'' فوزیہ فرید احمد، ''بس ذرا سی چھاؤں لی تھی'' محمد قاسم خان بلوچ اور لوگوں کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ جن میں ''جائزہ'' وقاص حسین کی تحریر، ''وہ فرشتہ'' حنا بشریٰ، ''رات کے مسافر'' اچھی کہانیاں رہیں۔ ہائیڈ پارک میں، زکوٰۃ کی رقم، نوبت، ملاجی کی حاضر دماغی، ہری مرچیں اور لفظوں کا ہیر پھیر اچھے لگے۔ شاعری تقریباً سبھی اچھی تھی۔ باقی تبصرہ اگلے شمارے میں تب تک کے لیے اجازت۔''

☆: پیارے مقبول! خوش رہو، تبصرہ مختصر مگر دلچسپ تھا۔ اگلے ماہ جہاں بھی ہو پرچے پر کر رائے ضرور دینا۔

✉: قمر شہداد کوٹ سے ہمارے ساتھی مور شاہد حسین کی آمد ہے لکھتے ہیں۔ ''سب سے پہلے تمام اہل وطن کو جشن آزادی مبارک۔ چند ماہ غیر حاضر رہا اس کے لیے دلی معذرت۔ اب آتے ہیں اپنے محبوب رسالے سچی کہانیاں کی جانب۔ حسین دوشیزہ اپنی آنکھوں میں پراسراریت لیے سچی کہانیاں کے سرورق پر موجود تھی۔ ڈراؤنی شکلوں نے اس کی پراسراریت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اگلے

اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے اداریہ ''ایدھی بھی چلے گئے'' عبدالستار ایدھی ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ محفل احوال کے آغاز میں کاشی بھیا بھی مرحوم ایدھی ہی کی بات کررہے تھے اور احوال کے اختتام میں ان کی لکھی ہوئی نظم دل میں اتر گئی۔ اسماء اعوان لائف بوائے، ''بے مثال'' جاوید راہی، ''فریب نظر'' محمد سلیم اختر، ''پھر سے زندہ ہوگئی'' حنا بشریٰ، ''وہ فرشتہ'' ضرغام محمود، ''پاور آف لو'' منفرد تحریریں پڑھنے کو دیں بے حد شکریہ۔ محمد قاسم خان بلوچ ''بس ذرا سی چھاؤں لی تھی'' ماہ وش طالب ''Victim کون'' ممتاز احمد ''رب کا انصاف'' ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ نادیہ ملک وہ چتکبری بلی'' ثمینہ طاہر بٹ ''خمیازہ'' صداقت حسین ساجد ''بندر کا پنجہ'' اچھی تھیں۔ ایم اے راحت ''زرد لومڑی'' دلچسپ سلسلہ پڑھنے کو دے رہے ہیں۔ بنت حوا، فرعون کے مجرم، ملک صفدر عباس اعوان ''آخری فرعون'' اسرار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دانیال شمسی ایک تصویر ایک کہانی بے مثال محمود شام بھارت میں بلیک لسٹ معلومات میں اضافہ۔ فرح انیس وہ ''میرا دولہا ہے'' فوزیہ فرید احمد ''بھید بھرا گھر'' سعدیہ عابد ''میرا پیچھا چھوڑ دو'' شیما عبدالقیوم ''وہ کنگن'' مجید احمد جائی ''بیری کا درخت اور وہ'' ماریہ یاسر ''سرسوں کا ساگ'' احتشام شامی ''آخری شرارت'' مہر پرویز احمد ''آسیہ کون تھی؟'' مختصر مگر اسرار سے پُر جامع لگیں۔ مسئلہ یہ ہے، رسالے کی جان ہائیڈ پارک سب کے انتخاب پسند آئے۔ وقاص حسین جائز، ڈاکٹر خادم حسین کھیرارات کے مسافر دل کی آنکھ سے پڑھی اسرار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ شکریہ مصنفین تیر نیم کش تمام شعر اچھے لگے۔ کاشی بھائی! اب اجازت۔

☆: پیارے مور! سلامت رہو تبصرہ بہت اچھا کیا تم نے۔ دیکھو آپ اتنی طویل غیر حاضری قطعاً قابلِ قبول نہ ہوگی۔

✂: راولاکوٹ، آزاد کشمیر سے اشفاق احمد رفیق کی پہلی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''محترم کاشی چوہان نیک دعائیں آپ کے نام۔ آپ کے حلقہ اپنائیت میں شامل ہونے کی پہلی بار کوشش کررہا ہوں۔ امید ہے آپ دل سے خوش آمدید کہیں گے۔ مدیر صاحب میں سچی کہانیاں کے معیار کی بات نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ یہ معیار ہی تو اس کی پہچان ہے اور اس معیار کی خاص وجہ آپ ہیں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں سچی کہانیاں کا خاموش قاری تھا۔ اب لکھنے کا حوصلہ مور شاہد حسین نے دیا ہے۔ مور شاہد حسین ہر بار کچھ نہ کچھ لکھنے کے لیے اصرار کرتے اور میں نئے نئے بہانے بنا کر ٹالتا رہتا مگر اب اس کی محبت نے خاموشی توڑ دی۔ اگست 2016ء کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے یہ شمارہ گزشتہ کئی سالوں کے پراسرار نمبروں پر بہت بھاری لگا۔ آخری فرعون، فریب نظر، سرسوں کا ساگ، رب کا انصاف، وہ فرشتہ اعلیٰ تحریریں تھیں آخری شرارت واقعی عتیق کی آخری شرارت ثابت ہوئی۔ میرا پیچھا چھوڑ دو، وہ کنگن بھی اچھی تھیں۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے باقی پرچہ زیر مطالعہ ہے۔''

☆: پیارے بھائی! خوش آمدید، آپ کی محبت کا شکریہ۔ شکر ہے آپ نے خاموشی کی دیوار ڈھا کر محبت کے راستے کا انتخاب کرلیا۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✂: صبر والا سے راشد لطیف لکھتے ہیں۔ ''جولائی 2016ء کا رسالہ عید مبارک کافی لیٹ ملا۔ ہمارے ڈاک کا نظام بھی کچھ خراب ہے۔ خیر مل گیا بہت خوب صورت Title تھا۔ ٹائیٹل پر تصویر بہت خوب صورت تھی جو رسالے کو چار چاند لگا رہی تھی۔ واقعی اس بار کاشی بھائی آپ نے کمال کردیا ہے۔

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

مِنی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

بہت جلد......!

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان وشوکت کے ساتھ منعقد کی جارہی ہے

کیا **لاہور**...... **کراچی** سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

آپ اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

میرا ساتھ کس طرح دیں گے؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

ویسے آپ خود بھی کمال کے ہو۔ جیسے آپ خود خوب صورت ہو اتنا خوب صورت کام کرتے ہو۔ آپ کا احوال میں جواب دینا بہت اچھا لگتا ہے۔ عید کے رسالے میں سب کی کہانیاں بہت اچھی تھی۔ ''نئے چراغ'' اقبال بانو، ''آدھی سہاگن'' جاوید راہی، ''بازی گر'' امیر حمزہ بلوچ، ''ایک منٹ تین سیکنڈ'' محمد شعیب، آفیسر شیخ معظم الٰہی ''سو روپے کا نوٹ'' سیما عروج صدیقی، سوئی سنبل آپی ''ملن'' جمیل میتلو، ''قسمت مقصود احمد بلوچ صاحب، زر بخت اور شب گل سیدہ عطیہ زاہرہ، ''سلو پوائزن'' شاہد رفیق سہو، ''کسے الزام دوں'' عبدالغفار عابد۔ جن کے نام نہیں لے سکا ان سب کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ اور کاشی بھائی کیا کمال جا رہی ہے آپ کی اسٹوری ''زہر عشق'' کاشی بھائی کیا میری تصویر زیادہ خوفناک تھی جو آپ کو پسند نہیں آئی اور میرے پیارے بھائی مجید احمد جائی صاحب اور جناب ممتاز احمد صاحب آپ کو فقیر کا بہت بہت سلام ہو۔ آخر میں سب لکھنے پڑھنے والوں کو بہت سلام ہو۔''

☆: پیارے راشد! بھیا تمہارا تبصرہ اچھا لگا۔ تھوڑا سا مطالعے پر توجہ دو تو تم بہت اچھے کہانی کار بن جاؤ گے۔ تمہاری تصویر کمپیوٹر نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟

✉: ژوب، بلوچستان سے عمران مظہر کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''کافی عرصے بعد حاضری لگا رہا ہوں۔ وجہ صرف صحت ہے جس سے نبرد آزما ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آپ کے پھوپا کے بارے میں پڑھا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ جولائی کے شمارے کا سرورق اچھا ہے۔ منزہ صاحبہ کا اداریہ ٹھیک رہا۔ احوال میں خطوط کی بھرمار آپ کے ہر دلعزیز شخصیت ہونے کا ثبوت ہے۔ بہت سارے پرانے ساتھی غائب ہیں۔ لوٹ آئیں تو ہمیں اچھا لگے گا۔ ایک وقت تھا وہ بھی...... بس کاش ہی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال نئے احوالی بھی بہترین خطوط لکھتے ہیں۔ ''نئے چراغ'' اقبال بانو، ''منزل کہاں تھی'' تحسین جونیجو، ''ملن'' جمیل میتلو، ''سوئی'' سنبل، ''کیا لے جائے گا'' نگہت غفار، ''آدھی سہاگن'' جاوید راہی، ''زر بخت اور شب گل'' عطیہ زہرا یہ وہ کہانیاں ہیں جن کے صرف رائٹرز کے نام دیکھ کر ہی پہلی فرصت میں پڑھا اور تشنگی ختم ہوئی۔ ہر رائٹر نے خوب لکھا۔ اس کے علاوہ عبدالغفار عابد، اسماعیل بروہی، فصیحہ آصف نے بھی خوب لکھا۔ باقی کہانیاں پڑھ نہیں پایا۔ اس لیے ان پر رائے نہیں دے سکتا۔ مستقل سلسلے سارے بہترین ہیں۔ آپ کی ''زہر عشق'' بھی خوب جا رہی ہے۔ کاشی بھائی چند کہانیاں زیر تکمیل ہیں۔ آنکھ کی سرجری وغیرہ سے فارغ ہوں گا تو مکمل کر کے آپ کو بھجواؤں گا اور یقین ہے کہ آپ کا ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معافی چاہتا ہوں۔''

☆: پیارے عمران! سلامت رہو۔ تمہاری سرجری کی خبر نے ہمیں بہت رنجور کر دیا۔ تبصرے کے لیے شکریہ۔

✉: اکوال، تلہ گنگ سے ہمارے ریگولر قاری سلیمان شبیر عرض کرتے ہیں۔ ''ماہ اگست کا شمارہ 4 اگست کو ملا۔ بھائی جان اس شمارے کے بارے میں کچھ ضروری گزارشات ہیں کہ سب سے پہلے صداقت حسین ساجد سے گزارش ہے کہ اپنی کہانی پر غور کریں اور...... امید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔ دوسری گزارش ہے صفدر عباس اعوان صاحب سے کہ ہارر فلمیں کم دیکھا کریں۔ انگریزی فلم کی اسٹوری ہمیں سنا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے سال بھی پراسرار نمبر میں ایک

مبارک باد

ہماری ساتھی لکھاری اور شاعرہ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل گزشتہ ماہ میں ماشاءاللہ ایک پیارے سے پوتے کی دادی جان بن گئی ہے۔ ادارہ ان کو دائمی خوشیوں کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ نومولود کی صحت اور درازی عمر کے لیے بھی دعا گو ہے۔

انڈین فلم ''امر پریم'' کی اسٹوری اپنے نام سے چھپوا چکے ہیں۔ خیر ان دو کہانیوں کو چھوڑ کر باقی رسالے نے اپنا معیار برقرار رکھا۔ اسماء اعوان ''لائف بوائے'' میں پھر ایک اچھی اسٹوری لے کر آئیں۔ جاوید راہی صاحب، سلیم اختر صاحب، ممتاز احمد، مجید جائی کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ''سرسوں کا ساگ'' ماریہ یاسر ''وہ کنگن'' شیما عبدالقیوم، ''پاور آف لو'' ضرغام محمود بہت ہی اچھی اسٹوریز تھیں۔ اس کے علاوہ حنا بشریٰ، محمد قاسم بلوچ، ماہ وش طالب، نادیہ ملک، ثمینہ طاہر بٹ، فرح انیس، فوزیہ فرید احمد، سعدیہ عابد، مجید احمد جائی، مہر پرویز احمد دولو، وقاص حسین اور ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کی تحریریں بھی زبردست تھیں۔ ''بادبان'' اور ''زہر عشق'' کو مس کیا۔ ایم اے راحت کی تعریف کرنا ناممکن بات ہے۔ بابا جی کو اللہ پاک جزائے خیر دیں۔ ہائیڈ پارک میں بھی سب کے انتخابات اچھے تھے۔ تیر نیم کش میں ناظم حسین شاہد کا انتخاب بہت پسند آیا۔ بہن سدرہ انور علی، عظمیٰ شکور اور بہن منزل خان کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ اجازت اگلے ماہ تک بشرط زندگی۔''

☆: پیارے بھائی سلیمان! صداقت حسین ساجد، صفدر عباس اعوان تک آپ کی تنقید پہنچائی جا رہی ہے۔ تبصرے کا شکریہ اور ہاں پلیز وہ میگزین ہمیں فوراً بھجوا دو۔ تبصرے کا بہت شکریہ۔ خوش رہو۔

✉: خانیوال سے محمد حنیف عاصم بلوچ کی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''زندہ کہانی آپ کو سچی کہانیاں کے لیے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ کاشی بھائی مزدور بندے کی زندگی بے حد مصروف ہوتی ہے اور غم روزگار اس کو ہر وقت ستانے کے ساتھ ساتھ اسے جسمانی اور ذہنی طور پر بھی مصروف عمل رکھتا ہے اور مجھ جیسے مزدور بندے کا قلم اور کاغذ کے لیے وقت نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے مگر بچپن کا شوق اور ادبی ذوق کسی نہ کسی صورت یہ وقت نکالنے پر بندے کو مجبور کر دیتا ہے گو کہ کہانی سچے اور حقیقی کرداروں پر مشتمل ہے۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے مقام اور نام بدل دیے ہیں۔ اگر قابل اشاعت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ ہاں اس میں بہت سی غلطیاں ہوں گی جنہیں درست کرنے کا آپ کو مکمل اختیار ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی میرے قلم کے لیے باعث تقویت ثابت ہوگی۔

☆: بہت پیارے بھائی عاصم! خوش آمدید، انشاءاللہ بہت جلد کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔ آپ کی آمد کا اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

✉: سجدہ صابر بورے والا سے بڑے دنوں بعد تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو میں اپنے تمام احوالیوں سے معذرت کرتی ہوں کیونکہ پورے چھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد اب محفل میں دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ میری غیر موجودگی میں جن لوگوں نے مجھے یاد رکھا ان سب بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں احوال کی محفل میں غیر حاضر ضرور رہی ہوں لیکن پرچہ ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتی رہی ہوں۔ اب اگست کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ کاشی بھائی میری طرف سے رائٹر

ایوارڈ تقریب کی ایڈوانس بہت بہت مبارک ہو اور انشاء اللہ میں یہ امید کرتی ہوں کہ تقریب بھی بہت اچھے طریقے سے منعقد ہو گی۔ اس دفعہ احوال میں سب لوگوں نے اچھا لکھا ماسوائے چند لوگوں کے ایم اے راحیل، سونیا خان، عمارہ ناز مجھے آپ لوگوں کے خط پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کسی کے بارے میں بغیر کسی ثبوت کے ایسا نہیں لکھتے۔ اس دفعہ کہانیوں میں انکل سلیم اختر، ممتاز احمد سرگودھا سے، مہر پرویز دولومیاں چنوں سے، سعدیہ عابد، ضرغام محمود، فرح انیس ان سب کی اسٹوریاں ٹاپ کلاس اسٹوریاں تھیں۔ ویری ویلڈن۔ اس دفعہ مجید احمد جائی کی اسٹوری ''بیری کا درخت اور وہ'' اتنی خاص اسٹوری نہیں تھی۔ اس دفعہ غزالہ کرن یہ میری بہن کافی غصے میں نظر آئی۔ غزالہ اگر آپ کو ایک چیز بور کر رہی ہے تو اسے مت پڑھو چھوڑ دو۔ آخر میں رانا حبیب الرحمٰن، قاسم خان بلوچ، اشفاق شاہین ان سب کے اشعار پسند آئے۔ اب تک کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہو گی۔''

☆: سجدہ جی! تبصرہ اچھا لگا آپ کا۔ اب کتنے ماہ بعد حاضر ہوں گی؟

✉: رحیم یار خان سے احوال میں پہلی بار آمد ہے اویس اوپی کنگ کی۔ لکھتے ہیں۔ ''کاشی صاحب اگست کے پرچے میں آپ کی نظم جو آپ نے ایدھی صاحب پر لکھی ہے بہت کمال کی تھی اور محترمہ منزہ سہام نے بہت کم لفظوں میں ایدھی صاحب کی جامع شخصیت کو بیان کر دیا یہ کمال بھی خدا کی ذات بہت کم لوگوں کو دیتی ہے۔ سچی کہانیاں ایک لاجواب شمارہ ہے۔ اس کا شمارہ کم فہم لوگوں کے لیے تو بالکل نہیں ہوتا۔ پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں اس لیے کسی کا نام نہیں لکھ رہا۔''

☆: بہت جلد باز اویس! خوش آمدید! تمہارا خط پڑھ کر لگا کہ ہم نے تازہ تازہ شمارہ مارکیٹ کیا ہے۔ تمہاری پہلی آمد میں اتنے مشورے اور دھمکیاں۔ ارے...... بھائی جینے دو اگلے ماہ تمہاری آمد کا دل سے انتظار رہے گا۔

✉: عابدہ طارق کی لالہ موسیٰ سے پہلی پہلی آمد ہے لکھتی ہیں۔ ''میں آپ کے ڈائجسٹ سچی کہانیاں کا حصہ بننا چاہتی ہوں اور امید بھی کرتی ہوں کہ آپ مجھے ویلکم کہیں گے۔ پہلا خط، پہلی تحریر ارسال کر رہی ہوں۔ سچی کہانیاں کے لیے۔ اس سے پہلے بھی میں ایک ڈائجسٹ میں لکھتی ہوں۔ اگر آپ اچھے اور خوشگوار موڈ میں ویلکم کہتے رہے تو انشاء اللہ اور بشرطِ زندگی پڑھنے والوں کے لیے اچھے سے اچھا مواد شیئر کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ مجھے لکھتے ہوئے بہت عرصہ تو نہیں گزرا۔ مگر اشفاق بٹ صاحب نے مجھے لکھنے پر اکسایا اور یہی وجہ ہے کہ لکھنے کا کام جاری ہے۔''

☆: اچھی عابدہ! ویلکم خوش آمدید! جی آیاں نو! اب تو خوش ہو ناں تحریر پڑھ کر ہی کوئی رائے دے سکیں گے۔ فی الحال تو انتظار کرو۔ احوال میں اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉: منچن آباد سے خواجہ حسین جاوید لکھتے ہیں۔ ''شمارہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تاخیر سے ملا خیر صد شکر خدا کا کہ بالآخر مل تو گیا ورنہ میں نے تو اس بار پکا سوچ لیا تھا کہ شمارہ لینے کراچی جاؤں گا اور اس بہانے کاشی صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کاشی بھیا شمارے کے ہر ورق سے آپ کی محنت نظر آ رہی ہے۔ آپ نے پراسرار نمبر دے کر دل باغ باغ کر دیا اور خطوط کے آخر میں آپ کی نظم کمال کی تھی۔ ایدھی صاحب کو آپ نے خراج عقیدت پیش کر کے اپنا حق ادا کر دیا۔ ہائے افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ بھیا جی یہ جو آپ ہر خط کا جواب دیتے ہو آپ کی اس

ادا کا بھی جواب نہیں۔ بھیا جی مونچھیں ہوں تو نتھو لعل جیسی ہو اور مدیر ہو تو کاشی چوہان جیسا ہو۔ باکمال لوگ لاجواب شمارہ۔ بھیا جی بڑی معذرت کے ساتھ...... مجھے بہت امید تھی کہ اس بار میری کہانی ضرور شائع ہو گی آپ نے میری کہانی تو نہیں لگائی لیکن مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ نا قابل اشاعت تحریروں میں میری کہانی نہیں تھی یعنی کہ میں پُر امید رہوں کہ ایک نہ ایک دن میری کہانی ضرور شائع ہو گی (ارے......لسٹ تو ہر دوسرے مہینے آتی ہے بھیا!) بھیا جی ایک بار پھر آپ کا بہت بہت شکریہ تمام رفیقانِ قلم سے گزارش ہے کہ میرے دیرینہ دوست علی اصغر انصاری آج کل بہت پریشان ہیں۔ اس کے لیے خصوصی دعا کریں۔ احوال میں ممتاز احمد صاحب نے یاد رکھا شکریہ جناب! مجید احمد جائی، مجاہد حسین بھائی، آنٹی نفیسہ فضل، افضل آزاد کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ ناظم حسین شاہد! یار کر دی نا بچوں والی بات۔ میں نے آپ کو روکا تھا نا کہ خط میں میرا ذکر نہیں کرنا۔ جن احباب نے یاد رکھا مالک ان کو خوش رکھے، آمین اور جن احباب کی میں تعریف نہ کر سکا دراصل وہ تعریفی القابات سے بے نیاز تھے۔ بہن نسیم سحر، بہن نگہت غفار، بہن فرزانہ گل اور بہن فرزانہ نگہت کے خط بہت ہی اچھے تھے۔ بہن سونیا خان نے بہت شاندار تبصرہ کیا ہے۔ ملک علی رضا، ملک صفدر اعوان، خضر حیات صاحب اور پیارے امیر حمزہ مہدی صاحب کے تبصرے بہت شاندار تھے۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ''تیر نیم کش'' بہن رضوانہ کوثر، بہن شازیہ رضوی اور بہن شمائلہ اختر کے اشعار زبردست تھے۔ بھائی قاسم خان بلوچ، خضر حیات، شعبان کھوسہ کے انتخاب اچھے تھے۔ ہائیڈ پارک میں شہروز شریف، شہباز رضا، کاشف عائز اور بہن عظمیٰ شکور، بہت خوب۔ انتخاب تھے آپ لوگوں کے گڈ جاب، کاشی بھیا ایک عدد اور کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ شائع فرمائیں گے۔ آپ کے مثبت جواب کا انتظار رہے گا۔''

☆ پیارے بھائی! سلامت رہو۔ تبصرہ بہت مزیدار تھا تمہارا مگر تھا شیطان کی آنت۔ کہانی پڑھ کر ہی رائے دی جا سکتی ہے۔ فی الحال کہانی کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں انشاء اللہ اس ماہ ضرور پڑھ لوں گا۔

✉ ہماری بہت پیاری آنٹی نفیسہ فضل کراچی سے بہت لیٹ احوال میں پہنچی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ بھانجے اور بھانجیوں کی شادیوں میں مصروفیت کے باوجود پراسرار نمبر پڑھ ہی ڈالا۔ آپ کے پھوپا اور اقبال زمان کے بہنوئی اور مینا تاج کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اس مرتبہ پراسرار نمبر واقعی پراسرار ہو گیا۔ فریب نظر جاوید راہی، وہ پھر سے زندہ ہو گئی زبردست کہانیاں ہیں۔ محمد سلیم اختر کی تحریروں میں کافی نکھار ہے۔ وہ فرشتہ حنا بشریٰ یہ حقیقتیں آج بھی ہیں۔ پاور آف لو، ضرغام محمود اچھی کہانی ہے۔ بس ذرا سی چھاؤں لی تھی یہ کہانی حقیقت سے نزدیک ہے۔ محمد قاسم خان بلوچ ویلڈن۔ ممتاز احمد رب کا انصاف۔ نادیہ ملک چتکبری بلی، زبردست۔ زرد لومڑی، ایم اے راحت۔ ان کے لیے کیا کہوں یہ تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ بیری کا درخت اور وہ مجید احمد جائی اچھی کہانی ہے۔ سرسوں کا ساگ، ماریہ یاسر آخری شرارت،

احتشام شامی دل پہ اثر کر گئی۔ وہ میرا دولہا فرح انیس، اچھی کہانی ہے اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ وہ کنگن شیما قیوم اور بنتِ حوا کی فرعون کے مجرم بھی بہت اچھی لگیں۔ غرض مجموعی طور پر دوسرا پراسرار نمبر 1 ہے۔ آپ سب کو مبارک ہو۔

☆: پیاری آنٹی! آپ کی صحت کے لیے ہر پل دعائیں لبوں پر رہتی ہیں۔ بس اس طرح ہمیں اپنی شفقت سے نوازتی رہا کیجیے۔

✉: شگفتہ ناز کی رحیم یار خان سے یہ پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ کاشی بھائی کسی رسالے میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ سچی کہانیاں کو پڑھتے ہوئے تو کافی ٹائم بیت گیا ہے۔ لیکن اس میں لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہی ہوں۔ جولائی 2016ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس دفعہ احوال میں سب بہن بھائیوں نے بہت اچھا لکھا۔ اب بات ہو جائے اسٹوریوں کی 'نئے چراغ' اقبال بانو، 'نہ خدا ہی ملا' فیصل ندیم بھٹی، 'سلو پوائزن' شاہد رفیق سہو، 'نام بھی نہ رہے گا' شاہد محمود مغل، اور اس مہینے کی ٹاپ کلاس اسٹوری۔ 'قسمت' جو کہ مقصود احمد بلوچ نے تحریر کی تھی۔ ویلڈن مقصود بھائی آپ کی اسٹوری نے تو مجھے رلا دیا۔ اگر دوستوں نے مجھے خوش آمدید کہا تو انشاء اللہ ہر ماہ حاضری دیتی رہوں گی۔ اس ماہ کے لیے اتنا کافی ہے اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری دوں گی۔ تب تک خدا حافظ۔

☆: پیاری بہن شگفتہ! خوش آمدید۔ آپ کی جذباتیت نے ہمیں بھی رلا دیا۔ آپ ایک کہانی پر اتنی جذباتی ہو گئیں۔ اگر ہم قینچی نہ چلاتے تو ہمارے قاری ڈاک خانے کے بجائے آپ کے گھر کا پتا ڈھونڈ رہے ہوتے۔ خوش رہیے۔ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ دیکھیے اگلی بار کس کے بھاگ جاگتے ہیں۔

✉: ہمارے سینئر لکھاری سید محمد ابو آزاد، کراچی سے زمانوں بعد احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ مطلع کرتا ہوں کہ میری بیگم سیدہ منورہ خاتون آج سے تین ماہ پہلے اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ سے دعا ہے کہ رب ان کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے سورہ فاتحہ پڑھ دیں۔ شکریہ۔ مرحومہ کے اوصاف حمیدہ کے متعلق ایک سچی کہانی بعنوان ''میرے محبوب تیرے لیے'' آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ براہ کرم آپ اس کو اپنے ڈائجسٹ میں شائع کر کے مجھے ممنون فرمائیں۔

☆: محترم انکل آزاد! آپ کی آمد کی جتنی خوشی تھی۔ آنٹی کے انتقال کی خبر نے غمگین کر دیا۔ آپ کی تحریر جلد ہی اشاعت کے مراحل طے کرے گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉: سیالکوٹ سے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کی احوال میں آمد ہے، لکھتے ہیں۔ میں آپ کو شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی، ماہنامے میں شائع کروانے کے لیے دو دفعہ کہانی دو غزلیں اور جوابی لفافے کے ساتھ خط بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ (یہ ہم پہ الزام ہے ڈاکٹر صاحب) میری کوئی تحریر جس رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ اس ماہ کا رسالہ مجھے اعزازی طور پر ارسال فرما دیں۔ اس دفعہ ایک بالکل سچا واقعہ آپ بیتی کے انداز میں بھیج رہا ہوں۔ آپ اسے دوبارہ خود لکھ کر میرے نام کے ساتھ شائع کریں اور

وہ ماہنامہ مجھے بھی ارسال فرمادیں۔ (ارے اچھی زبردستی ہے بھئی) یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ (اور ہماری......) اگر آپ قارئین کو قابل اشاعت کرانے کا انعام وغیرہ دیتے ہیں تو امید ہے مجھے بھی مایوس نہیں کریں گے۔ آپ کو کہانیاں اور دوسری تحریریں بھیجتا رہوں گا۔ (جان لیں گے کیا ہماری؟) اس کے لیے آپ مجھے اپنا یہ رسالہ اعزازی طور پر ارسال کرنا شروع فرمادیں۔ اس کے لیے آپ کو تفصیلی لیٹر بھی بھیج رہا ہوں۔ آپ سے پہلے طب کے ادارے مجھے اپنے رسالے فری ارسال کرتے ہیں۔ اور ان رسالوں میں میرے لکھے ہوئے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (ہم مستفید کیوں نہ ہوئے؟)۔۔۔ رسالوں کے علاوہ آپ کا یہ رسالہ بھی اپنے نام لگوانا چاہتا ہوں (ارے! ارے...... دیکھو لوگو!) اور تحریر بھی بھیجتا رہوں گا۔ اس خط کا جواب کسی اور کاغذ پر فرمائیں یہ خط واپس نہ بھیجیں۔ (آپ کا حکم ہے یہ؟)

☆: لیجیے ڈاکٹر صاحب! خط بغیر کاٹے پہلی بار شامل کردیا ہے۔ اب اس سے آگے ہم۔ بھلا اور کیا کہیں۔ لوگو سمجھا کرو۔ آپ کی کہانیاں ناقابلِ اشاعت تحریروں کی فہرست میں لگادی گئی تھیں۔ امید ہے اب آپ گلہ نہیں کریں گے۔

لیجیے ساتھیو! اس خط کے ساتھ ہی ہماری آپ کی اس ماہ تک کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اگلے ماہ انشاء اللہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی نذر۔

موہنجوداڑو

اے موہنجوداڑو!
ہم نے تجھ سے کچھ نہ سیکھا
بے جان خلاؤں سے گزرتے
کہسار پر چڑھتے
تیری ہی گلیوں سے گزرتے
چیڑ کی صلیب پہ لٹکتے
اپنی پہچان کی تصویریں
سنگیٹی پر سجاتے
چمپئی دھوپ کو منہ پہ لگاتے
آشیر باد کی دھونی رماتے
خوشی کے اس جہاں کو
ماضی سے حال میں بھگاتے
ہم نے تجھ سے کچھ نہ سیکھا

برق سی حساس رگوں میں دوڑاتے
ننگے پیروں میں خوب چبھتی ہیں
تیرے ماضی کی جڑیں
اے موہنجوداڑو!
میرے شہر میں پھر سے جھوم اٹھے ہیں بادل
اور......
سچ میں مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے
تیرے ماضی کی جڑیں
کیا پھر سے تجھے جن رہی ہیں
میرے شہر میں موسم بدل رہے ہیں
اے موہنجوداڑو!
مجھے......
موہنجو "کولاچی" نہیں بننا

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ بتیس برس سے تین نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- ...... اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ...... اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ...... پوری دنیا میں پھیلے، اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ...... اس لیے کہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ...... اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: سچی کہانیاں

II 88-C فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

لائف بوائے انٹرنیشنل شیمپوز کو مات دلائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں



علینا پانچ سال بعد وطن واپس آ رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ میاں کے ساتھ جو جدہ گئی تو بس وہیں کی ہو رہی۔ مگر جب عارش کی شادی کے ہنگامے پھوٹے تو اُسے مجبوراً آنا ہی پڑا۔ دیارِ غیر سے ہفتہ بھر کے لیے دو بچوں کے ساتھ سامان لپیٹ کر آنا کیا آسان رکھا تھا۔ زاہد کو حسبِ معمول چھٹی نہ مل سکی تھی اور اس نے شادی سے دو دن قبل ہی آنا تھا۔ اور وہ بھی شادی ہو سگے بھائی کی تو بھلا خالی ہاتھ کیا آیا جاتا ہے؟ سب کے لیے تحفے تحائف لینے میں ہی مہینہ بھر لگ گیا تھا۔ امی جان نے جدہ سے خاص طور پر چار موم کے دوپٹوں کے دو تھان بھی منگوائے تھے۔ خدا خدا کر کے جب ایک حد تک وہ شاپنگ سے مطمئن ہوئی تو کچھ سکھ کا سانس لیا۔

آج وہ جدہ سے پاکستان کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

''جلدی کرو بھئی۔'' عارش علینا کی چٹیا کھینچتے ہوئے بولے۔

''اُف بھیا بہت تنگ کرتے ہیں آپ۔'' علینا آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

''چاہے کچھ کر لو رہو گی تو ویسی ہی...... سانپ سو سال بعد کینچلی بدلتا ہے اور اس حساب سے تمہیں اپنا روپ بدلنے کے لیے مزید اسی سال اور چاہیے ہیں۔ پھر جا کر کہیں بات بنے گی۔'' عارش نہایت ڈرامائی انداز میں آنکھیں گھما کر ہاتھ پھیلا کر بولے۔

''اگر بات آپی کو ریسیو کرنے کی نہ ہوتی بھیا تو میں ہرگز ہرگز آپ کے ساتھ ایئرپورٹ نہ جاتی۔'' کومل سی علینا روہانسی ہو گئی۔

''بس اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو آپ سے سارے بدلے گن گن کر لوں گی۔ دیکھوں گی بھابی کے سامنے کیسے جی جی میں تیرا غلام بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



''کیا کہہ رہی ہو علینا! تم نے اپنا بھیا کو کیا سمجھا ہے ایں؟ ارے ہمارا نام عارش خان ہے جناب اور ہمارے سامنے بڑے بڑے شیر بھی ڈھیر ہو جاتے ہیں اور تم بات کر رہی ہو کس کی، سارہ کی؟ اُسے تو میں یوں قابو کرلوں گا یوں۔'' بھیا چٹکی بجاتے ہوئے بولے۔

''چلو چلو......!'' امی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

''کچھ تو خیال کرو بینا کے سُسرال والے سب ایئر پورٹ پہنچ گئے ہوں گے اور تم دونوں کو خانہ جنگی سے فرصت ہی نہیں ہے۔ عجیب بچے ہیں بھئی۔ صاحبزادے خیر سے اگلے ماہ گھر بسانے والے ہیں۔ مگر چھوٹی بہن سے یوں جھگڑتے ہیں جیسے اوپر تلے کے بچے اور چھوٹی بہن سے تو کوئی پوچھے ایم اے کی طالبہ ہیں۔ لیکن کوئی احساسِ ذمہ داری، کوئی ڈھنگ کی بات ہے ہی نہیں۔'' امی بڑبڑائیں۔

☆......☆......☆

ایئر پورٹ پر بینا کی سسرال، عارش کی ہونے والی سسرال، کچھ عزیز رشتے دار پہلے ہی موجود تھے۔ ایک دو عزیزوں کی کاریں آگے پیچھے آ کر رُکیں۔

''بس پانچ منٹ تک جہاز لینڈ کر جائے گا۔'' بینا کے سسر محمد فہیم صاحب بولے۔

''ہاں لیکن سامان وغیرہ کلیئر کروانے میں گھنٹہ ایک تو لگ جائے گا۔'' ابو نے اظہارِ خیال کیا۔

''چھوٹے چھوٹے بچے بھی تو ہیں ساتھ۔'' امی بولیں۔

''گھبرا گئے ہوں گے بے چارے اتنے لمبے سفر سے۔''

ادھر نوجوان ٹولہ سب سے بے نیاز خوش گپیوں میں مگن تھا۔

''انہیں دیکھیے پورا خاندان ہی ہماری بہنا کے سواگت کے لیے آچکا ہے۔'' عارش اپنی ہونے والی سالی عمارہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولے۔

''آپ کو کوئی اعتراض ہے تو ہم چلے جاتے ہیں جیجا جی۔'' عمارہ شرارت سے بولی۔

''جائیں شوق سے جائیں۔'' عارش منہ آسمان کی طرف اُٹھا کر گنگنانے لگے۔

''توبہ ہے عارش بھائی۔ آپ سے کوئی جیت نہیں سکتا۔'' عمارہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

''ارے عمارہ پریشان کیوں ہوتی ہو۔ دیکھنا اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو بھیا کی کیسی کیسی خاطریں......''

''بھائی سے غداری۔'' عارش علینا کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''بہت بری بات ہے۔ چچ چچ...... بھئی بہت افسوس ہے یعنی آج کل کی لڑکیاں اسکول کالج جا کر یہ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ سن رہے ہیں علیم صاحب۔''

عارش نے بینا کے دیور کو ٹھوکا مارتے ہوئے کہا جو بہت سنجیدگی سے ایک طرف کھڑے رن وے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

''جی جی ہاں...... بالکل سن رہا ہوں۔'' علیم ہڑبڑا کر اپنی عینک جمانے لگے۔

''وہ دیکھو بینا آ گئیں۔''

علینا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ تقریباً بھاگتی ہوئی وہ بینا کے گلے سے جھول گئی۔ بینا باری باری ہر ایک سے گلے مل رہی تھی۔ امی تو بار بار رومال کے کونے سے آنکھیں خشک کر رہی تھیں۔ پانچ سال بعد اُن کی بیٹی پردیس سے لوٹی تھی۔ اُن کی دبلی پتلی بینا کا جسم دو بچوں کی پیدائش سے بھر گیا تھا۔ اُس کا چہرہ...... لبوں پر مچلتی ہنسی اُس کی

خوشگوار ازدواجی زندگی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ علینا نے بینا کے پیچھے چھپے گول مٹول سے تین سالہ عاشر کو اُٹھا کر بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔ عاشر پیار کی اس اچانک بوچھاڑ سے گھبرا کر رونے لگا۔ عاشر کیا رویا کاٹ میں لیٹی دس ماہ کی عرشیہ بیگم بھی گلا پھاڑنے لگیں۔ اور اُن کی دیکھا دیکھی ارد گرد کے بھی دو تین عدد بچے بسورنے لگے۔ امی عرشیہ کو گود میں لے کر پچکارنے لگیں اور علینا عاشر کو بہلانے لگی۔

سامان کاروں میں بھر کر یہ سارا قافلہ بینا کے میکے کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ رات کا کھانا امی کی طرف تھا۔ بھیا کی شادی تک بینا کا ارادہ امی ابو کے پاس رہنے کا تھا۔

☆......☆......☆

"زاہد شادی سے دو تین روز پہلے ہی آ سکیں گے، بہت مصروف ہیں۔ زیادہ چھٹی مل ہی نہیں سکتی۔" بینا اپنے سسر کو بتا رہی تھی۔

"زاہد کی صحت تو ٹھیک ہے نا بیٹا...... بالکل خیال نہیں رکھتا اپنا۔" بینا کی ساس بولیں۔

"اب تم یہاں ہو تو کھانے پکانے کا کیا بندوبست کرے گا؟"

"جی...... وہ میں کافی ساری چیزیں بنا کر فریزر میں رکھ آئی ہوں۔ ویسے بھی آنٹی آپ تو زاہد کی عادت سے واقف ہیں۔ کھانے کے تو بالکل شوقین نہیں، بس کتابیں جتنی مرضی ہو پڑھوالو۔"

"آنٹی! آپ کباب تو لیجیے۔" علینا نے پلیٹ بینا کی ساس کی طرف سرکائی۔

"بس بیٹا! بہت کھالیا۔ آج تو اوور اینٹنگ ہو گئی۔"

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ عرشیہ تو نانی کی گود میں سو گئی۔ عاشر چڑچڑا ہو رہا تھا۔ کہاں گھر میں صرف ماما، بابا اور ایک چھوٹی بہنا اور کہاں بھانت بھانت کے رشتے دار جو اُسے اپنی ماما کے پاس ہی نہیں جانے دے رہے تھے۔ اور ماما بھی تو بالکل لفٹ نہیں کرا رہی تھیں۔ سوٹ کیس کھول کر قالین پر دھرنا مارے بینا سب کے لیے تحفے نکال رہی تھی۔ امی نے جو چار موم کے دوپٹوں کا تھان منگوایا تھا اُس کی کوالٹی کی تمام خواتین تعریف کر رہی تھیں۔

"بھابی! آپ کے صاحبزادے تو سو گئے۔" علیم نے اپنی گود میں سوئے ہوئے عاشر کی طرف بینا کی توجہ دلائی۔

"علینا بہنا پلیز ذرا عاشر کے کپڑے بدل کر اسے لٹا آؤ۔" بینا نے سوٹ کیس اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے آواز لگائی۔

"لایئے علیم بھائی......" علیم نے عاشر پر جھکتے ہوئے کہا۔

"ایسے تو یہ جاگ جائے گا۔ میں اسے کمرے میں لٹا دیتا ہوں۔ پھر آپ اس کے کپڑے بدل دیں۔"

"چلیں......"

"افوہ باجی تو لگتا ہے سارہ جدہ اٹھا لائی ہیں۔" علینا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے بڑبڑائی۔

"لائیں میں اُٹھا دوں۔" علیم عاشر کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے بولے۔

"نہیں بس رہنے دیں۔" علینا عاشر کا شب خوابی کا لباس ڈھونڈنے لگی۔

"علینا......"

"جی!"

"علینا......"

"کیا ہے علیم بھائی؟" علینا جھنجلا گئی۔

"کچھ نہیں۔" علیم گھبرا کر اپنی عینک جمانے لگے۔ علینا کو ہنسی آ گئی۔ سنجیدہ سے علیم ہمیشہ علینا

سے بات کرتے ہوئے گھبرا جاتے تھے۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے۔'' علینا انہیں دیدہ دلیری سے گھورتی ہوئی بولی۔

''ہاں...... وہ پھر کبھی سہی۔'' علیم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ دروازہ کھول کر باہر جانے لگے۔

''اس طرح ڈرتے جھجکتے رہے تو زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔'' علینا نے نعرہ لگایا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' علیم نے باہر نکل کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

ایک علیم ہی کیا علینا اور عارش کے سامنے بڑے بڑے طرّم خان بھی بھیگی بلی بنے نظر آتے تھے۔ دوسروں کو چھیڑ کر، اُلو بنا کر دونوں بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ امی کو علینا کی اس قدر بے باکی بالکل نہیں بھاتی تھی۔

''ارے علینا! تمہاری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔ ذرا اسے لگام دے کر رکھو بہت نقصان اٹھاؤ گی ورنہ۔''

''نقصان کیسا امی۔ جس کو سننا ہے سنے۔ نہیں سننا تو نہ سنے۔ کوئی زبردستی تھوڑا ہی ہے۔''

''تمہارے بولنے کی یہی رفتار رہی تو ایک دن بھی سسرال میں گزارہ نہیں ہوگا۔''

''جب مجھے شادی ہی نہیں کرنی تو سسرال کی کیا فکر۔''

''ہاں تم ہمارے ہی سینے پر ساری زندگی مونگ دلتی رہنا۔'' امی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں۔

''باپ کے لاڈ پیار نے بالکل ہی بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔''

☆......☆......☆

اس شام عارش کی مہندی سارہ کے گھر لے جانی تھی۔

''آپ نہیں جائیں گے بھیا۔''

''کیوں نہیں جاؤں گا بھئی۔''

''کچھ تو شرم کیجیے۔''

''شرم کیسی۔ آج ہی تو پیاری پیاری تتلیاں ہمارے اردگرد منڈلائیں گی۔ پھر تو سارہ بیگم دور سے ہی سبز جھنڈی دکھا دیا کریں گی۔''

''اللہ بھیا آپ تو بس۔''

''اللہ میاں تو سنا تھا۔ یہ اللہ بھیا کیا ہوا۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' عارش نے انتہائی متفکرانہ انداز سے علینا سے سوال کیا۔

''بھیا......!'' علینا دونوں ہاتھوں کے مکے بناتی ہوئی عارش کے پیچھے دوڑی جو ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

سفید کڑھا ہوا ملتانی کُرتا، کلف لگی لٹھے کی شلوار، تلے دار کھسے، عارش کا نکلتا ہوا قد چوڑا سینہ، گھنی سیاہ مونچھیں، اماں تو ہر نظر پر صدقے واری ہو رہی تھیں۔

بینا اور علینا خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ زاہد جو صبح کی فلائٹ سے پہنچے تھے مسلسل عاشر کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھر رہے تھے۔

''یار زاہد! آیا گیری ختم کرو اور کچھ تصاویر غریب دولہا کی بھی اُتار لو۔'' عارش زاہد کی ٹانگ کھینچتے ہوئے بولے۔

''بول لے میری بلبل، بس یہی دو دن کی چاندنی ہے پھر سمجھیں گے آپ کو۔'' زاہد کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔

''لائیے زاہد بھائی عاشر کو مجھے دے دیجیے۔'' علینا بہنوئی کی مدد کو پہنچی۔

''ہاں بھئی ہاں! کدھر ہے ہماری دلہن۔ پہلے تو ہماری ایک سیلفی ہو جائے۔'' زاہد نے عاشر کو علینا کے حوالے کر دیا اور بینا کی تلاش شروع کر دی۔ وہ ڈریسنگ روم میں پہنچا تو دیکھا ہنوز بیگم صاحبہ گولڈن غرارہ پہنے بالوں کا اسٹائل

بنانے میں مگن تھیں۔ دیر اتنی زیادہ ہوگئی تھی۔ میاں صاحب کی آمد اور ایئر پورٹ کے چکر میں کہ پارلر جانے کا وقت ہی نہ مل سکا تھا اور اب نتیجہ یہ تھا کہ بال بن کر ہی نہ دے رہے تھے۔

''اوہ جان! تم ویٹ کرو میں علینا کو بھیجتا ہوں۔ وہ شاید تمہاری ہیلپ کر دے۔''

''اس وقت کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ جلدی سے کسی کو بھیج کر بال پنون کا پتا منگوا دیں۔ میں دوپٹہ سر پر جما لیتی ہوں۔'' بینا نے اُلجھ کر کہا۔

''خبردار بیگم جو آپ نے اپنے یہ خوبصورت بال چھپائے۔'' زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور سالی کو بلانے باہر چلا گیا۔

''اوہ سوری آپی! میں بھی آپ کو بھول ہی گئی اس مہندی کے چکر میں۔ میری پیاری آپی اس شان سے لڑکی والوں کے گھر جائیں گی کہ سب آپ کو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔'' علینا یقین سے بولی تھی۔

''ارے تم اتنی شیور کیسے ہو؟ اتنی جلدی بھلا کون جادو دکھا سکتا ہے۔ میں اپنا جدہ سے لایا شیمپو یوز کر چکی ہوں لڑکی!'' بینا اُسی پریشانی سے بولی۔

''ٹنگ ٹنگ۔'' علینا شرارت سے ایک شیمپو لے کر آئی اور چھپاتے ہوئے کھلکھلائی۔

''کیا ہے یہ؟'' بینا چلائی۔

''یہ ہے ہمارا شیمپو!'' علینا نے لائف بوائے شیمپو کی بوتل اس کے آگے کر دی۔

''تمہیں یقین ہے کہ یہ منٹوں میں میرے بالوں کی مشکل حل کر دے گا۔''

''ہنڈرڈ نہیں تو ہنڈرڈ پرسنٹ...... آئی ایم شیور...... اِٹ از پرفیکٹ چوائس فور ایوری کائنڈز ہیئرز...... بلیو می سوئٹ آپی!'' علینا نے بہن کو شیمپو دیتے ہوئے اعتماد سے کہا۔ بینا شیمپو لے کر بال واش کرنے چلی گئی۔

☆☆......☆☆

''پلیز لائف بوائے شیمپو...... آج تمہارا مقابلہ ایک انٹرنیشنل شیمپو سے ہے۔ میرا یقین میرا بھروسہ نہ توڑنا۔'' علینا نے بچوں کی طرح ہاتھ اٹھائے دل ہی دل میں دعا کی۔

بینا بال واش کر کے ڈرائر سے خشک کر رہی تھی اور لائف بوائے شیمپو کی معطر مہک نے اُسے اندر تک تازگی بخش دی تھی۔ اور بینا کی حیرت کی انتہا نہ رہی، منٹوں میں اُس کا من چاہا ہیئر اسٹائل اُس کے حسن کو دو آتشہ بنا رہا تھا۔

''علینا......! کمال کر دیا تمہارے لائف بوائے شیمپو نے۔'' بینا جوش سے بولی تھی۔

''تھینک یو علینا۔'' بینا نے محبت سے بہن کا ماتھا چوما۔

''اونہوں...... آپی تھینکس میرا نہیں...... میرے لائف بوائے شیمپو کا ادا کیجیے۔''

''لائف بوائے شیمپو، انٹرنیشنل شیمپوز کو مات دلائے۔''

کچھ دیر بعد سنہری ٹشو کے غرارے میں ملبوس چمکتی دمکتی بینا ہنستی ہوئی خوبرو زاہد کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔ اپنائیت سے زاہد نے بینا کے شانے اپنے بازو کے حصار میں لے لیے۔ کلک......

کلک بہت سارے موبائلز نے محبت کے ان جیتے جاگتے لمحوں کو اپنی قید میں لے لیا اور ایک سیلفی علینا نے بھی لی تھی۔

''خدایا! میرے چمن میں بہاریں ہمیشہ رقصاں رہیں۔'' امی کے دل سے دعا نکلی تھی۔

اور بینا کی اس خوشی میں آج لائف بوائے شیمپو نے زندگی بھر دی تھی۔

☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ

شاہانہ احمد

اِس ماہ ہم بیوٹی گائیڈ میں خوبصورتی کے بارے میں اہم معلومات اور گھر بیٹھے ایسی بہترین بیوٹی ٹپس دیں گے جو گھر اور بیوٹی پارلر جانے کے بعد آپ کے لیے نہایت اہم ثابت ہوں گی۔ میک اپ کی آگہی' آپ کے حسن میں چار چاند لگا سکتی ہے۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ خوب صورت نہیں یا آپ واقعی خوب صورت ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے آپ کو کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب آپ اپنی دیوار پر لگے آئینے سے کریں اور اپنے آپ کا جائزہ لیں۔ آپ کو اس بات کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا اور اس بات کا منفی یا مثبت جواب مل جائے گا۔ اگر آپ کا جواب "ہاں" میں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ یا پھر آپ کی بیوٹیشن بہت اچھی ہیں جو بہتر طور پر آپ کے حسن کی حفاظت کرتی ہیں۔

اگر اس کا جواب "نہیں" میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یا آپ کی بیوٹیشن آپ کی جلد پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ یہ ساری حقیقت آپ کے سامنے موجود ہے۔ سن بلاک کی آپ کو سب سے پہلے ضرورت ہے۔ اپنے میک اپ سے قبل اسے استعمال کریں۔ اس کے لیے آپ کو ایسے لوشن کی ضرورت ہے۔ جس میں اینٹی آکسی ڈینٹ شامل ہو۔

آپ فاؤنڈیشن یا کنسیلر ضرور استعمال کریں مگر ایک بات یاد رکھیں کہ یہ دس ماہ سے زائد پرانی نہ ہو۔ اگر آپ کو کریم کے طور پر درکار ہو تو پھر فیئر اینڈ لولی BB استعمال کریں۔

پُرکشش نظر آنے کے لیے: آپ کی ماہر آرائش حسن کو چاہیے کہ وہ آپ کے حسن کے لیے بہتر مشورہ دے۔ چند ایک بنیادی آئی کلر اور بلشر سے ہٹ کر آپ کو بتائے۔ آپ اس سلسلے میں بھی توجہ دیجیے۔ کلرلیس بلشر ایک عمدہ اور ہلکا آئی بلشر ہے۔ بنیادی نیلا' سنہری' تانبے کی رنگت کا آئی شیڈو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آئی پینسل کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ یہ سیاہ براؤن اور ہلکی نیلی با آسانی مل

جاتی ہے اور خوبصورتی کا اہم حصہ ہے۔

آپ آئی پینسل کو اپنی جلد پر پھیر کر اس کی روئی اور رنگ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ مسکارا استعمال کیے بغیر آپ گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ آپ کی آنکھوں کے حسن میں مزید اضافے کا باعث ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آپ کے مجموعی تاثر کو زیادہ پرُکشش بناتا ہے۔

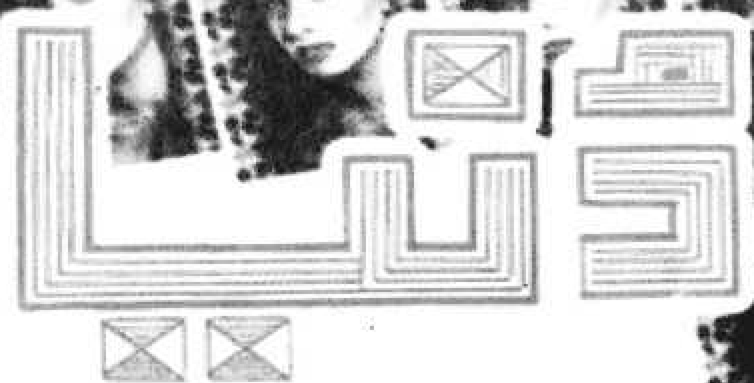
شاعروں نے ہونٹوں کے بارے میں بڑے قصیدے کہے ہیں۔ ہونٹوں کو لب گل اور نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے حُسن کا تذکرہ کرتے ہوئے لبوں کا ذکر کرنا کبھی نہیں بھولتے یہ چہرے کا وہ حصہ ہے جو بقول شاعر پھولوں کی پتیوں سے مشابہ ہے۔ لہٰذا اگر آپ حسین بننا چاہتی ہیں تو پھر اپنے لبوں کے حسن اور ان کی حفاظت پر بھی توجہ دیں۔

خواتین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میک اپ میں مکمل فاؤنڈیشن کی کیا اہمیت ہے۔ یہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کہ درست شیڈز کا انتخاب کریں۔ ٹرو میچ پہلا میک اپ ہے جو آپ کی جلد سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ٹرو میچ کو چوبیس مختلف جلد کے مطابق تیار کیا گیا ہے جو کہ بالکل قدرتی لگتا ہے۔ اس میں یہ خاصیت ہے کہ یہ جلد کی مطابقت کے انتخاب کے بعد آپ کی جلد میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے چہرے کو بھی نکھارتا ہے۔ اس میں وٹامن بی ای اور گلیسرین شامل ہیں جو جلد میں جذب ہو کر اسے توانائی پہنچاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اہم چیز کو آپ اب تک نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ وہ چیز جو ڈریسنگ ٹیبل سے میک اپ میں معاون ہوتی ہے لیکن میک اپ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے یہ ہر جگہ نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاتھ ہیں جنہیں پوری توجہ کی ضرورت ہے ایک اچھا لوشن آپ کے ہاتھوں کو ملائم، نرم اور جوان رکھتا ہے۔ نیل پالش بیس آپ کے ناخنوں کی حفاظت کے لیے موجود ہے۔ اپنے لباس کے لحاظ سے آپ نیل پالش کا انتخاب کر سکتی ہیں جن میں سرخ، عنابی، سنہرا، تانبے کے رنگ عموماً شام کے اوقات میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ یاد رکھیں نیل پالش ریموور آپ کے ناخنوں پر رنگوں کی بہاریں بدلنے میں فوری مدد کرتا ہے۔

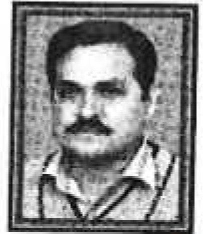
☆☆......☆☆




دنیا



امداد مری کرنے آجانا رسول اللہ



احمد سجاد بابر

دہشت گردی کا شکار ہونے والے اُس قوال کی کہانی، جس کی ایک دنیا مداح تھی

اے سبز گنبد والے منظور دعا کرنا
میں قبر اندھیری میں گھبراؤں گا جب تنہا
امداد مری کرنے آجانا رسول اللہ
امداد میری کرنے آجانا رسول اللہ
روشن میری تربت کو للہ ذرا کرنا
جب وقت نزع آئے آقا، دیدار عطا کرنا
مجرم ہوں زمانے کا محشر میں بھرم رکھنا
رسوائے زمانہ ہوں کملی میں چھپا لینا
رسوائے زمانہ ہوں دوزخ سے بچا لینا
منظور دعا میری مقبول خدا کرنا
جب وقت نزع آئے آقا، دیدار عطا کرنا

صرف آنکھیں برس رہی تھیں، پرسوز آواز میں درد بھری التجا پیش کرنے والے کی آنکھیں بھی، پروگرام کو ہوسٹ کرنے والے میزبان کی آنکھیں بھی اور لاکھوں سننے والوں کی آنکھیں بھی جل تھل تھیں۔ رمضان کے مقدس مہینے میں ایسی رقت آمیز دعا دلوں سے ٹکرا رہی تھی، شاید یہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ اور پھر وہ نہ رہا، اس کی روح ابدی منزل کو روانہ ہو گئی، ان اندھیروں کی جانب، جن میں مدد کی درخواست اس نے وجہ تخلیق کائنات کے حضور ﷺ رو رو کر پیش کی تھی، دعا جو قبول ہو گئی تھی!!

☆☆☆

سُر اور فن کی یہ کہانی قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کے علاقے روہتک کے قصبے سے شروع ہوتی ہے جہاں 1930 میں مستقبل کے ایک بڑے فنکار نے جنم لیا، کسے معلوم تھا کہ یہ آگے چل کر پوری دنیا میں نام پیدا کرے گا، اس کے خاندان کا سُر سنگیت سے رشتہ صدیوں سے جڑا تھا جس کی جڑیں مغل دور تک پھیلی تھیں، خاندان کے بڑوں کا دعویٰ تھا کہ وہ تان سین کی اولاد سے ہیں اور ان کی آواز کی اٹھان اس دعویٰ کی تائید بھی کرتی تھی۔ اس کے دادا محبوب بخش اور باقر حسین خان اپنے وقت کے مشہور ستار نواز اور فنکار تھے۔ چھ سال کی عمر میں بچے نے اپنے والد عنایت سین صابری سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اسے ہارمونیم، قوالی اور کلاسیکی موسیقی کی تعلیم دی جانے لگی۔ 1946 میں پہلی مرتبہ بچے نے مبارک شاہ کے عرس کے موقع پر ہزاروں لوگوں کے سامنے قوالی گائی اور داد سمیٹی۔

قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان بھی ہجرت

کر کے کراچی آباد ہو گیا۔ ابتدائی ایام میں انہوں نے انتہائی کسمپرسی کا وقت گزارا۔ اس خاندان کے بڑوں اور بچوں نے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لئے اینٹیں اور پتھر توڑنے کا کام بھی کیا۔ یہ بچہ راتوں کو اینٹ سے اینٹ جوڑتا رہا اور اپنے گھر کو چھاؤں مہیا کرنے کی کوشش کرتا رہا، اسی دوران وہ شدید بیمار ہو گیا اور ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ پھیپھڑوں کی بیماری کے باعث وہ اب کبھی نہیں گا سکے گا۔ بچہ مایوسی کی حالت میں باپ کے پاس جاتا ہے جو اسے ایک ہی نصیحت کرتا ہے کہ مہاجر کیمپ کے درمیان بیٹھ کر دو سال تک روزانہ چار گھنٹے ریاض کیا کرو اور اس بچے نے اس پر عمل کیا۔ اس کی آواز پہلے سے زیادہ موثر اور مضبوط ہو چکی تھی، کچھ عرصہ بعد اس نے استاد کلن خان کی قوال پارٹی کے ساتھ قوالیاں گائیں۔ انہوں نے لیاقت آباد چار نمبر کے علاقے میں رہائش اختیار کی اور تا حیات وہیں مقیم رہے۔ اب اس کا چھوٹا بھائی بھی قوالی کے سفر میں اس کے ہمراہ تھا۔

1960 کی دہائی میں قوال بھائیوں کی جوڑی نے ایک قوالی گا کر (جسے فلم عشق حبیب میں استعمال کیا گیا) دھوم مچادی۔ ان بھائیوں نے پنجاب میں رائج طرز قوالی سے یکسر انحراف کرتے ہوئے اپنا انداز متعارف کروایا۔ ان کی پہلی قوالی کے بول تھے

میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا

مجھے نظر کرم کی بھیک ملے

ان کی قوالی' تاجدار حرم' نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیئے۔

قسمت میں میری چین سے جینا لکھ دے

ڈوبے نہ کبھی میرا سفینہ لکھ دے

یہ قوالی جب جب سنی جاتی لوگ وجد میں آ جاتے۔ آج بھی جبکہ اعلیٰ وارفع روایتی موسیقی کا زبردستی خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس قوالی میں کوئی خاص کیفیت ایسی ہے کہ سننے والے وجدانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہر طلب کرنے والے کے دل کی آواز ہے اور ان دعائیہ الفاظ کے ذریعے طلب کرنے پر یقیناً غیب سے مثبت جواب مل جاتا ہے۔ قوال بھائیوں کی اس جوڑی کی شہرت صابری برادران کے نام سے ہوئی، بڑے بھائی کا نام غلام فرید صابری اور چھوٹے کا نام مقبول صابری تھا۔

اسی کی دہائی میں مقبول احمد صابری اور ان کے بڑے بھائی غلام فرید صابری قوالی کے حوالے سے دنیا بھر میں انتہائی معتبر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کی مشہور قوالیوں میں ''بھر دو جھولی میری''، ''تاج دار حرم'' اور ''خواجہ کی دیوانی'' سدا بہار سمجھی جاتی ہیں۔ عام زندگی میں بھی غلام فرید صابری ایک قلندر صفت اور سادہ لوح انسان تھے۔ کثرت سے ذکر کرنا ان کی عادت تھی۔ خاص طور پر رات میں ہزار دانوں والی تسبیح پر اللہ کا ذکر کرنا ان کے معمولات میں تھا۔ یہ تسبیح ان کی قوالی کے دوران ان کے گلے میں مالا کی طرح پڑی نظر آتی ہے۔ غلام فرید صابری نے 1956ء میں اپنے بھائی مقبول صابری کے ساتھ قوالی شروع کی۔ دونوں بھائیوں کا پہلا البم ''میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا1958ء میں ریلیز ہوا اور دنیا بھر میں پھیل گیا۔ 1976ء میں انہوں نے امریکی شہر نیویارک میں لائیو کنسرٹ کیا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ یہ سمندر پار ان کا پہلا کنسرٹ تھا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں نے اپنی قوال پارٹی کے ہمراہ بے شمار ممالک میں لائیو کنسرٹ کیئے اور عالمگیر شہرت پائی۔ قوالی میں کوئی اوران کے ہم پلہ نظر نہیں آتا۔

سعودی شاہ فیصل مرحوم کے استاد زین العابدین صابری برادارن کی قوالی کے مداح تھے۔ استاد صاحب ایک بار کراچی تشریف لائے اور صابری برداران کا سماع سنا اور انہیں سعودی عرب آنے کی دعوت دی۔ ستر کی دہائی میں صابری برداران حج کے دوران مدینہ منورہ گئے تو شاہ فیصل مرحوم کے استاد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔

انہوں نے پوچھا ''سامان (ہارمونیم) ساتھ لائے ہو؟''

صابری برادران نے کہا ''جی حضور لائے ہیں۔''
شاہ فیصل مرحوم کے استاد صاحب نے نصف شب کو مسجد نبوی کے دروازے کھلوائے اور ان کی



خواہش پر صابری برادارن نے روضہ رسولؐ کے سامنے بیٹھ کر ''تاجدار حرم ہو نگاہ کرم، بھر دو جھولی میری یا محمدؐ''، مقبول کلام پیش کیے۔ یہ تاریخی اعزاز فقط صابری برادران کو نصیب ہے۔

مقبولیت کی بنا پر صابری برادرز کی قوالیاں پاکستانی اور بھارتی فلموں کا حصہ بھی بنیں۔ صابری برادران کی انفرادیت یہ تھی کہ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں بھی ان کی قوالیاں موجود ہیں۔

قوالیوں کی بدولت انہیں نہ صرف ''صابری برادران'' کی حیثیت سے دنیا بھر میں منفرد پہچان ملی بلکہ انہیں ''پرائڈ آف پرفامنس'' سے بھی نوازا گیا۔ تاہم صابری برادران کی جوڑی کو 5 اپریل 1994ء کو اس وقت

ناقابلِ تلافی نقصان غلام فرید صابری کے اچانک انتقال سے ہوا۔ مقبول صابری کا انتقال 21 ستمبر سن 2011ء کو ساؤتھ افریقہ میں ہوا جہاں وہ اپنے علاج کی غرض سے گئے تھے۔

دونوں بھائی کراچی کے پاپوش نگر قبرستان میں مدفون ہیں۔ لیاقت آباد میں ایک انڈر پاس غلام فرید صابری کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

☆☆☆

صابری برادران کے گھرانے میں امجد صابری نے 23 دسمبر 1976ء کو آنکھ کھولی۔ ان کا پانچ بھائیوں میں تیسرا نمبر تھا، بچپن سے ہی سُر سنگیت کا ماحول تھا، صوفی ازم نے روحانی تربیت کا کام بھی کیا، گھر میں برگزیدہ ہستیوں کا کلام پڑھا جاتا تھا جس سے ان کی شخصی آبیاری ہونے لگی، اپنے والد غلام فرید صابری سے نو سال کی عمر میں قوالی کی تربیت حاصل کرنے والے امجد فرید کی پہلی پرفارمنس 11 سال کی عمر میں تھی، امجد کے والد انہیں صبح چار بجے بستر سے اٹھا دیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اتنے سخت تھے کہ چاہے وہ آدھی رات کو ہی سوئے ہوتے لیکن صبح چار بجے لازمی اٹھا دیا جاتا تھا۔ وضو کے بعد تہجد کی نماز اور اس کے بعد باجا یعنی ہارمونیم پر راگ بھیروں کا ریاض کروایا جاتا تھا۔ امجد صابری اپنے والد کی زندگی میں تو انہی کے ساتھ محافل سماع میں شریک ہوتے رہے، مگر 1994ء میں غلام فرید صابری کے انتقال کے بعد خود بطور مرکزی قوال پرفارم کرنا شروع کیا۔

وہ اکثر کہا کرتے ''میری کوشش ہے کہ میں اپنے بڑوں کی لاج رکھ سکوں۔''

امجد فرید صابری کو ذیابیطس کا مرض بھی لاحق تھا، مگر وہ اس کے باوجود اپنی مصروفیات میں خلل نہیں آنے دیتے تھے، اور نہ ہی کسی کو اس بارے میں بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ ریڈیو کی لائیو ٹرانسمیشن میں ان سے طویل گفتگو کے دوران میزبان نے دیکھا کہ ان کو پسینہ بہت آ رہا ہے۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

میزبان نے پریشانی سے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، یہ تو بس ایسے ہی ہے۔ مجھے آج گفتگو کر کے بہت لطف آ رہا ہے، میں اپنے فن پر گہرائی سے بات کرنا پسند کرتا ہوں۔''

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

ریڈیو شو کے بعد امجد صابری نے بتایا کہ چونکہ روزہ رکھنے کی وجہ سے دوا نہیں لے سکتا تھا، اس لیے زیادہ گفتگو کرنے کی وجہ سے مجھے پسینہ آ رہا تھا اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔''

یہ تھی قوتِ برداشت جو اس صابر شخص کے اندر مقید تھی۔ ایک کم عمر بچہ جو اس گھر کے صحن میں کھیلتا تھا، جہاں روز و شب قوالی کی ریاضت ہوتی تھی، صوفیائے کرام کے کلام کا ورد ہوتا تھا، جب بالغ ہوا تو خاندان کے ورثے کو لے کر چلا۔ پھر اس پر بزرگی اترنے لگی۔ اس کی نوعمری کی گفتگو میں پختگی آنے لگی۔ اس کی آواز سے شیریں کلامی گونجنے کی آواز میں پڑھی ہوئی دعا ''کرم مانگتا ہوں، عطا مانگتا ہوں'' کسی بھی بندے کی اپنے معبود کو پکارنے کی معراج ہے، اس سے زیادہ تاثیر اور سچائی ادا نہیں ہو سکتی، جس کو انہوں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ادا کر دیا۔ اس اکلوتی مناجات میں ہی وہ گہرائی اور وہ بلندی ہے جو انہیں حمدیہ کلام کی پڑھت میں لافانی کر دینے کے لیے کافی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس مناجات میں اس قدر تاثیر کا سبب کیا ہے، تو ان کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ ان کے دل کی آواز ہے، اس لیے اس میں سچائی بھی ویسی ہی ہے، کہنے لگے ''شاید یہی میری مغفرت کا سبب بن جائے۔''

والدین کی تربیت، گھر کا ماحول اور ان کی اپنی جدوجہد انہیں یہاں تک لے آئی تھی کہ وہ اب نہ صرف خود اس فن میں یکتا تھے، بلکہ نئی نسل کی خوش نما آوازوں کو بھی حریف سمجھنے کے بجائے انہیں دل سے پسند کرتے تھے۔ نوجوان نسل کے مقبول گلوکار عاطف اسلم نے جب ان کے والد کی قوالی ''تاجدارِ حرم'' گانے کی خواہش ظاہر کی، تو نہ صرف اس کی اجازت دی، بلکہ ان کی اس کوشش کو بھی سراہا۔

☆☆☆

نوے کی دہائی میں پی این سی اے نے بین الاقوامی موسیقی کانفرنس میں آخری شام قوالی کے لیے منسوب تھی۔ غلام فرید صابری اور ان کے بھائی نے قوالی کا سیشن شروع کرنا تھا، وہ بھی امیر خسرو سے۔ پروگرام شالیمار باغ میں رکھا تھا۔ ہزاروں لوگ تھے، یونیورسٹی کے بچوں کو کہیں جگہ نہیں ملی تو زمین پر بیٹھ گئے۔ کیا اچھے زمانے تھے۔ نہ کوئی بدتمیزی نہ فقرہ بازی، ممنون تھے لڑکے لڑکیاں کہ ان کو زمین پر ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی ہے۔

قوالوں کی نشست ختم ہونے کے بعد بھی اس صف میں سے ایک نوجوان لڑکا کام میں مدد کررہا تھا۔ نشست رات دو بجے ختم ہوئی۔ جب شائقین نے اس نوجوان کا نام پوچھا تو تو صابری صاحب نے خوش ہوکر کہا ''میرا بیٹا ہے، خود بھی اچھی قوالی کرلیتا ہے۔''

حال ہی میں ان کی ایک قوالی بھارتی فلم بجرنگی بھائی جان میں عدنان سمیع خان نے گائی جس پر انہیں اعتراض کا سامنا بھی کرنا پڑا کہ انہوں نے بغیر اجازت یہ قوالی چوری کرکے اپنے نام سے فلم میں شامل کی تھی۔

غلام فرید صابری کے بیٹوں میں امجد فرید صابری بالکل اپنے والد کے انداز میں قوالی گاتے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔ اکثر مختلف ٹی وی چینلز کے مارننگ شوز میں نظر آتے تھے۔ امجد صابری نے امریکا، برطانیہ اور کینیڈا سمیت دنیا کے مختلف ممالک میں فن کا مظاہرہ کیا اور اپنے والد اور چچا کے انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

امجد صابری کو پہلی مرتبہ عمرہ پر جانے کا اتفاق 1997ء میں ہوا جب لندن میں موجود بڑے بھائی کی شادی تھی۔ شادی میں شرکت کے لیے والدہ نے جانا تھا لیکن پاکستان سے روانہ ہونے کے دو دن قبل ہی ڈاکٹرز نے انہیں سفر کرنے سے منع کردیا۔ اب شادی کے لیے بہت سارا سامان لے کر جانا تھا اور انگلینڈ کا ویزا صرف امجد کے پاس ہی تھا اس لئے والدہ نے اسے جانے کا کہہ دیا اور وہ ٹکٹ بنوانے کے لیے ٹریول ایجنٹ کے پاس جا پہنچا۔ ٹریول ایجنٹ نے امجد سے کہا کہ آپ اسی ٹکٹ میں عمرہ کرتے ہوئے چلے جائیں تو کیسا رہے گا۔ ٹریول ایجنٹ کے ایسا کہنے پر امجد اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور خوشی سے چیخ و پکار کی۔ ٹریول ایجنٹ نے پوچھا کہ لندن جاتے وقت عمرہ کریں گے یا واپسی پر تو اس نے کہا کہ واپسی پر کروں گا۔

امجد صابری نے لندن میں بمشکل 6 دن قیام کیا اور جدہ آگیا جہاں ایک فاروق نامی بنگلہ دیشی ٹیکسی ڈرائیور ملا جس نے اسے ہوٹل بک کروا کر دیا۔ رات جدہ میں گزاری اور صبح صبح فجر پڑھ کر احرام وغیرہ باندھ کر کعبہ کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ، پیر حتیٰ کے پورا جسم کانپ رہا تھا کہ وہ اللہ کے حضور پیش ہونے جارہا ہے اور یہ سوچ رہا تھا کہ کون کون سی دعائیں پڑھوں گا۔ جب وہ پہنچ گیا تو نظریں جھکا کر کعبہ کی جانب بڑھا اور جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ سب کچھ ہی بھول گیا اور بس آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جو طواف مکمل ہونے تک نہیں رکے۔

یہ تھے امجد صابری۔۔۔!!!

☆☆☆

عشق جیسے ہے اک آندھی، عشق جیسے طوفاں
عشق کے آگے بے بس ہے دنیا میں ہر انساں
عشق میں سب دیوانے ہیں، عشق میں سب حیراں
عشق میں سب مشکل ہے، عشق میں سب آساں
تم سے مل کے دل کا ہے جو حال کیا کہیں
ہو گیا ہے کیسا یہ کمال کیا کہیں

فلم ''میں ہوں نا'' کے گیت پر ہال میں سونو نگم اور امجد صابری کی آواز نے جیسے سب کو پاگل کردیا تھا، مسلسل تالیوں کی گونج، منچلوں کا رقص اور جھومتے حاضرین یہ بتانے کے لئے کافی تھے کہ سونو نگم کی آواز کی پیچ، لے، اتار چڑھاؤ کا اگر پاکستان میں کوئی مقابلہ ہے تو وہ امجد صابری ہے، اس دن امجد صابری نے کلاسیکل اور جدت کا امتزاج پیش

کیا، جب وہ خاص انداز میں ''اللہ'' کہتے تو ہال میں شور مچ جاتا۔ یہ 2004ء میں سونو کے دورہ پاکستان کا واقعہ تھا اور یہ پرفارمنس کراچی میں پیش کی گئی۔

''میں دنیا کے کئی ممالک میں پرفارم کر چکا ہوں لیکن میری دلی خواہش ہے کہ مراکش میں منعقد ہونے والے سالانہ صوفی فیسٹیول میں حصہ لوں۔''

امجد صابری نے اپنی مخصوص عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی میرے آفس بھیج دیں، میں عید کے بعد مراکش جارہا ہوں، انشاء اللہ اس بار منعقد ہونے والے صوفی فیسٹیول میں آپ کو ضرور ساتھ لے جاؤں گا''

مشہور صنعت کار اور مراکش کے اعزازی سفیر مرزا اشتیاق بیگ نے امجد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ رمضان المبارک میں اتنے سارے چینلز کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے ہیں''

اشتیاق بیگ نے بات آگے بڑھائی۔

''میرے پاس وقت کم ہے، میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد پیار و محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں۔''

امجد صابری نے سنجیدگی سے کہا۔

''انشاء اللہ ہم بہت جلد مراکش ساتھ چلیں گے۔''

اشتیاق بیگ نے یقین کے ساتھ کہا

اگلا ہی دن امجد صابری کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا۔ اس کے پاس واقعی وقت کم تھا!!

تجھے کچھ وقت چاہیے مری جاں
وقت ہی تو نہیں بچا مرے پاس

☆☆☆

اپنی زندگی کی آخری سحری ٹرانسمیشن میں امجد صابری اشک بار ہو گئے، گھر آئے تو والدہ بے چینی سے ان کی منتظر تھیں۔

''مُنّے، کیوں دل بھر آیا تھا تمہارا، طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

ماں نے تڑپ کر امجد کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''اماں دل بہت اداس ہو رہا ہے''

امجد نے بے ساختہ کہا۔

''کیا بات ہے مُنّے تم اتنے بڑے ہو گئے کہ اماں سے باتیں چھپاؤ گے''

ماں نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

یہ بات سنتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے۔

''امی بس دل بہت عجیب ہو رہا ہے اور پتا نہیں بس اللہ خیر کرے، آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا بس اپنا خیال رکھیں، آپ کو اپنے پوتے پوتیوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں''

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور ماں کو تسلی دے کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

مگر نہ جانے کیوں ماں کا دل بہت عجیب سا ہو گیا، ایسا لگ رہا تھا کہ کلیجہ باہر آجائے گا، وہ اُس کے کمرے میں گئی اور امجد کو آواز دی۔

''امجد بیٹا ذرا بات سنو''

''اماں خیریت تو ہے کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟''

امجد کمرے سے باہر آیا، پھر وہ ماں کے پاس آیا اور انہیں ان کے کمرے میں لے کر گیا اور تسلیاں دینے لگا۔ ماں کی نظر جب گھڑی پر پڑی تو صبح کے 8 بج گئے تھے۔

''جاؤ تم سو جاؤ، تمہیں صبح جلدی اٹھنا ہے اور پھر پورا دن مصروف رہو گے''

ماں نے دنیا جہان کی محبتیں لہجے میں سمو کر کہا۔

''اماں ایک دو دن کی بات ہے پھر تو بس سکون کی نیند سونا ہے، ساری تھکن دور ہو جائے گی اور یہ جو آپ میری فکر کرتی ہیں نا اس کی عادت ختم کر دیں''

یہ کہہ کر اُس نے ماں کی آنکھیں بند کروائیں اور اپنے کمرے میں چلا گیا، اُس روز وہ اپنی حمد ''کرم مانگتا ہوں، عطاء مانگتا ہوں''، مستقل گنگناتا رہا۔

''اماں یہ مغفرت کا عشرہ چل رہا ہے نا؟''

جاتے جاتے امجد ماں سے پوچھنے لگا۔



"ہاں بیٹے یہ مغفرت کا عشرہ ہے"
ماں نے جواب دیا۔
"اللہ ہماری عبادتوں کو قبول کرے اور ہم سب کی مغفرت کا اعلان کر دے، آمین"
یہ کہتے ہوئے امجد کمرے سے باہر چلا گیا۔
صبح جب 11 بجے کے قریب ماں کی آنکھ کھلی تو امجد اٹھا ہوا تھا اور کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا، ماں نے اُس سے طبیعت پوچھی تو کہنے لگا جی ابھی تو ٹھیک ہے۔ اپنے بچوں کو اٹھایا اور کہا کہ مجھے دادا کا کلام "لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی" سناؤ، جس پر بیٹے نے کہا کہ بابا آج نہیں کل سنا دوں گا آج میرا دل نہیں چاہ رہا، جس پر اُس نے بے ساختہ جواب دیا کہ "ابھی بابا فرمائش کر رہے ہیں کہ تو نہیں سنا رہے پھر جب تمھارا سنانے کا دل چاہے گا تو میں نہیں سنوں گا"۔
اسی اثناء میں ظہر کی اذان ہوئی اُس نے فرمائش پر لال کرتا نکلوا کر پہنا، نماز ادا کر کے کہیں کام سے جانے کی تیاری کرنے لگا۔
"بیٹا کہاں جا رہے ہو"
ماں نے نماز سے فارغ ہو کر اُس سے پوچھا۔
"ابا کے پاس"
امجد نے برجستہ جواب دیا۔ ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔
"صبح سے کیا فالتو بکے جا رہا ہے"
ماں نے خفگی سے کہا۔
تو ہنستے ہوئے کہنے لگا "اماں فکر نہیں کرو میں واپس ضرور آؤں گا"
امجد ہنسنے لگا۔
"زیادہ دھوپ میں مت نکلنا گرمی بہت زیادہ ہے"
ماں نے تاکید کی۔
"امی گاڑی سے نہیں اتروں گا اب خوش ہو جائیں۔"
امجد نے ماں کو یقین دلایا۔
"بیٹے تم گارڈ رکھ لو اب، زمانہ بدل گیا ہے منّے"
ماں نے کسی اندیشے سے ہولتے ہوئے کہا۔
"ارے ماں جی، یہ لیاقت آباد ہے، میرا اپنا علاقہ، ایک آواز دوں تو لوگ کھنچے چلیں آئیں، ان

گلیوں کا بیٹا ہوں میں، ان گھڑوں پر پل بڑھ کر جوان ہوا ہوں، بھلا مجھے کیا ڈر ماں جی۔''

امجد نے بشاشت بھرے لہجے میں تین سموتے ہوا کہا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ مگر ماں کے دل کو قرار نہیں تھا۔

☆☆☆

22 جون 2016، رمضان المبارک کا مقدس مہینہ، سہ پہر چار بجے کے قریب سفید رنگ کی لگژری گاڑی BEE797 کی ڈرائیونگ کرتے ہوئے امجد مسلسل اپنی بے کلی کے بارے سوچ رہا تھا، جانے کیا بات تھی کی آج اس کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا، ہر شے سونی اور ہر رنگ پھیکا لگ رہا تھا، ماں کا چہرہ تو ہر وقت آنکھوں میں رہتا ہی تھا مگر ساتھ ہی آج جانے کیوں اپنے والد مرحوم شدت سے یاد آ رہے تھے۔ ساتھ والی سیٹ پر اس کا اسسٹنٹ، طبلہ نواز سلیم صابری بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے بھائی، آج گم صم کیوں ہو'' سلیم نے کہا۔

''بس یار، زندگی سے دل بھر گیا ہے اب''

امجد نے اپنی روایتی مسکراہٹ سے بات کو مذاق میں ٹال دیا۔

''امجد بھائی، آج تو روزہ لگ رہا ہے مجھے'' سلیم صابری نے بات بدلی۔

لیاقت آباد 10 نمبر پر معمول کی طرح بہت زیادہ رش تھا، فلائی اوور سے ٹرن کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار معمول سے زیادہ آہستہ کی گئی تھی مگر یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ اچانک امجد صابری کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا، گاڑی کے سامنے ایک بائیک آ چکی تھی، پیچھے بیٹھے شخص کے ہاتھ میں تیس بور کا پسٹل جھانک رہا تھا۔ اس نے سنبھلنا چاہا مگر اسے لگا کہ جیسے اس کے جسم اور سر میں کسی نے انگارے انڈیل دیے ہوں۔ تکلیف اور درد کی شدت رگ و پے میں پھیلتی چلی گئی۔ ایک بے اختیار کراہ امجد کے ہونٹوں سے پھوٹی۔ اس کا اسسٹنٹ بھی خون میں تر تھا۔ ونڈ سکرین پر تین مہیب سوراخ نمودار ہو چکے تھے، خون امجد کے جسم سے بہہ کر نقاہت پیدا کر رہا تھا، پھر اسے لگا کہ کسی نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولا ہے، وہی قاتل سامنے تھے۔ سلیم صابری بھی زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

''میرا قصور کیا ہے، مجھے مت مارو، رسول پاک کا واسطہ مجھے مت مارو، میرے چھوٹے بچے ہیں، میری ماں مر جائے گی''

امجد کے منہ سے ٹوٹتے الفاظ نکلے مگر سر پر کیپ پہنے سفاک قاتل نے مزید دو گولیاں اس کے جسم میں اتاریں، سر پر گولی مار کر اسے اپنا مشن مکمل ہونے کا یقین ہو گیا، وہ لاپروائی سے بائیک پر بیٹھ کر اسی لیاقت آباد سے حسن سکوائر کی طرف فرار ہو گیا کہ جس کے بیٹے کو مان تھا کہ اس کی ایک آواز پر لوگ دوڑے چلے آئیں گے، آج اس کا تنہا جسدِ خاکی پکار پکار کر اپنا قصور پوچھ رہا تھا۔

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

☆☆☆

امجد کسی کام سے گھر سے روانہ ہو گیا، اس دوران ماں کا دل مستقل گھبرا رہا تھا، دوپہر گھر پر لائٹ نہ ہونے کے سبب پڑوسی نے اطلاع دی کہ امجد کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے انتقال کی خبر ملی تو ماں نے خدا سے دعا کی کہ اللہ کرے یہ خبر جھوٹی ہو مگر کچھ ہی دیر میں اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔

اب شہید کی والدہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ زار و قطار رونے لگیں، جھریوں والے ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپایا اور ہچکیوں کے ساتھ کہا۔

''امجد اپنے بابا کے پاس چلا گیا۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا''

ایک قیامت تھی جو ایک ضعیف ماں پر گزر گئی۔ بچے سکتے میں تھے، آج انہیں پتا چلا کہ دھوپ کیا ہوتی ہے، شجر کا کٹ جانا کتنا بڑا سانحہ ہے، گھر میں ہزاروں آشنا اور نا آشنا جمع تھے مگر کتنا سناٹا



تھا، وہ چشموں جیسی ٹھنڈی آواز، وہ رونقِ محفل نہ رہا تو بھیڑ میں بھی تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔ امجد صابری کی والدہ کے ہونٹوں پر ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔

''میرے بیٹے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا، میرے بیٹے کا کیا قصور تھا''

تیرا نعم البدل نہیں کوئی
تُو فقط ایک ہی تو تھا مرے پاس

دنیا بھر میں اس خبر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پاکستان میں ان کے قتل کی خبر پر شدید عوامی ردعمل دیکھا گیا۔ پاکستانی صدر وزیر اعظم اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ، سندھ کے وزیر اعلیٰ سمیت کئی سیاسی رہنماؤں نے مذمت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی اداکاروں، گلوکاروں نے بھی اس کی مذمت کی۔ امجد صابری کے قتل پر پڑوسی ملک بھارت میں بھی کئی سیلیبریٹز نے افسوس اور مذمت کا اظہار کیا جن میں سونو نگم، عالیہ بھٹ، شبھا مدگل، کیلاش کھیر، رضا مراد وغیرہ شامل تھے۔ امجد صابری کی میت سرد خانے سے لیاقت آباد میں ان کی رہائش گاہ لائی گئی تو گھر میں کہرام مچ گیا جب کہ اس موقع پر ہر آنکھ اشکبار اور انتہائی رقت آمیز مناظر دیکھے گئے۔ امجد صابری نے سوگواران میں 2 بیوائیں اور 5 بچے چھوڑے جن میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے شامل ہیں۔ امجد صابری شہید 23 دسمبر 1976ء میں پیدا ہوائے اور 23 جون 2016 کو ان کی تدفین کی گئی اس طرح تین اور چھ کا ہندسہ ان کی زندگی میں بہت اہم رہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بہت اہم بات رہی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو اس وقت بھی رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا تھا اور افطار سے پہلے ان کی زندگی کا آغاز ہوا اور یہ بھی قدرت کا کمال ہے کہ رمضان المبارک میں ہی ان کی زندگی اختتام کو پہنچی اور افطار سے تقریباً 4 گھنٹے پہلے انہیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔

23 جون 2016 کو امجد صابری کو پاپوش نگر قبرستان میں، پیر حیرت شاہ وارثی کے دربار کے احاطے میں، والد کی پہلو میں دفن کیا گیا، نمازِ جنازہ لیاقت آباد روڈ پر ارم بیکری کے سامنے ادا کی گئی، نمازِ جنازہ دربار بابا فرید کے گدی نشین دیوان مسعود چشتی نے پڑھائی، شدید گرمی کے باوجود جانے کہاں کہاں سے لوگ جمع تھے، لگتا تھا کہ پورا کراچی ہی اُمڈ آیا ہے، اتنا عظیم الشان جنازہ کہ جس پر موت بھی رشک کرے، لیاقت آباد میں سیاہ جھنڈے لہراتے ماتمی فضا بنا رہے تھے، عورتیں، بچے، بزرگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، وہ شخص چلا گیا کہ جو غلامِ رسول تھا، جو ملنسار تھا، جو اخلاق کا پیکر تھا، مسکراہٹ اور انکساری جس کے وجود کا حصہ تھے، جو بڑوں اور چھوٹوں سے یکساں عزت سے ملتا تھا، جو عالمی شہرت کا فنکار تھا مگر مٹی میں مٹی بن کر اسے خوشی ملتی تھی، ظلمت کی گھنی رات نے آسمان کا سب سے روشن ستارہ نگل لیا، ستارے ٹوٹتے جا رہے ہیں، اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے...... رہے نام اللہ کا۔!!!

اندر بھی زمیں کے روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

☆☆☆

پہلی سچ بیانی

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بُو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

چاندنی



محمد سلیم اختر

اُس اداکارہ کی کہانی' جو ہر مرد کو بے وفا سمجھتی تھی مگر ایک پرستار نے اس کی سوچ ہی بدل ڈالی

بھور بن ہوٹل مری کے جنوب میں ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ہیرو اور ہیروئن کے ایک رومانی منظر کی فلم بندی ہونی تھی۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔ کیمرہ مین، لائن مین اور ڈائریکٹر کے علاوہ ہیروئن بھی لوکیشن پر پہنچ چکی تھی۔ ہیرو نے چھوٹی سی ٹیکری کی روڈ سے نمودار ہونا تھا اور ہیروئن کے سامنے آ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنا ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کہنا تھا۔

''شمع! میں تمہیں اپنے آپ سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں۔''

یہ منظر ہیرو اور ہیروئن کو ریہرسل کرا کے سمجھا دیا گیا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ''اسٹارٹ'' کی آواز گونجی۔ ہیروئن تیار ہوگئی۔ مگر ابھی تک ہیرو نمودار نہ ہوا تھا۔ اس کے منظر میں آنے سے پہلے ہی شوٹنگ دیکھنے والے ہجوم میں سے ایک حسین وجمیل نوجوان آگے بڑھا۔ اور تیزی سے ہیروئن کے قریب جا پہنچا۔ اس نے ہیروئن کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ فلم کا اصل ہیرو بھی آ گیا۔ ڈائریکٹر نے ''کٹ'' کی آواز لگا کر فلم بندی روک دی۔ پھر کیا تھا۔ یونٹ کا ہر فرد اس نوجوان پر پل پڑا۔ اس کی خوب پٹائی کی گئی اور اس کے ساتھ ہی شوٹنگ منسوخ کر دی گئی۔ اور اس نوجوان کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

☆☆☆

وہ واقعہ اگلے دن اخباروں میں چھپا۔ اور لوگوں میں اس کا خوب چرچا ہوا۔ اور اس کو اسکینڈل بنا کر پیش کیا۔ اگلے دن ہیروئن نے پریس کانفرنس کی اور فلموں میں کام نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ اخبار والوں نے اس نوجوان کو ہیروئن کا ناکام محبوب ظاہر کیا تھا۔ جبکہ وہ تو اسے جانتی بھی نہ تھی۔ ہیروئن کے پرستار اس کے فلمی دنیا چھوڑنے پر پریشان ہوگئے۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔ اس ہیروئن کا فلمی نام ''چاندنی'' تھا۔ وہ بہت ہی حسین اور بہترین اداکارہ تھی۔ اس کا نام ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت جانا جاتا تھا۔ ''چاندنی'' اس کا نام ہی انگ انگ میں رس گھول دینے والا تھا۔ جس طرح خوش رنگ پھول گلستان کی خوش نمائی بڑھا دیتے ہیں۔ لگتا تھا خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، ایسی آنکھیں

جن پر غزل نہیں پورا دیوان لکھا جا سکتا تھا۔ پلکیں اتنی گھنی تھیں کہ اپنے ہی بوجھ سے جھکی جھکی لگتی تھیں۔ رنگت ایسی کہ جیسے میدے کے پیڑے میں سرخ گلاب مل دیا ہو کسی نے۔ ہنستے ہوئے اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ بال اتنے گھنے اور سیاہ تھے جن پر نظر پڑتے ہی ساون کی گھٹائیں بھی شرماتی تھیں۔ اس کے پرستار بے شمار تھے۔ میں بھی اس کا پرستار تھا۔ اور اس کی ہر فلم ایک بار نہیں کئی بار دیکھتا تھا۔ وہ اداکاری میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی اداکاری پر

ملک اور ملک سے باہر بھی بج گئی۔ اس کی ہر فلم سپر ہٹ ہونے لگی۔ وہ واقعی بہت بڑی فن کارہ تھی۔ مگر اس کی ہر فلم کا بنیادی موضوع عورت ہوتی تھی۔ اور ساری فلم مرد کے منفی کردار کے گرد گھومتی تھی۔ وہ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے مساوی حقوق دینے کی حامی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور اپنی بے پناہ خوب صورتی کے بل بوتے پر مرد ذات کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا تھا اور وہ اس محاذ سے مردوں کی فطرت ، ہرجائیت، بُوالہوسی اور انانیت پر تابڑ توڑ حملے کرتی



حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔

چاندنی کے فلمی دنیا چھوڑنے کے اعلان سے کئی دل مرجھا گئے۔ اس نے وہ فلم مکمل کی تھی اور اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی تھی۔ اس کے بعد اس نے کسی فلم میں کام تو نہ کیا مگر اس نے فلم سازی اور ہدایت کاری شروع کر دی۔ اور اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا اور اس کی بنائی ہوئی فلموں کی دھوم

رہتی تھی۔ اس کی ہر فلم میں عورت کو مظلوم اور مرد کو ظالم ہی دکھایا جاتا تھا۔ اور فلم کے کلائمکس میں وہ مرد کو اتنا ننگا کر دیتی تھی کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس نے ایک فلم ایسی بھی بنائی جس میں مرد کا کوئی کردار ہی نہ تھا۔ اور وہ فلم سپر ہٹ ہوئی تھی۔ اس کے اس انتقامی اور غیر معمولی رویے کی وجہ وہی بھوربن ہوٹل والا واقعہ تھا۔ وہ اکثر اپنے

انٹرویو میں صاف کہتی تھی کہ وہ صفِ مخالف سے متنفر ہو چکی ہے۔ اور اس کی فلموں کی کامیابی اس کی مردوں سے نفرت کی عکاسی کرتی ہیں۔

☆☆☆

میں پھر بھی اس کا پرستار تھا اور اس کی فلمیں شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی کئی تصویریں میرے البم کی زینت بھی بنی ہوئی تھیں۔ میرے گھر میں میرے علاوہ میری چھوٹی بہن شیزی بھی اس کی پرستار تھی۔ ہم دونوں اکٹھے اس کی فلمیں دیکھا کرتے اور پھر اس کے حسن اور اداکاری کی تعریفیں کرتے۔ پھر شیزی کی شادی ہوگئی مگر چاندنی اس کی ہم سفر ہی رہی۔ شیزی کی زندگی نہایت ہی خوش گوار گزر رہی تھی۔ پھر چاندنی کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلمیں اس کی نجی زندگی پر اثر انداز ہونے لگیں۔ مردوں کے خلاف بنائی ہوئی فلمیں اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے لگیں۔ شوہر کو مجازی خدا سمجھ کر اس سے نباہ کرنے والی شیزی صبر کی نعمت سے محروم ہوگئی۔ اس کی زبان چاندنی کی زبان بن کر کھلنا شروع ہوگئی۔ اس کا شوہر کمال احمد محبت کرنے والا۔ مگر ایک سخت گیر شخص تھا۔ شیزی کے رویے نے اسے روایتی شوہر بنا دیا۔ ان کی ازدواجی زندگی تہس نہس ہوگئی۔ محبت کی پھلواری نفرت کی آگ میں جلنے لگی۔ بالآخر کمال نے شیزی کو طلاق دے ڈالی۔ شیزی نے گھر واپس آ کر بہت ہنگامہ کیا اور مجھے کمال کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ میں نے کمال سے لڑائی جھگڑا کیا۔ اس لڑائی میں میرے ہاتھوں کمال کا قتل ہوگیا۔ اور میں گھر سے فرار ہوگیا۔ قانون اور پولیس سے بچنے کی خاطر میں بھاگتا بھاگتا علاقہ غیر جا پہنچا۔ یوں میں پولیس سے بچ کر محفوظ تو ہوگیا مگر مجھے کسی پل چین نہ تھا۔ کمال کو قتل کر دینے کا مجھے افسوس تھا اور پچھتا رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوگیا۔ اس قتل کا ذمہ دار میں ہوں شیزی یا پھر چاندنی؟ تین ماہ علاقہ غیر میں گزر گئے۔ اس عرصہ میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس سارے واقعہ کی ذمہ دار چاندنی ہے۔ لہٰذا میں نے چاندنی کو سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا۔ یہی سوچ اور فیصلہ مجھے علاقہ غیر سے واپس لے آیا۔ میرے پاس اسلحہ بھی تھا اور جیب میں پیسے بھی تھے۔ میں پوری تیاری اور احتیاط کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے چاندنی کی رہائش کا بخوبی علم تھا۔

☆☆☆

رات کے ٹھیک دس بجے تھے۔ جب چاندنی کی خواب گاہ کی کھڑکی کھلی اور میں دھم سے اندر کود گیا۔ نرم قالین نے میرے قدموں کی آواز کو جذب کر لیا۔ میں نے دیکھا نائٹ بلب کی روشنی میں ایک قیمتی مسہری پر ایک حسین جسم سجا ہوا تھا۔

''چاندنی عزیز، عمر 28 سال۔ دراز قد، سفید رنگ دلکش چہرہ۔ غیر شادی شدہ'' وہ اپنے ادھیڑ عمر باپ کے ساتھ اس کوٹھی میں تنہا رہتی تھی۔ دو تین ملازم تھے جو سرونٹ کوارٹرز میں سو رہے تھے۔ چوکیدار کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میں اسے ایک کوٹھڑی میں چھوڑ کر باہر سے کنڈی لگا آیا تھا۔ کیم شحیم خانساماں کے سر پر میں نے چوکیدار سے چھینی ہوئی بندوق کا ایسا بٹ مارا کہ وہ صبح سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے کھڑکی کی چٹخنی چڑھائی۔ دروازے کی چٹخنی تو پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ بندوق دائیں ہاتھ میں تھام کر میں نے بایاں ہاتھ چاندنی کے منہ پر جما دیا۔ وہ کسمسا کر جاگی اور خوف ناک منظر دیکھ کر پوری قوت سے چلائی۔ لیکن وہ آواز اس کے حلق کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ پھر اس کا ہاتھ نہایت تیزی سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ وہ کال بیل کا بٹن دبانا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے پھرتی سے ٹانگ مار کر ٹیبل دور کھسکا دی۔ چاندنی پھٹی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس حالت میں بھی اس کا جسم قیامت ڈھا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''جانِ من! کھڑکی سے باہر دیکھو۔ زبردست بارش شروع ہوگئی ہے۔ تمہارے نوکروں کی کوٹھڑیاں اتنی دور ہیں کہ چیخ چیخ کر تمہارے

پھیپھڑے بھی چاک ہو جائیں تو تمہاری آواز ان تک نہیں پہنچے گی۔ رہا چوکیدار تو وہ رسیوں سے بندھا ایک اندھیری کوٹھڑی میں پڑا ہے اور تمہارا خانساماں باورچی خانے کے گیلے فرش پر گہری نیند سو رہا ہے۔ باقی رہا تمہارا بوڑھا باپ تو اس کو انٹر کام پر بلانے کی حماقت تم یقیناً نہیں کرو گی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ دل کے مریض ہیں۔ انھیں دو اٹیک ہو چکے ہیں اور آج کی رات تیسرا اٹیک ان کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ اگر میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹالوں تو تم چپ چاپ بیٹھی رہو گی۔

چاندنی کی آنکھوں میں نظر آنے والی پریشانی مزید گہری ہوگئی۔ اسے میری باتوں کا یقین ہو گیا تھا۔ میں نے بندوق کو جنبش دی اور اس کے منہ سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور کھڑکیوں کے آگے دبیز پردے کھینچ دیے۔

''میں شاہ جہاں ہو میڈم!'' میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''تم...... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔'' چاندنی کی لرزاں آواز اُبھری۔

''تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا...... لیکن تمہاری فلموں نے میری زندگی برباد کر دی ہے چاندنی عزیز۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ گھگھیائی۔

''میڈم چاندنی۔ میں ایک پڑھا لکھا شخص ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں اور کروں گا اس کے لیے میرے پاس ایک معقول جواز ہوگا۔ آج رات میں تمہارا مہمان ہوں۔ اور تم میری میزبانی کرو گی۔ اگر فریج میں کچھ کھانے پینے کے لیے ہے تو نکال لاؤ۔'' میرا لہجہ کچھ ایسا تحکمانہ تھا کہ وہ خود بخود بستر سے اتر آئی۔ فریج کھول کر اس نے اندر جھانکا اور اپنے بڑھتے ہوئے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ دروازہ فریج سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے تیزی سے سوچا اور ایک فوری حرکت کے تحت دروازے کی طرف لپکی۔

لیکن اس کا ہاتھ چٹخنی تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا مضبوط ہاتھ اس کی نازک کلائی پر پڑا۔ ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ اڑتی ہوئی مسہری پر جا گری۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے نہایت ہی سفاکی سے بندوق کی نالی اس کی گردن پر رکھ دی۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ کر بڑے اطمینان سے کہا۔

''میں جرم کے جس درخت کا پھل کاٹنے والا ہوں۔ اس کی جڑیں تم تک پہنچتی ہیں میڈم۔'' میری بہن کی زندگی بڑی خوش گوار گزر رہی تھی اور پھر اس کی زندگی میں تم اور تمہاری فلمیں آئیں اور اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول گئیں۔ میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ گیا تو میں نے اپنے بہنوئی کا خون کر ڈالا۔ اب میں پولیس اور قانون کی نظروں سے بچتا پھر رہا ہوں۔ میں اب جلد گرفتار ہو جاؤں گا اور سزا بھی بھگتوں گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی سزا تمھیں ملے لیکن اس میں جتنا قصور تمہارا ہے اس کی سزا تو تمھیں ضرور ملنی چاہیے۔ میں تمہارا پرستار تھا اور اب بھی ہوں۔ تمہاری اداکاری اور حسن پاگل کر دینے والے تھے۔ آج تمہارے حسن کا جی بھر کر دیدار تو کروں گا۔''

چاندنی اب بُری طرح سہم گئی تھی۔ وہ میرے آگے بے بس ہوگئی تھی۔ میں نے خود ہی فریج کھولا اور کچھ پھل لے کر دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا۔ مجھے سے انگور توڑتے ہوئے میں نے بندوق کو حرکت دی اور سرد و سفاک لہجے میں کہا۔

''چاندنی جی! اُٹھو اور ڈریسنگ روم میں جا کر اپنا سب سے پسندیدہ لباس پہنو اور ایسا بھرپور اور جاندار میک اَپ کرو۔ کہ آج تمہارے ترکش کا کوئی تیر باقی نہیں بچنا چاہیے۔ چلو شاباش جلدی کرو۔'' میرے لہجے میں کچھ ایسی دھمکی پوشیدہ تھی کہ چاندنی خوف زدہ ہو کر زرد پڑ گئی۔ وہ لرزاں قدموں کے ساتھ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ تو میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''فلموں والی کوئی ہوشیاری نہیں چلے گی میڈم! میرے ہاتھ میں بندوق ہے۔ اور میں تمھیں بتا چکا

ہوں کہ میں قاتل ہوں۔''

چاندنی نے میری بندوق کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور ایک گھنٹے بعد بن سنور کر باہر نکلی۔ وہ سچ مچ کی دلہن لگ رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔ منظر وہی لگ رہا تھا۔ جیسا فلموں میں اس وقت دکھائی دیتا ہے۔ جب ہیروئن عروسی جوڑے میں ملبوس صبح کے وقت سیج سے اٹھتی ہے اور سوچتی ہے کہ رات بھر اس کا دولہا کیوں نہیں آیا۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ چاندنی کے ذہن میں تازہ ہوگیا۔ وہ بن سنور کر مسہری پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا سراپا اس وقت قیامت ڈھار ہا تھا۔ میں بندوق گود میں رکھے اسے دیکھتا رہا۔ پتھر کی طرح ساکت اور بے حس وحرکت۔ اس کے حسن لازوال نے مجھے مبہوت کر ڈالا تھا۔ اس کا حسن وشباب دوآتشہ بن گیا تھا۔ میرا جسم جلنے لگا۔ دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں اور میں دہکتے جذبات کے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ اس کے جسم کی تپش اور مہک میرے وجود میں رچ بس گئی تھی۔ پوری رات ایک بے جنبش خاموشی کے سائے میں گزر گئی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کس وقت اونگھ آگئی اور وہ تکیے سے ٹیک لگائے سوگئی۔ اس نے اپنا آپ گویا مجھے سونپ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب وہ ہر طرح سے میری دسترس میں تھی۔ میرا انتقام کہہ رہا تھا کہ میں اسے روند ڈالوں۔ مگر میں ایسا نہ کرسکا۔ شاید میں بزدل تھا۔

صبح ہوگئی تھی۔ مؤذن کی آواز واضح سنائی دینے لگی۔ تو میں نے بندوق کے بٹ ہی سے اس کو جگایا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور اپنے لباس اور اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ دونوں ہی سلامت تھے۔ اسے یقین نہ آرہا تھا کہ میں نے اس کے جسم کو چھوا تک نہیں تھا۔ میں اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی بولا۔

میڈم چاندنی! صبح ہوگئی ہے۔ میں جارہا ہوں۔ یقین جانو میں نے تمہارے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا تمھیں یہ بتانے اور احساس دلانے کے لیے کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تم اپنی نئی فلم میں یہ تذکرہ ضرور کرنا۔ ایک ایسے مرد کا۔ جو کنوارا جوان تھا۔ اور مجرم بھی تھا۔ وہ ایک رات تمہاری خواب گاہ میں آیا تھا۔ اس نے تمہارے حسن اور دلکشی کے تمام تیر اپنے سینے پر جھیلے تھے اور اپنی زندگی کی سب سے حسین رنگین اور مہربان رات تمھیں یہ بتانے کے لیے قربان کردی تھی کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے ہر کا اپنا اپنا ظرف ہوتا ہے۔

ملک کی سب سے مصروف اور ذہین ہدایت کار جو فلم کو مشن سمجھ کر بناتی تھی۔ بے دم ہوکر مسہری پر گرگئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ نکلے۔ ''کٹ ...... کٹ!'' وہ دل میں چلائی۔ لیکن اشکوں کا سیلاب۔ شاید نفرت کے سارے قلعوں کو بہالے جانے کی قسم کھا چکا تھا۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔ تو اس نے پکارا۔ ''شاہ جہاں۔''

مگر میں نہ رہ سکا۔ میرا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ جہاں میں نے گرفتاری دے دی۔

☆☆☆

جیل میں مجھے ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے۔ کہ میری رہائی کا حکم آگیا۔ میں جب جیل سے باہر نکلا۔ تو چاندنی کو پھولوں کے ہار اٹھائے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں ہار ڈالا اور مبارک دی۔

''میڈم یہ سب کیسے ہوگیا؟'' میں نے آنکھوں میں حیرانی کے سائے لہراتے ہوئے کہا۔

''میں نے کمال کے گھر والوں کو خون بہا ادا کر کے تمہاری معافی کرالی ہے۔ کیوں کرائی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تم مجھے ساری دنیا کے مردوں سے مختلف لگے ہو۔ اتنے مختلف کہ میرے دل میں بس گئے ہو۔''

چاندنی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو مجھے یوں لگا کہ میرے چاروں طرف رنگ برنگ پھول کھل اٹھے ہوں۔

☆☆☆

دوسری سچ بیانی

جائے سکون



ضرغام محمود

حسد کی آگ میں اپنے ہی گھر کا سکون برباد کر دینے والی ایک عورت کا کارنامۂ بد

میں ہمت کر کے بستر سے اٹھی میرا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرے سر پر منوں بوجھ لاد دیا ہو۔ میرا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا حالانکہ رات میں ٹھیک ٹھاک سوئی تھی مگر صبح مجھ سے

اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھی اور صحن میں لگے نل تک پہنچی، میرا مقصد وضو کرنا تھا۔ فجر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر وضو کرنا شروع کیا پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا تھا میں بار بار وضو کرنا کیوں بھول رہی ہوں۔ منہ دھونے جاتی ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ میں نے کلی نہیں کی، میں نے بار بار سر کو جھٹک کر پریشان کن خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہا، جیسے تیسے وضو کر کے میں نے جاء نماز بچھائی اور نماز کے لیے کھڑی ہوئی اچانک شدید بدبو کے بھبکے میری ناک میں گھسنے لگے۔ میرا دم گھٹنے لگا مجھے ابکائی آ گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر میں نے ابکائی روکی مجھے ایسا لگا جیسے کسی انجانی قوت نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ میں اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہل سکی۔ اچانک مجھے سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ وہ خوب صورت اور دراز قد عورت تھی مگر...... مگر اس کے جسم سے اٹھتی بدبو میری سانس روک رہی تھی۔ اس عورت کی آنکھوں میں شرارے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس کے ہاتھوں سے اتنی بدبو آ رہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ وہ عورت میرے اور قریب آ گئی۔ اس کے سنہری بال میرے گالوں سے ٹکرا رہے تھے۔ اچانک اس عورت کی صورت بدلنے لگی۔ اس کے موتی جیسے دانت باہر کو نکلنے لگے ذرا سی دیر میں اس کی شکل بدل گئی۔ وہ ایک خوب صورت عورت سے ایک کریہہ صورت چڑیل بن چکی تھی۔ اس کے پاس سے تعفن کی ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا نہ جانے کتنے دنوں پرانا گوشت سڑ گیا ہو جس میں کیڑے لگ گئے ہوں مگر وہ عورت نہایت اطمینان کے ساتھ میرے پاس کھڑی تھی۔ بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ پھر میرا سر اتنی زور سے چکرایا کہ میں جاء نماز پر ہی گر گئی اور مجھے ہوش نہ رہا۔

☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو تمام گھر والے میرے اطراف کھڑے تھے۔ ابا جان، امی جان، چاچو، چچی جان، دانیال بھائی، قمر اور مہک سب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔

''کیا ہوا کنول بیٹا؟'' امی جان نے فکر مندی سے پوچھا۔

''امی...... امی...... وہی خواب جو میں کئی دن سے دیکھ رہی تھی مگر آج تو جاگتی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت میرا گلا دبانا چاہتی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''بیٹا! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے آپ کا وہم ہو گا۔'' چچی سلمیٰ نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ میری بچی کو کسی اللہ والے کے پاس لے جائیں۔ یہ ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں ہے۔'' امی جان ابا جان کی جانب مڑتے ہوئے بولیں۔

''کیسی احمقوں والی بات کر رہی ہو۔ اس کو دوا پلاؤ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ابا جان نے جواب دیا اور کمرے سے چلے گئے۔ امی جان نے مجھے ڈاکٹر کی دی ہوئی کڑوی دوا پلائی۔ ان ہی کی زبانی پتا چلا کہ میں جاء نماز پر بے ہوش پائی گئی تھی اور تقریباً دس گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تھا، دوا پی کر مجھ پر پھر غنودگی چھانے لگی اور میں سو گئی۔

☆☆☆

''جائے سکون'' اس سے آپ کیا سمجھے۔ کچھ نہیں۔ یہ میرے گھر کا نام ہے ''جائے سکون'' یہ بڑا سا گھر دادا جان نے بنوایا تھا کہ ان کی تمام اولاد سکون سے ایک گھر میں رہے مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دادا جان کی سات میں سے پانچ اولادیں جوان ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں، بس میرے ابا جان حاجی منظور احمد اور میرے چاچو حاجی ضمیر احمد ہی باقی بچے۔ دادا جان کے انتقال کے بعد بھی ابا جان اور چاچو نے دادا کی خواہش کا احترام کیا اور اس گھر میں ساتھ ساتھ رہے۔ اس جائے سکون میں ابا جان، امی جان اور میرے علاوہ میرے بڑے بھائی دانیال بھائی رہتے ہیں جب کہ چاچو اور سلمیٰ چاچی کے دونوں بچے قمر اور مہک بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ قمر مجھ

سے دو ماہ بڑا تھا اور مہک مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارا گھر واقعی جائے سکون ہے اس گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا کوئی چیخ نہیں ہے حالانکہ ابا جان اور چاچو کا کاروبار الگ الگ ہے مگر گھر میں سب شیر وشکر ساتھ رہتے ہیں۔ ابا جان کی مارکیٹ میں چلتی ہوئی بڑی سی گارمنٹس کی دکان ہے۔ دانیال بھائی ابا جان کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں جب کہ چاچو گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا کام کرتے ہیں۔ میری اس گھر میں ایک الگ شان ہے۔ وجہ کیا ہے یہ آپ سوچ رہے ہوں گے۔ چلیے میں بتاتی ہوں۔

ہمارے گھر میں تعلیم کا کوئی زیادہ رواج نہیں ہے۔ امی اور چاچی نے تو شاید اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ ابا جان اور چاچو بھی پرائمری تک ہی پڑھ سکے۔ دانیال بھائی نے جیسے تیسے میٹرک کیا اور کاروبار میں ابا جان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ قمر نے بھی دو سال فیل ہونے کے بعد اس سال میٹرک کیا ہے جب کہ مہک ابھی نائن کلاس میں ہے مگر وہ بھی پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں ہے۔ اگر اس خاندان میں کوئی پڑھائی میں اچھا ہے تو وہ میں یعنی کنول منظور احمد ہوں۔ میں نے میٹرک میں بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب انٹر میں بھی میری پوزیشن آئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر بننے کا بے حد شوق ہے اور اسی شوق کی خاطر میں بے حد محنت کر رہی ہوں۔ دو ہفتوں بعد میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ ہونے والے ہیں مگر پچھلے تین دن سے میری حالت بہت بری ہے۔ میں کتاب اٹھاتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرا دماغ جکڑ لیا ہو۔ دو دو گھنٹے پڑھنے کے باوجود میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کچھ پڑھا ہی نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

ایک دن آرام کے بعد میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میڈیکل کے ٹیسٹ میں چند دن رہ گئے تھے۔ میں نے اپنی تمام کتابیں صاف کیں اور یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کے لیے کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی ہی تھی کہ میری ناک میں بدبو کی ایک لہر گھس گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا' وہی تھی۔ وہ عورت جس نے میری زندگی جہنم بنا دی تھی۔ وہ کھلی کھڑکی سے کسی دھوئیں کی مانند کمرے میں آئی اس کے جسم سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا وہ اپنی انگارہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟'' اس کی آواز گونجی۔

میں نے کسی معمول کی طرح کتاب اس کی طرف بڑھائی مگر پھر بے اختیار چیخ پڑی۔ میرے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی بلکہ میرے ہاتھ پر انتہائی گندے اور غلیظ کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور دونوں ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر کیڑوں کو خود سے دور کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر اس عورت نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

''اب اگر تم نے کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کی تو.......''

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' میں چیخی مگر وہ قہقہہ لگاتی رہی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے، اس کے ہاتھوں سے نکلنے والی گندی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس عورت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑ لی۔ میری گردن کی ہڈی چٹخنے لگی۔ اس عورت کی گرفت بہت سخت تھی۔ مجھے لگا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں نے کلمہ پڑھنا چاہا مگر مجھے کلمہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تو میرے منہ سے کلمہ طیبہ بلند ہوا۔ کلمے کے الفاظ جیسے ہی میرے منہ سے ادا ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا ہو۔ اس عورت کے ہاتھوں سے میری گردن چھوٹ گئی اور اس عورت کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ وہ ایک خوب صورت عورت سے بھیانک اور کریہہ چہرے والی چڑیل بن گئی۔ جس کے سارے دانت باہر تھے۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بہت بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے جبڑے انتہائی حد تک بڑے تھے کہ اس کا حلق تک نظر آ رہا

تھا۔ اس کے سر کے بال نہ سفید تھے نہ کالے وہ انتہائی کریہہ صورت تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک لاٹھی پکڑی ہوئی تھی جس سے ایک سانپ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے پھر ایک قہقہہ نکلا اس کا قہقہہ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند گھس رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا پھر بھی اس چڑیل کی آواز میرے کانوں میں گھس رہی تھی۔ ''نہیں چھوڑوں گی تجھے نہیں چھوڑوں گی۔'' یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

☆......☆

''خدا کے لیے میری بچی کو کسی اللہ والے کے پاس لے کر جاؤ۔'' امی جان ابا جان سے بولی تو ابا جان نے فکرمندی کے انداز میں سر ہلایا۔ ''دیکھو ذرا دو دن میں کیسی ہلدی کی طرح پیلی ہو گئی ہے۔ کہاں تو اس گھر میں اس کے قہقہے گونجتے تھے اور اب قبرستان سی خاموشی چھا گئی ہے۔'' امی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کی بڑبڑاہٹ سے تنگ آ کر ابا جان کمرے سے باہر چلے گئے۔

''ہائے اللہ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ میں کیا کروں۔'' امی جان رونے کے انداز میں بڑبڑائیں۔ میں انتہائی نقاہت کی حالت میں بستر پر لیٹی تھی کہ اسی وقت قمر کمرے میں داخل ہوا اور امی جان کو سلام کرتے ہوئے بولا۔

''تائی امی...... کنول کے ماموں آئے ہیں۔''

''ہاشم بھائی...... ہاشم بھائی آئے ہیں۔'' امی جان نے قمر سے پوچھا۔ اسی وقت ہاشم ماموں کمرے میں داخل ہوئے اور سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔''

''کیسی طبیعت ہے کنول کی۔'' ماموں جان نے پوچھا۔

''بھائی جان۔'' امی جان دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونے لگیں۔

''ماموں...... کنول کی حالت کئی دن سے خراب ہے مگر دو دنوں سے تو اس کی طبیعت میں کوئی سدھار نہیں آ رہا۔'' امی جان سے جب بات نہ کی گئی تو قمر نے ماموں کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

''کنول کی طبیعت کئی دن سے خراب ہے اور مجھے خبر تک نہیں کی۔ اگر آج صبح قمر مجھے فون کر کے کنول کے بارے میں نہ بتاتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔'' ماموں جان نے امی سے گلہ کیا۔

''ہم لوگ اس کی طبیعت کی وجہ سے اتنے پریشان تھے کہ کچھ یاد ہی نہیں رہا۔'' امی جان نے عذر پیش کیا۔

''کیسا ہے میرا بیٹا۔'' ماموں جان نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تو میں ہلکے سے مسکرا دی۔ ماموں جان بغور میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے میری آنکھوں کا معائنہ کسی ڈاکٹر کی طرح کیا۔ پھر ہولے ہولے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگے۔

''بھائی جان میری بیٹی کو کیا ہوا ہے؟'' امی جان نے ماموں سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کسی نے اس پر گندا علم کروایا ہے جیسے جادو ٹونا یا سفلی وغیرہ۔ میں نے یہاں آنے سے قبل اپنے پیرو مرشد سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کنول کو ان کے پاس لے کر آؤ لہٰذا میں کنول کو لینے آیا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں بھائی جان ضرور لے کر جائیں میری بیٹی کو۔ اللہ اس کو تندرستی دے۔'' امی جان بولیں۔

''جلدی سے کنول کو تیار کر دو میں اسے ابھی حیدرآباد اپنے مرشد کے پاس لے کر جاؤں گا۔''

''حیدرآباد...... اتنی دور۔''

''دو گھنٹے کا راستہ ہے حیدرآباد کا۔ شام تک واپس آ جائیں گے۔'' ماموں جان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور قمر، ماموں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھے حیدرآباد کی جانب جا رہے تھے۔ راستے میں ماموں جان نے بتایا کہ ان کے مرشد جنہیں سب شاہ جی کہتے ہے بڑے اللہ والے بزرگ ہیں۔ حیدرآباد پہنچنے کے بعد ماموں نے گاڑی شاہ جی کے گھر کے سامنے روکی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر

نیچے اترے اور گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی میں قمر کا سہارا لے کر گاڑی سے اتری اور گھر کی جانب بڑھی۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کسی طاقت نے میرے قدم جکڑ لیے ہوں، مجھ سے ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہو گیا۔ میں مضبوطی سے قدم جما کر ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا۔ آگے کیوں نہیں بڑھ رہی ہو۔" قمر بولا پھر اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ گھبرا گیا۔ میرا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔

"ماموں......" قمر زور سے چیخا تو ماموں جان نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا اسی وقت گھر کا دروازہ کھلا اور ایک نورانی صورت کے بزرگ جن کی لمبی لمبی سی سفید داڑھی تھی۔ سفید کرتا پاجامہ پہنے اور سر پر سفید کروشیے کی ٹوپی پہنے گھر سے باہر نکلے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ساری صورت حال سمجھ گئے۔ انہوں نے قمر سے میرا ہاتھ چھوڑنے کا کہا اور قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے میرے قدم چھوڑ دیے ہوں۔ میرے قدم خود بخود گھر کی جانب اٹھنے لگے۔ شاہ جی نے گھر کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی تو ایک بڑی عمر کی عورت گھر سے نکلی۔ شاہ جی نے اسے کچھ کہا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر کے اندر لے گئی۔ گھر کے اندر پہنچ کر اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا۔ کمرے میں ہر چیز سفید تھی۔ در و دیوار سے لے کر کمرے کا فرنیچر تک سفید تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے پاکیزگی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ تھوڑی دیر میں شاہ جی بھی کمرے میں داخل ہوئے اور باآواز بلند سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ شاہ جی زمین پر بچھی فرشی دری پر بیٹھ گئے۔ میں، ماموں اور قمر ان کے سامنے ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔

"کنول بیٹا! پہلے تو یہ بات آپ سمجھ لیں کہ میں آپ کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا جو مسئلہ آپ کے ساتھ پیش آ رہا ہے وہ آپ کو خود حل کرنا ہو گا۔ میں آپ کو صرف راستہ بتا سکتا ہوں۔ اس راستے پر چلنا، مشکلات اٹھانا آپ کی ذمہ داری ہے اگر آپ نے میرے بتائے ہوئے طریقہ کار پر عمل کیا تو انشاء اللہ آپ کا یہ مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔"

میں غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے جو بات ان کی طرف کھینچ رہی تھی وہ ان کے چہرے کا تقدس تھا ان کی شخصیت میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ انہوں نے تفصیل سے مجھ سے سارے حالات سنے۔

"کیا آپ کا خیال ہے، مجھ پر کسی نے جادو وغیرہ کروایا ہے۔" تمام حالات بتانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"یقیناً جادو برحق ہے۔ ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جادو کیا گیا تھا اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے امت کو معوذتین کا تحفہ دیا، معوذتین یعنی سورہ الفلق اور سورہ الناس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے لیے تحفہ ہیں۔ جادو اور سفلی کا توڑ ان دو سورتوں میں موجود ہے۔"

"شاہ جی جادو کیسے ہوتا ہے؟" قمر جو اتنی دیر سے خاموش تھا بول اٹھا۔

"جادو میں عموماً شیاطین سے مدد مانگی جاتی ہے مطلب غیر اللہ سے مدد طلب کی جاتی ہے اسی لیے جادو کو شرک جیسے گناہوں نے گناہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر یہ اہم بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی پر جادو یا سفلی کروانے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ عموماً قریبی لوگ ہی مہیا کر سکتے ہیں۔"

"کنول پر ہمارے گھر میں سے کسی نے جادو کروایا ہے؟" قمر نے حیرت سے پوچھا۔

"ضروری نہیں ہے اکثر کوئی گھر والا نادانی میں کسی باہر والے کی مدد کر بیٹھتا ہے۔ تم بلاوجہ شک نہ پالو۔" شاہ جی نے قمر سے کہا پھر میری جانب متوجہ ہوئے اور بولے۔ "باقاعدگی سے نماز پڑھا کرو اور باوضو رہنے کی کوشش کرو۔ معوذتین پڑھتی رہو جو

خصوصاً اسی مقصد کے لیے اتاری گئی ہے۔ رات کو
سوتے وقت باوضو سونے کی کوشش کرو اور آیت الکرسی
پڑھ کر سویا کرو اور کوشش کیا کرو کہ فجر کی نماز کے بعد
قرآن ضرور پڑھا کرو اس سے تمہارا دماغ روشن ہوگا
اور تمہیں سکون میسر آئے گا اور اٹھتے بیٹھتے آیت الکرسی
اور معوذتین کی تلاوت کی عادت ڈال لو، اللہ تمہارے
سامنے سارے بھید کھول دے گا۔ بس وہ ہی پیدا
کرنے والا اور مارنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی
ہمارا مددگار، پالن ہار نہیں ہے۔ اس یقین کے ساتھ
دعا مانگو گی تو کبھی بارگاہ الٰہی سے خالی ہاتھ نہیں لوٹائی
جاؤ گی۔ ہر تکلیف میں صبر اور کلام الٰہی سے مدد حاصل
کرو، یقیناً کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

شاہ جی نے دعا دے کر ہمیں رخصت کیا۔ میرا
دل جو ایمان سے خالی ہو رہا تھا۔ آج پھر بھر گیا جب
میں شاہ جی کے گھر سے باہر نکلی تو ایک دم ہلکی پھلکی تھی۔
شاہ جی کی رہنمائی نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔

شاہ جی کے گھر سے لوٹنے کے بعد میں ذہن میں
ان کی ہر بات دہرا رہی تھی۔ اب میری کوشش ہوتی
تھی کہ میں ہر وقت باوضو ہو کر کبھی آیت الکرسی پڑھتی
اور کبھی معوذتین کی تلاوت کرتی، قمر اور مہک نے میرا
بہت ساتھ دیا جب میں خاموش ہوتی تو مہک با آواز
بلند قرآن کی تلاوت کرنے لگتی۔ میں نے پنج وقتہ نماز کو
اپنی عادت بنا لیا، میری کوشش ہوتی کہ میں زیادہ سے
زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کروں۔

☆......☆

ایک رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں تھوڑی
دیر ہی سوئی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے بے انتہا بے
چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جب سے میں شاہ جی کے گھر
سے واپس آئی تھی میری طبیعت بہت بہتر تھی۔ مجھے
اس چڑیل نے تنگ نہیں کیا تھا مگر آج رات بے چینی
اپنے عروج پر تھی میں تھوڑی دیر خالی الذہن بستر پر لیٹی
رہی۔ پھر کچھ سوچ کر میں اٹھی اور وضو کر کے تہجد کی
نماز کے لیے جاء نماز پر کھڑی ہو گئی۔ اب میں نماز مکمل
یکسوئی اور خلوص کے ساتھ پڑھتی تھی۔ قرآن کا ایک
ایک لفظ پوری طرح سمجھ کر ادا کرتی تھی اب مجھے نماز
میں لطف آنے لگا تھا۔ مجھے نماز میں سکون ملتا تھا۔ میں
سورہ فاتحہ پڑھ رہی تھی۔ سورہ فاتحہ جس میں اللہ تعالیٰ
نے پہلے اپنی بڑائی بیان کی ہے کہ وہ رب ہے تمام
جہانوں کا وہ رحمٰن والرحیم ہے، وہ مالک ہے یوم
حساب کا اور پھر سورہ فاتحہ کے آخر میں انسان اپنے
لیے دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے سیدھے راستے چلانا۔
اس راستے پر جو تیری خوشنودی کا راستہ ہے۔

نماز ادا کر کے میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا
دیئے۔

"اے اللہ! اپنی اس ناچیز بندی کو معاف فرما۔
اے اللہ تُو دلوں کا بھید خوب جانتا ہے دل میں موجود
راز تیرے سامنے آشکار ہے۔ اے اللہ تو ہماری شہ
رگ سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ اے اللہ! تو ستر
ماؤں سے زیادہ اپنی مخلوق سے پیار کرنے والا ہے۔
اے اللہ اگر مجھ ناچیز بندی سے کبھی دانستگی یا نادانستگی
میں کوئی غلطی کوتاہی کوئی لغزش ہو گئی ہو تو معاف فرما۔
اے اللہ مجھے ہر قسم کی تکلیف سے نجات دے اور جو
میرے لیے بہتر ہو ویسا میرے لیے ماحول پیدا فرما
دے۔ اے اللہ! مجھ پر سچائی ظاہر کر دے۔ اے اللہ!
مجھ پر سچائی ظاہر کر دے۔ اے اللہ مجھ پر سچائی ظاہر
کر دے۔

میرا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آنسو میرے
چہرے سے ٹپک ٹپک کر جاء نماز پر گر رہے تھے اسی
وقت مجھے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔

"رات کے اس پہر کون ہے؟" میں نے سوچا
اور جاء نماز سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول
کر باہر جھانکا۔ ایک سایا جو مکمل طور پر سیاہ چادر میں
لپٹا ہوا تھا ہمارے گھر کے پیچھے کی طرف بڑھ رہا تھا۔
ہمارے گھر کے پیچھے ایک بڑا سا میدان تھا۔ مناسب
دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے وہاں جا بجا خودرو
جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ میں دبے قدموں جھاڑیوں
کی آڑ لیتے ہوئے اس سائے کا پیچھا کرنے لگی۔

'یہ شخص کون ہے اور ہمارے گھر میں کیا کر رہا تھا
اور اب کہاں جا رہا ہے۔' میرے ذہن میں مختلف
سوالات کلبلا رہے تھے۔ میں آیت الکرسی کا ورد

کرتے ہوئے اس سائے کا پیچھا کرتی رہی۔

کچھ دور ایک بوڑھے برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اسی وقت ایک اور سایا اس درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا میں نے خودرو جھاڑیوں کی آڑ میں خود کو اچھی طرح چھپالیا، چاند کی گیارہ یا بارہ تاریخ تھی اس لیے روشنی اتنی تھی کہ منظر واضح نظر آرہا تھا۔ برگد کے درخت کے پیچھے سے نکلنے والا سایا ایک بڑھیا کا تھا اور اس کے ہاتھ میں کپڑے کی بنی ایک گڑیا تھی، جس کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی تھی بلکہ وہ گڑیا جس کپڑے کی بنی ہوئی تھی وہ میرا پرانا قمیض تھا جسے میں نے ناقابلِ استعمال ہونے پر پھینک دیا تھا۔

میں نے اس بڑھیا کو بغور دیکھا تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اس بڑھیا کی شکل اس چڑیل سے کافی حد تک ملتی جلتی تھی جس نے میرے دن کا سکون اور رات کی نیند حرام کردی تھی۔ بڑھیا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کے سر پر چند پنیں لگائی اس دوران وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی، تھوڑی دیر میں بڑھیا نے وہ گڑیا اس دوسرے شخص کو دے دی اور اس شخص نے ایک ہاتھ میں گڑیا پکڑی اور دوسرا ہاتھ چادر میں ڈال کر جب باہر نکالا تو اس ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی دور سے مجھے اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ کتنی رقم تھی۔ بڑھیا رقم لے کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ شخص جو ہمارے گھر سے یہاں آیا تھا وہ گڑیا لے کر برگد کے درخت کے پاس بیٹھ گیا اور مسلسل کچھ پڑھتے ہوئے گڑیا کے سر میں سوئیاں لگاتا جارہا تھا۔ نہ جانے یہ کون ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھر رہا تھا۔

''عموماً ہمارے قریبی لوگ ہی ہم پر جادو یا سفلی کرواتے ہیں۔'' شاہ جی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ شخص جو بھی تھا پوری طرح چادر میں لپٹا ہوا تھا اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔

''اے اللہ! اے مالک کائنات! اے ہماری جانوں کے مالک تُو مجھے یہاں تک لایا ہے تو یہ بھید بھی کھول دے۔'' میں نے صدق دل سے دعا کی۔ آیت الکرسی کا ورد مسلسل منہ سے جاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس شخص نے گڑیا کو برگد کے درخت کی جڑ میں مٹی ہٹا کر دفنایا اور واپسی کے لیے مڑا تو اس شخص کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔

''یہ......'' مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ساری شیطانی کارستانی کے پیچھے یہ شخصیت ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آج مجھ پر سچ آشکار کردیا تھا۔

میں لرزتے وجود کے ساتھ کمرے میں واپس آئی۔ میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ 'یا اللہ! یہ کیسا بھیانک سچ ہے۔' آگہی کا عذاب مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ آج احساس ہوا کہ اچھا ہے اللہ نے ہر چیز پوشیدہ رکھی ہے۔ کل کیا ہوگا ہمیں نہیں معلوم اگر ہمیں کل کی آگہی ہوجائے تو شاید ہم آج ہی مرجائیں۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے آگہی کا ذرا سا دروازہ کھولا تو میں یہ برداشت نہ کر سکی۔ کیسا درد اٹھ رہا ہے سینے میں...... میں بے اختیار کتنی دیر بستر پر بیٹھی رہی اس کا مجھے اندازہ نہیں جب موذن نے فجر کی اذان دی تو میں چونکی۔

میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگئی۔ میرے سجدے کتنے لمبے ہوگئے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا میں جاء نماز پر بیٹھی خدا کی کبریائی بیان کرتی رہی۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔ اسی وقت امی جان کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے اس طرح جاء نماز پر روتا دیکھ کر گھبرا گئیں اور جلدی سے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا...... میرا بچہ۔''

''امی جان...... امی جان......!'' میں با آواز بلند رونے لگی۔ میرے رونے کی آواز سن کر تمام گھر والے دوڑے چلے آئے۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......؟'' سب کے منہ سے نکلا۔

''ابا جان...... امی جان...... اللہ تعالیٰ نے مجھ پر روزن کھول دیا۔'' میں امی جان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

''اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ دکھا دیا۔ دانیال

بھائی...... قمر ہمارے گھر کے پیچھے جو برگد کا پرانا درخت ہے اس کی جڑ میں ایک گڑیا دفن ہے اسے لے کر آؤ۔''

دانیال بھائی تو میری بات سن کر خاموش کھڑے رہے مگر قمر بجلی کی تیزی سے بھاگا جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی۔ گڑیا دیکھ کر سب کے چہروں پر خوف دوڑ گیا۔

''اس گڑیا کے ذریعے مجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ اس گڑیا کے پیٹ میں میرے کٹے ہوئے ناخن، بال اور میرے استعمال میں رہنے والی چیزیں بھری ہوئی ہیں۔ لاؤ مجھے دو، میں اسے جلا دوں گی۔''

میں نے قمر کے ہاتھ سے گڑیا لی۔ سورہ الفلق اور سورہ الناس کی تلاوت میرے منہ سے جاری تھی۔ میں نے گڑیا کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ چاچو نے آگے بڑھ کر لائٹر جلایا اور اس گڑیا کو آگ لگا دی۔ گڑیا کے جلنے سے ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ جیسے جیسے گڑیا جل رہی تھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قید سے آزاد ہو رہی ہوں۔ میرے منہ سے قرآن کی تلاوت جاری تھی۔

''یہ تھی وہ گڑیا جس کے ذریعے مجھ پر جادو کیا گیا تھا۔'' میں نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''شاہ جی صحیح کہتے تھے کہ ہمارے قریبی لوگ ہی ہم پر جادو کرواتے ہیں۔''

''کس نے کی یہ حرکت کیا تم اسے جانتی ہو۔'' ابا جان دہاڑے۔

''کاش...... کاش میں یہ نہ جانتی......'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' چاچو اور ابا جان ایک ساتھ بولے۔

''آپ خود بتانا پسند کریں گی یا میں سب کو بتاؤں...... آخر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ میں رات میں آپ کو اس بڑھیا جادوگرنی کے ساتھ دیکھ چکی ہوں لہٰذا آپ ہی سب کو سچ سچ بتا دیں چچی جان!'' میں نے سلمٰی چچی کو مخاطب کیا۔

''سلمٰی تم......!'' امی جان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''امی جان...... آپ......'' قمر اور مہک ہکا بکا رہ گئے۔

''سلمٰی تم...... تم نے یہ کیوں کیا......'' چاچو چیخے۔

''نفرت ہے مجھے اس سے جسے دیکھو کنول کنول کرتا ہے۔ میرے بچوں کی طرف تو کسی کا دھیان جاتا ہی نہیں۔ سب ڈاکٹرنی صاحبہ ڈاکٹرنی صاحبہ کہتے ہوئے کنول کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ بس اسی جلن اور حسد میں، میں نے یہ سب کیا۔'' سلمٰی چچی نے پہلے نفرت سے پھر بے چارگی سے کہا۔

''امی...... آپ...... آپ کو ذرا احساس ہے کہ اس کی وجہ سے ہم لوگ کتنا پریشان تھے۔ آپ...... آپ کو ذرا رحم نہیں آیا کنول پر۔'' قمر بولا۔

''میں...... میں حسد میں اندھی ہو گئی تھی۔ میں نے تم دونوں کی محبت میں یہ سب کیا۔''

''محبت...... آپ کو محبت کا پتا بھی ہے۔ آئی ہیٹ یو امی...... آئی ہیٹ یو۔'' قمر چیخا۔

''نہیں۔''

''مجھے نفرت ہو رہی ہے اپنے آپ سے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔'' مہک بھی بول اٹھی اور روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی قمر بھی چلا گیا۔ ان دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''کنول...... کنول مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے بچوں کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔'' سلمٰی چچی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی تم محبت میں نہیں حسد میں اندھی ہو گئی تھیں۔ محبت کبھی برے کام نہیں کرواتی۔ حسد آدمی سے ایسے گھناؤنے کام کرواتا ہے۔ تم اپنا سامان باندھو اور فوراً اس گھر سے چلتی نظر آؤ۔ ورنہ میرا ہاتھ بھی اٹھ سکتا ہے۔'' چاچو طیش میں بولے تو سلمٰی چچی روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

☆......☆

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے قرآن مجید

کھولا اور سورۃ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگی۔ اس واقعے کو پندرہ دن گزر چکے تھے۔ سلمٰی چچی اسی دن اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ میرا میڈیکل کا انٹری ٹیسٹ اچھا ہوا تھا اس واقعے کے بعد میری طبیعت کبھی خراب نہیں ہوئی۔ میں جو کبھی کبھی نماز پڑھتی تھی میں نے باقاعدہ نماز پڑھنے کو اپنی عادت بنالیا اور ہر روز فجر کے بعد سورج نکلنے تک قرآن کی تلاوت کرنا میرا معمول بن گیا۔ قمر اور مہک نے اس واقعے کے بعد کئی دفعہ مجھ سے معافی مانگی، میں نے انہیں بتا دیا کہ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ میں نے انسانوں سے توقع رکھنی ہی چھوڑ دی ہے۔ جب میرا اللہ میرے ساتھ ہے تو ساری دنیا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

میں قرآن کی تلاوت کر رہی تھی کہ چاچو کی خوشی سے لبریز چیخ سنائی دی۔ میں نے قرآن مجید بند کیا اور اسے اٹھا کر اونچی جگہ پر رکھا اور کمرے سے باہر نکلی۔

''آیئے...... آیئے ڈاکٹرنی صاحبہ! آپ کا انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ آیا ہے۔'' چاچو ہاتھ میں اخبار لیے مجھے کمرے سے نکلتا دیکھ کر بولے۔

''کیا ہوا۔ کیا رزلٹ ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''کیا ہوگا، اب ہماری آپی ڈاکٹر کہلائیں گی۔ ڈاکٹر کنول منظور احمد۔'' مہک نے مجھے گلے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''سچ۔'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''بالکل سچ! یہ رہا اخبار۔'' چاچو نے اخبار میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ میں نے جلدی سے اخبار میں اپنا رول نمبر ڈھونڈا۔ سب سے اوپر میرا نام اور رول نمبر تھا۔

''اس خوشی میں گھر میں پارٹی ہونی چاہیے۔'' چاچو بولے۔

''نہیں چاچو پارٹی وارٹی نہیں۔'' میں نے فوراً انکار کیا۔

''اچھا پارٹی نہیں مگر آج رات کا کھانا میری طرف سے پیزاہٹ میں ہوگا۔'' چاچو پھر بولے۔

''ہرے......'' قمر، مہک اور دانیال بھائی نے نعرہ لگایا۔

''چاچو......! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرا داخلہ میڈیکل کالج میں ہوگیا تو آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے۔'' میں نے چاچو سے کہا۔

''ہاں ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ کہو تمہیں کیا چاہیے کپڑے، گاڑی یا کچھ اور......'' چاچو نے جواب دیا۔

''مجھے سلمٰی چاچی چاہئیں۔'' میرے جواب کے ساتھ ہی گھر میں سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے سب لوگ خوش ہو رہے تھے۔ اب سب کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ چاچو نے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورا۔

''چاچو...... سلمٰی چچی دل کی بہت اچھی ہیں، بس تھوڑی کمزور ثابت ہوئیں اس لیے شیطان نے ان پر غلبہ پالیا۔ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بدلہ لینے سے معاف کرنے والا بہتر ہے۔ میں نے اللہ کے لیے انہیں معاف کر دیا، آپ لوگ بھی انہیں معاف کر دیں اور عزت کے ساتھ گھر لے آئیں۔ پلیز چاچو۔'' میں نے چاچو کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے سوچیں گے۔'' چاچو نے دامن چھڑانا چاہا۔

''نہیں چاچو...... وعدہ کریں۔'' میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اچھا وعدہ۔'' چاچو بولے تو میں نے گھوم کر قمر اور مہک کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ خوشی کے آنسو تھے۔

☆......☆

رات کو ہم سب ابا جان کی گاڑی میں سوار پیزاہٹ کی جانب اڑے جا رہے تھے مگر چاچو ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ میرے پوچھنے پر ابا جان نے بتایا کہ وہ پیزاہٹ ہی میں ملیں گے۔ پیزاہٹ میں ہماری میز ریزرو تھی۔ ہم سب میز کے گرد پھیلی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''چاچو کہاں ہیں ابا جان؟'' میں نے ابا جان

سے پھر پوچھا۔

''آتا ہوگا۔ تمہارا چاچو۔'' ابا جان نے جواب دیا۔

''آپ کب سے یہی بات کہہ رہے ہیں۔ آخر چاچو کہاں گئے ہیں۔'' میں نے پھر پوچھا۔

''لو وہ آگئے تمہارے چاچو۔'' ابا جان نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو میں نے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں چاچو کے ساتھ سلمٰی چچی بھی تھیں۔ وہ لوگ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ سلمٰی چچی کو دیکھ کر میں بے اختیار کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلمٰی چچی میز کے پاس پہنچ کر رکیں اور پھر میری کرسی کی طرف آئیں اور بولیں۔

''کنول بیٹا! مجھے معاف کردو۔ میں بہت بری ہوں۔'' سلمٰی چچی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے جلدی سے ان کے ہاتھ پکڑے اور ان کو گلے سے لگالیا۔

''چاچی آپ بری نہیں ہیں، برا تو شیطان ہے جس نے آپ پر غلبہ پالیا تھا مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے آپ کو اس کے چنگل سے رہائی دلائی۔ اللہ آپ کی اور ہم سب کی حفاظت کرے۔'' میں نے سلمٰی چچی کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو چچی نے مجھے زور سے اپنے ساتھ لپٹالیا۔

''ارے بھئی یہ چاچی بھتیجی کا ملاپ ختم ہوگیا ہو تو کچھ کھانے وغیرہ کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے۔'' چاچو نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سچ مچ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔''

''ہاں کنول باجی۔ پیزاہٹ کی خوشی میں تو میں نے دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔'' مہک بھی بول اٹھی۔ سلمٰی چچی نے مجھ سے الگ ہونے کے بعد اپنے دونوں بچوں قمر اور مہک کو پیار کیا۔ میں نے سلمٰی چچی کو اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

''ابا جان...... چاچو نے تو میری خواہش پوری کردی۔ آپ بھی تو میری ایک خواہش پوری کریں۔'' میں نے پیزا کھاتے ہوئے ابا جان کو مخاطب کیا۔

''اور کیا چاہیے تمہیں۔ تمہاری چاچی گھر واپس آتو گئی۔'' ابا جان بولے۔

''چاچو نے میری خواہش پوری کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے مگر آپ کو بھی تو میری کم از کم ایک خواہش پوری کرنا چاہیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب گھر والے میری جانب متوجہ ہوگئے۔

''شکر ہے ہماری بیٹی مسکرائی تو۔ اچھا بتاؤ تمہیں اور کیا چاہیے؟'' ابا جان بولے۔

''ابا...... جا...... جان...... وہ میں چاہتی ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ عمرہ کرنے چلیں، ایک ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کریں، ایک ساتھ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکرادا کریں کہ اس نے ہمارے گھر کو دوبارہ سے خوشیوں کا گہوارہ بنایا۔'' میں نے تفصیلاً جواب دیا۔

''سبحان اللہ۔'' بے ساختہ سلمٰی چاچی کے منہ سے نکلا۔

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ۔'' ایک ایک کر کے سب کے منہ سے تعریفی کلمات نکلے۔

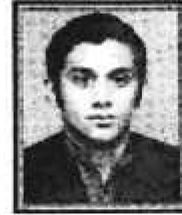
''ابا جان! پھر ہم سب چلیں گے نا؟'' میں نے ابا جان سے تصدیق چاہی۔

''انشاء اللہ ضرور۔ تمہاری کلاسز شروع ہونے سے پہلے ہم سب خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیں گے۔'' ابا جان نے آمادگی ظاہر کی۔

''تھینک یو...... ابا جان......'' میں نے ابا جان کا شکریہ ادا کیا اور پیزا کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔ میری آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے مگر یہ تشکر کے آنسو تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میری مشکل آسان کی اور ہمارے ''جائے سکون'' کو دوبارہ خوشیوں کا گہوارہ بنایا۔ میں جتنا اللہ تعالیٰ کا شکرادا کروں کم ہے۔ اس نے اپنے خزانے سے مجھے کتنی ہی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور پیزا کھانے لگی۔

☆☆☆

ماں ری...



جواد احمد



اُس عورت کی آبلہ پائی، جو ماں بن کے بھی ماں نہ بن پائی

سائرہ حسب معمول دفتر آ کر اُداس اور پریشان سی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ آج پھر کسی بات پر عمر سے تلخی ہو گئی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کی تکرار سُن کر اُن کی معصوم بیٹی فاطمہ رونے لگی۔ اب سائرہ کو رہ رہ کر اپنی بیٹی کے آنسو یاد آ رہے تھے۔ وہ کبھی خود کو کوستی کبھی عمر کی چڑچڑی عادت کو قصوروار ٹھہرا کر خود کو مطمئن ہونے کی کوشش کرتی لیکن اسے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ فاطمہ کی سسکیاں اور اس کے بہتے آنسو اس کا ہر احساس زخمی کر رہے تھے اور ذہن کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب وہ بیٹی سے مل کر اپنی غلطی کی معافی مانگے گی۔ اچانک گھنٹی بجی سائرہ کے آفیسر رضوان صاحب کا فون تھا۔ انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ سائرہ نے اپنی حالت درست کی اور فائل اُٹھا کر اُن کے کمرے میں چلی گئی۔

چند لمحے دفتری معاملات پر بات ہوتی رہی۔ خلاف معمول اس روز سائرہ کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی کیونکہ اس کا ذہن جو بھٹکا ہوا تھا۔ رضوان صاحب نے اس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''سائرہ! کیا بات ہے آج تم پریشان سی لگ رہی ہو۔''

سائرہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے چلچلاتی دھوپ میں اسے سایہ فراہم کر دیا ہو۔ پریشان اور تنہا انسان کے لیے ہمدردی کے دو بول بھی صحرا میں بارش کے مانند ہوتے ہیں۔ سائرہ گزشتہ کئی مہینوں سے احساس تنہائی کا شکار تھی۔ میاں بیوی کی کشیدگی نے دونوں کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ یہ شادی دراصل ایک سمجھوتہ تھی جو ایک ہی سال بعد محض کاغذی کارروائی بن کر رہ گئی۔ سائرہ عمر سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھی لیکن ماں کی شدید بیماری کے باعث خاندان والوں کے دباؤ میں آ کر اسے اپنے پھوپی زاد عمر سے شادی کرنی پڑی۔ اس کے والد بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے لہٰذا اس کی ماں نے اسے پالا پوسا۔ اس نے بھی اپنی ماں کی خاطر اپنے تمام خواب قربان کر دیے۔ وہ پرتعیش زندگی کے خواب دیکھتی اور متوسط طبقے کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے نکلنے کی خاطر زندگی میں کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اسی غرض سے اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایک نجی ادارے میں ملازمت کرنے لگی۔ محنت اور لگن سے کام کرتی رہی اور ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ دفتر کی انتظامیہ اور سب ہی لوگ اس سے بہت خوش تھے۔ مگر وہ مزید آگے جانے کی خواہاں تھی۔ جب بھی ماں شادی پر اصرار کرتی وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ ابھی اسے اپنا مستقبل بنانا ہے۔

پھر اچانک ایک روز خبر ملی کہ اس کی ماں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اب اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کو ہر خوشی اور ہر اطمینان دے۔ والد کے انتقال کے بعد ماں ہی اس کا واحد سہارا تھی۔ اس نے اسے ماں کا پیار بھی دیا اور باپ کی شفقت بھی! اب سائرہ یہی چاہتی تھی کہ اپنی ماں کی ہر امنگ کو اسی طرح پورا کرے۔ جس طرح اس نے بچپن سے جوانی تک اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کو خود تکلیف اُٹھا کر پورا کیا تھا۔ سائرہ کے ارادے قربانی دینے کے جذبے تک پہنچے ہی تھے کہ ماں کے لبوں تک اپنی انمٹ خواہش آ گئی۔

"سائرہ بیٹی! میں چاہتی ہوں کہ تم عمر کے ساتھ شادی کے لیے ہاں کہہ دو۔ اس ذمہ داری سے فارغ ہو کر میں مطمئن ہو جاؤں گی۔ میری زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں اور میں اپنے رب کے حضور سرخرو ہو کر جانا چاہتی ہوں۔"

"مگر امی......"

"اگر مگر کچھ نہیں تمہاری پھوپو کا اصرار بڑھ گیا ہے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے مہینے شادی کر دوں۔"

"اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں تب شادی کرلوں گی۔"

"سائرہ بیٹی! شادی کے بعد اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی رہنا، مجھ سے اب مزید تمہاری ذمہ داری نہیں نبھائی جاتی۔ عمر روشن خیال لڑکا ہے، تمہیں ہر طرح کی آزادی دے گا۔ میں نے اس سے بات

کر لی ہے کہ وہ تمہیں گھر میں نہ قید کرے۔"

سائرہ نے ہزار عذر پیش کیے مگر ماں نے ایک نہ سنی اور یوں اس کی شادی ہوگئی۔ عمر کی شکل و صورت تو عام سی تھی لیکن اس نے سائرہ کو اتنی محبت دی کہ سائرہ کو بھی اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ترغیب ملی۔ سائرہ کے لیے یہ بات بڑی اہم تھی کہ عمر نے اسے ملازمت کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ہر طرح سے معاونت بھی کی۔ ایک سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک چاند سی بیٹی دی جس کا نام انہوں نے فاطمہ رکھا۔ عمر کا خیال تھا کہ فاطمہ کی پیدائش کے بعد سائرہ کی پہلی ترجیح فاطمہ ہوگی لیکن وہ تو پرتعیش زندگی گزارنے کے خیال سے جنون کی حد تک وابستہ تھی اور زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا اس کا مطمع نظر تھا۔

اسے فاطمہ سے بے حد محبت تھی لیکن وہ اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فاطمہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس کی ترقی ہوگئی اور اس کی مصروفیات مزید بڑھ گئیں۔ اب وہ عمر اور فاطمہ کو بہت کم وقت دیتی۔ اس سے عمر کوفت میں مبتلا ہوگیا۔ رات گئے تک سائرہ کا باہر رہنا اور مردوں کے ساتھ دوسرے شہروں کا سفر کرنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا مگر اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سائرہ کو گھر کس طرح لائے؟ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ سائرہ کی والدہ برطانیہ سے واپس آگئیں جو اپنے علاج کی خاطر کئی مہینے سے وہاں مقیم تھیں۔ عمر نے مسئلے کا ہر پہلو تفصیل سے انہیں بتایا تاکہ وہ سائرہ کو سمجھا سکیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنی بیٹی کو لے کر بیٹھ گئیں۔

"سائرہ! فاطمہ کو تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ تم اپنی باہر کی مصروفیات کم کرو اور گھر اور بچی کو زیادہ ٹائم دو۔"

سائرہ نے حیرت سے کہا۔ "امی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ دنیا میں فاطمہ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے مگر اس کی دیکھ بھال کے لیے ملازمہ موجود ہے اور پھر میں تمام تر محنت اس کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے ہی کر رہی ہوں۔"

"بیٹی! بچوں کی بہترین پرورش ماں ہی کرسکتی ہے مگر تم ملازموں کے ذمے ہر کام چھوڑ کر خود ملازمت کے پیچھے پڑی ہو۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے؟ عمر اتنا تو کما ہی لیتا ہے کہ تم دونوں کی گزر بسر آسانی سے ہو سکے۔" اس بات میں بڑا وزن تھا مگر سائرہ ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔

"امی! مجھے اچھی طرح وہ وقت یاد ہے جب میری فیس کا انتظام کرنے کے لیے آپ کو ہمیشہ کسی نہ کسی سے قرض لینا پڑا۔ میرے کپڑے ہمیشہ سب سے پرانے ہوتے۔ ہمیں اکثر فاقے بھی کاٹنے پڑے۔ میں فاطمہ کو ان محرومیوں سے دور رکھنا اور اسے زندگی کی ہر سہولت دینا چاہتی ہوں۔"

"سائرہ! تم بھول رہی ہو کہ معصوم بچی کی سب سے بڑی ضرورت ممتا ہے جس سے وہ محروم ہے۔ فیس اور کپڑوں وغیرہ کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ زندگی پر آسائش طریقے سے بسر ہونی چاہیے۔ بڑی ہو کر فاطمہ بھی میرے اس خیال سے اتفاق کرے گی اور اسے پتا چلے گا کہ اس کے تابناک مستقبل کی خاطر میں نے دن رات محنت کی۔"

سائرہ کسی طرح اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔ اس کی ماں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں۔ عمر نے بھی اپنی ہر کوشش کر دیکھی لیکن سائرہ کو نوکری چھوڑنے پر آمادہ نہ کرسکا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پیشے میں کامیابیاں حاصل کرتی چلی گئی لیکن اس کی گھر کی بنیاد کمزور پڑتی گئیں۔ عمر اس سے کھنچا کھنچا سا رہتا وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ لیکن ندامت کے زیر اثر جلی بھنی رہتی۔ ایسے تناؤ والے ماحول میں دو سال گزر گئے۔ دونوں میاں بیوی تھے لیکن دونوں کے مابین وہ چاہت بھرا تعلق عنقا تھا جو پیار کرنے والے جوڑے کی خاصیت ہے ایک دن اچانک سائرہ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ چند روز اسے اپنی ماں کی بات نہ ماننے کا ملال ہوا لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن

ہوگئی کہ اس نے اپنی ماں کا حکم مان کر شادی جیسے
بندھن کو قبول کیا تھا۔ اس کے نزدیک یہی بہت
بڑی قربانی تھی۔
رفتہ رفتہ معمولی سی بات پر دونوں کے طویل
جھگڑے ہونے لگے۔ ان کی روز روز کی نوک
جھونک سے فاطمہ کا معصوم ذہن متاثر ہوگیا۔ ایک
روز اس کی ٹیچر نے سائرہ اور عمر کو بلا کر فاطمہ کی
کاپی دکھائی جس میں اس نے جلتی آگ، ٹوٹے
برتن اور مردہ پرندوں کی تصویر بنا رکھیں تھیں۔
فاطمہ کی ٹیچر نے بتایا کہ فاطمہ ہر وقت کھوئی کھوئی اور
الگ تھلگ رہ کر اس قسم کی خوفناک تصاویر بناتی
رہتی ہے۔ ماہر نفسیات سے مشورہ کرنے پر پتا چلا
کہ فاطمہ کے غیر فطری رویے کی وجہ اس کے
والدین کی ناچاقی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے
وحشت ناک ماحول کو محسوس کر کے اپنا خوف کاغذ پر
منتقل کرتی ہے۔ اس واقعے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے
تھا کہ سائرہ اور عمر اپنی چہیتی لاڈلی کی خاطر گھر میں
خوشگوار فضا قائم کرتے لیکن دونوں کے رویوں میں
لچک نہ ہونے کے باعث حالات مزید ابتر ہوتے
چلے گئے۔
ایک دفعہ سائرہ کو دفتر کے کسی کام کے سلسلے
میں ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر جانا تھا۔ اس
دورے کے بعد سائرہ کی ترقی متوقع تھی۔ عمر نے
اسے کہا کہ وہ نہ جائے کیونکہ فاطمہ کے امتحان
قریب ہیں۔'' وہ کہنے لگی۔
'' فاطمہ کا معمولی سا امتحان ہے۔ اس کی ٹیچر
نے مکمل تیاری کروادی ہے اور آپا بھی پڑھی لکھی
ہے اسے پڑھنے میں مدد کرتی رہے گی لیکن اس
دورے پر میرے سنہرے مستقبل کا انحصار ہے۔''
'' میں کچھ نہیں جانتا، اس دفعہ اگر تم گئیں تو
میرے گھر کے دروازے تم پر بند ہوجائیں گے۔''
عمر نے غصے سے کہا اور دفتر روانہ ہوگیا۔
سائرہ پریشان ہوگئی۔ وہ ہر صورت جانا چاہتی
تھی لیکن ساتھ ساتھ اسے عمر کی دھمکی نے بھی
ڈرا دیا۔ اسی شش و پنج میں اس نے اپنے باس کو
فون کیا اور ساری صورت حال بتا کر جانے سے
معذرت کردی مگر رضوان صاحب نے خشک لکڑی کو
جلتی تیلی دکھاتے ہوئے کہا۔
'' سائرہ! تم بھی کمال کرتی ہو۔ ایسے موقع بار
بار نہیں آتے۔ رہی تمہارے شوہر کی دھمکی کی بات
تو وہ ایسی دھمکیاں پہلے بھی کئی بار دے چکے ہیں۔''
'' مگر انہوں نے واقعی مجھ پر اپنے گھر کے
دروازے بند کر دیے تو کیا ہوگا؟''
'' سائرہ! گھر تمہارا ہے۔ شاید تم بھول گئی ہو
اس کا کرایہ تمہارے دفتر والے دیتے ہیں اور گھر
میں اکثر اشیاء بھی تمہاری آمدنی سے خریدی گئی
ہیں۔ عمر تمہیں کس طرح نکال سکتا ہے؟''
یوں رضوان کی شہ سے سائرہ کے ذہن میں
بغاوت نے جنم لیا۔ وہ پُرآسائش زندگی کے سپنے
میں کھو کر جلدی سے بولی۔
'' آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میرا انتظار
کریں۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچتی ہوں۔''

☆......☆......☆

ایک ہفتے کے بعد جب سائرہ واپس آئی تو گھر
کے دروازے پر تالا لگا تھا، وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔
اس کے ذہن میں عمر کا یہ جملہ گونجنے لگا۔
'' اس دفعہ اگر تم گئیں تو میرے گھر کے
دروازے تم پر بند ہوجائیں گے۔'' اس نے متبادل
چابی نکال کر تالا کھولا اور اندر چلی گئی۔ سامنے میز
پر کاغذ کا ایک ٹکڑا دیکھ کر وہ رُک گئی، یہ خط عمر کا تھا۔
سائرہ!
میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے ساتھ چل
سکوں لیکن تم جس تیز رفتاری سے مخالف سمت سفر
کررہی ہو اس سے ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے
جارہے ہیں اور اب ہمارے درمیان ہماری معصوم
بیٹی بھی کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اسے ہم دونوں کا
مشترکہ پیار تو کیا ملتا، ہمارے اختلافات اور لڑائی
جھگڑے اس کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ میرا خیال
ہے کہ ہم دونوں اکٹھے رہ کر اس کے ذہن پر منفی
اثرات ڈالیں گے جبکہ ہماری علیحدگی سے وہ صرف

کسی ایک کی محبت سے محروم رہے گی۔ میں فاطمہ کو اپنے ساتھ امی کے گھر لے جا رہا ہوں۔ اگر تمہیں مصروفیات میں سے وقت ملے تو اپنی بیٹی سے ملنے آ سکتی ہو۔

والسلام

عمر

خط پڑھ کر سائرہ شاکڈ رہ گئی۔ جسم جیسے بے جان سا ہو گیا، بے اختیار اس کے آنسو نکل آئے مگر وہاں کوئی نہیں تھا جو تنہائی کے گھپ اندھیرے میں اسے راستہ دکھاتا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر اکیلی بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ بعض حادثے وقت گزرنے کے احساس تک سے بے خبر کر دیتے ہیں۔ وہ رات گئے تک ایک ہی زاویے میں ایک ہی کرسی پر بیٹھی رہی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور دھیمے لہجے سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، رضوان بول رہا ہوں۔"

"جی سر! آپ۔" سائرہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی جیسے رضوان اس کے سامنے کھڑا ہو۔

"کیسی ہیں آپ۔"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"دراصل مجھے پوچھنا تھا کہ فائل نمبر دو سو چودہ آپ کے پاس ہے۔"

"جی! میرے پاس ہے، آپ نے خود ہی تو گاڑی میں فائل میرے حوالے کی تھی۔"

"مجھے یاد تو تھا پھر بھی سوچا تسلی کر لوں۔"

"جی اچھا۔" سائرہ نے مختصر جواب دیا۔

"سائرہ! خیریت ہے نا؟ تم پریشان لگ رہی ہو، تمہاری آواز میں پہلے جیسی کھنک نہیں۔"

"نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" سائرہ نے پُر تکلف جملہ بولا۔

"سائرہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو، بھئی میں تمہارا باس ہی نہیں، ہم دونوں اچھے دوست بھی ہیں۔ اگر تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

"مگر جناب......"

"اگر مگر نہ کرو میں بیس منٹ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ ہم کسی ہوٹل میں کھانا بھی کھائیں گے اور تمہارے ساتھ بات بھی ہو جائے گی۔" رضوان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

سائرہ اور رضوان عالی شان ہوٹل کے میز پر بیٹھے تھے۔ سائرہ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ رضوان نے اپنے جیب سے رومال نکال کر اسے دیا۔ پہلے سائرہ کو تھوڑی جھجک محسوس ہوئی لیکن رضوان نے اصرار کیا تو اس نے رومال لے لیا۔ عین اسی لمحے عمر اور فاطمہ بھی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ عمر نے دونوں کو ایک ساتھ ہوٹل میں دیکھا تو سخت طیش میں آ گیا۔ اسی لمحے اس کے دل سے وہ نرم گوشے ختم ہو گئے جو دونوں کو پھر ایک کر سکتے تھے۔ اس نے قہر آلود نظر سائرہ پر ڈالی اور فاطمہ کو بازو سے پکڑ کر واپس لے گیا۔

"فاطمہ...... فاطمہ...... عمر...... عمر...... خدارا میری بات سنو۔" سائرہ پکارتی رہ گئی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ عمر فاطمہ کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

"ابو! آپ مجھے واپس کیوں لے آئے؟ میں تو امی سے ملنا چاہتی تھی۔" فاطمہ نے عمر سے سوال کیا۔

"بیٹی! اب ہم کبھی آپ کی امی سے نہیں ملیں گے کیونکہ وہ بھی ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔" عمر نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

"ابو! اب وہ کہاں رہیں گی؟" فاطمہ نے توتلی زبان میں سوال کیا۔

"بیٹی وہ جو صاحب ہوٹل میں ان کے ساتھ بیٹھے نا! ان کے ساتھ۔" عمر نے جذبات میں آ کر بے اختیار کہہ دیا۔

اب سائرہ گھر میں تنہا رہنے لگی۔ ہوٹل والے واقعے کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بیٹی کا سامنا کرتی لہٰذا اس سے کٹ کر رہ گئی۔ جب

تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تو وہ رضوان کو فون کر دیتی۔ رضوان نے اسے ایسے کڑے وقت میں سہارا دیا جب وہ اپنے شوہر اور بیٹی کی نفرتوں کا شکار ہو کر تنہائی اور پریشانی کی دلدل میں دھنسی جا رہی تھی۔ رضوان نے ایک بار پھر اسے آنے والی کامیابیوں کی چمک دمک دکھا کر دفتری معاملات میں مصروف کر لیا۔ سائرہ کو رضوان مسیحا نظر آنے لگا اور اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی۔ جب کبھی اسے اپنے شوہر کی بے رخی اور بیٹی کی ناراضی کا خیال آتا تو وہ رضوان کے پاس پہنچ جاتی اور وہ اسے گھمانے پھرانے لے جاتا۔ وہ بھی ان وقتی سہاروں سے بہلتی رہی۔ رضوان اس پر احسانات کی بارش کر رہا تھا۔ اور وہ اس میں بھیگتی چلی گئی آخر ایک روز رضوان نے اس سے اپنی محبت کا خراج مانگ ہی لیا۔

''سائرہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

سائرہ اپنے باس کا یہ جملہ سن کر جیسے گھبرا سی گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رضوان اُسے یوں اچانک پرپوز کر دیں گے۔

رضوان نے اس کی پریشانی محسوس کر کے کہا۔

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک بار میری محبت کا بھرم رکھ لو میں تمہارے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔''

''مگر آپ کی بیوی......؟'' سائرہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

''میں نے اس سے اجازت لے لی ہے۔ اسے اولاد کی شدید خواہش ہے اور ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی اس لیے ہماری شادی پر آمادہ ہو گئی ہے۔''

''لیکن اس طرح میری فاطمہ مجھ سے اور بھی دور ہو جائے گی۔'' سائرہ نے بے بسی سے کہا اور زار و قطار رونے لگی۔

رضوان نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ''تم کسی بھی وقت اپنی بیٹی مل سکتی ہو۔ وہ بڑی ہو کر آسانی سے سمجھ جائے گی کہ کن نازک حالات نے تمہیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔'' اور رضوان آہستہ آہستہ اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

☆......☆......☆

رضوان کی بیوی کومل نے سائرہ کا محبت سے استقبال کیا اور اسے اپنے گھر میں بڑی عزت کے ساتھ رکھا۔ کومل چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اولاد کی نعمت سے محروم نہ رہے لہٰذا اس نے اپنی سوتن کے ساتھ بھی سمجھوتا کر لیا۔ کومل کو حقیقی معنوں میں اپنے گھر سے محبت تھی۔ شوہر کی خوشی کی خاطر وہ سائرہ سے بھی خوشدلی سے ملتی۔

سائرہ کم سن اور خوب صورت تھی اس لیے رضوان بھی اس کا دیوانہ تھا۔ پہلے پہل تو دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار رہے تھے لیکن جوں جوں وقت گزرا رضوان کی خواہش تقاضہ بننے لگی۔ شادی کو تین برس ہو گئے سائرہ رضوان اور کومل کی خواہش پوری نہ کر پائی۔ اِن بگڑتے حالات میں سائرہ کو غیر اہم ہونے کا احساس ہونے لگا۔ وہ رو رو کر رب سے دعا مانگتی۔

خلافِ معمول ایک روز رضوان گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ سائرہ کے پوچھنے پر رضوان نے بتایا۔

''سائرہ! تم اندازہ نہیں کر سکتی کہ آج میں کس قدر خوش ہوں۔ میری زندگی میں صرف ایک ہی کمی تھی جسے میرے رب نے پورا کر دیا۔''

سائرہ کا دھیان فوراً اپنے طبی معائنے کی طرف چلا گیا۔ چند روز قبل اس نے اپنا معائنہ کرایا تھا اور ڈاکٹر نے ان دونوں کو بہت تسلی دی تھی۔

''رضوان! کیا رپورٹ آ گئی ہے؟'' سائرہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں آ گئی ہے۔'' رضوان بچوں کی طرح کھلکھلاتے ہوئے بولا۔

''میں باپ بننے والا ہوں۔ میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔'' سائرہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''رضوان مجھے بتاؤ! ڈاکٹر نے کیا کہا؟'' اسی

وقت کومل بھی کمرے میں داخل ہوگئی رضوان ایک
دم اپنی نشست سے اٹھا اور کومل کے قریب جا کر
بولا۔
''کومل تمہارا بہت بہت شکریہ! تم نے میری
زندگی کا سب سے بڑا خلا پر کر دیا۔ ڈاکٹر نے بتایا
کہ تم ماں بننے والی ہو۔'' اسی کو معجزہ کہتے ہیں
کومل......'' یہ سن کر سائرہ کے پیروں تلے زمین نکل
گئی اور اس کا سر چکرانے لگا۔ شادی کے بیس برس
بعد اللہ تعالیٰ نے کومل پر اپنا کرم کیا تھا۔ رپورٹ تو
مثبت آئی تھی لیکن سائرہ کی نہیں کومل کی!

رضوان اور کومل کے لیے یہ بے حد خوشی کا لمحہ تھا
اب رضوان کی تمام تر توجہ کومل کی جانب مرکوز ہوگئی۔
وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے گن گانے لگا۔ وہ اکثر دفتر سے
چھٹی کرتا اور سائرہ اسی کی جگہ فرائض نبھاتی۔ ایک دو
دفعہ سائرہ نے شکوہ کیا تو اس نے کہا۔

''کومل نے تین سال تمہاری خدمت کی ہے
اب وہ ماں بننے والی ہے تو تمہیں اس کی خدمت
کرنی چاہیے۔''

کومل ایک بیٹے کی ماں بن گئی، یوں اس کی
ذات ایسے ڈھنگ سے مکمل ہوئی کہ مسکراہٹ تک
میں جاذبیت آگئی۔ رضوان اس کا ممنون احسان
مند تھا۔ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کے
قریب آگئے تھے۔ بیٹے کی پیدائش نے ان کے
ازدواجی تعلق کو بہت مضبوط کر دیا تھا۔ رضوان کو
کومل کی قربانی اور صبر وتحمل کا بھی قائل ہونا پڑا۔
اسے اپنی بیوی اتنی اچھی لگنے لگی کہ وہ دنیا کی تمام
چیزوں سے بے خبر ہوگیا۔ ایسی صورت حال میں
سائرہ بھی نظر انداز ہونے لگی۔ وہ سر توڑ کوشش کے
باوجود رضوان کو اپنے وجود کا احساس دلانے میں
قاصر رہی۔ شوہر کی لاپروائی اسے بار بار گھسیٹ کر
ماضی میں لے جاتی جب اسے اپنے بارے میں عمر کا
فکر مند ہونا تک ناگوار گزرتا تھا۔ کومل اپنے بچے کو
پیار کرتی تو اسے وہ وقت یاد آتا جب وہ فاطمہ کی
رونے کی آواز سنتے ہی اس کی طرف لپکنے کے
بجائے آیا کو پکارنے لگتی تھی۔ کومل کئی ملازم ہونے
کے باوجود اپنے بیٹے کی خود دیکھ بھال کرتی اور
رضوان یہ دیکھ کر بہت خوش تھا۔

ان حالات نے سائرہ میں بیک وقت احساس
جرم، احساس ندامت اور احساس کمتری کو جنم دیا۔
وہ غم غلط کرنے کے لیے دفتری معاملات میں زیادہ
دلچسپی لینے لگی مگر فطری تقاضوں کو مصنوعی حیلوں سے
نہیں بہلایا جاسکتا۔ وقت تو جیسے تیسرے گزرتا گیا
مگر سائرہ ذہنی انتشار کے باعث شدید ذہنی دباؤ کا
شکار ہوگئی اور اسے افسردگی کے دورے پڑنے
لگے۔ آخر رضوان نے اسے ذہنی امراض کے
اسپتال میں داخل کروا دیا۔

شروع میں تو رضوان نے اس کا خیال رکھا پھر
وہ اپنے کاموں اور بیوی بچے میں مگن ہوگیا۔ یوں
سائرہ وارڈ میں بے یارومددگار پڑی رہتی۔
رضوان کبھی کبھار اس سے ملنے آجاتا اور ضرورت
کی چیز دے کر چلا جاتا۔ کومل کا بیٹا اب اسکول جاتا
تھا۔ لہٰذا اس کی بھی مصروفیات بڑھ گئیں وہ بھی بھی
کبھار اس سے ملنے آتی۔ سائرہ گھر میں بھی رہ سکتی
تھی لیکن رضوان کا خیال تھا کہ نفسیاتی امراض کی
علاج گاہ میں رہنا اس کے لیے مناسب ہے۔
علاوہ ازیں وہ اپنے بیٹے کو نفسیاتی مریضہ سے دور
رکھنا چاہتا تھا۔

تنہائی اور احساس جرم نے سائرہ کی مزید
حالت بگاڑ دی۔ ہر وقت کے شدید ذہنی دباؤ سے
اس کی شکل وصورت بھی بگڑ گئی۔ ڈاکٹر اور نرسیں
اگرچہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن پیشہ ورانہ
ذمے داری اس محبت اور چاہت کا بدل نہیں جو
انسان کو صرف خونی رشتوں سے میسر آتی ہے۔

☆......☆......☆

آج یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کی طالبات
اسپتال کا دورہ کر رہی تھیں۔ ہر طالبہ ایک مریضہ
کے ساتھ گفتگو کرنے لگی۔ وہ نازک سی لڑکی سائرہ
کے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔ سائرہ خلاف معمول اس
روز قدرے بہتر حالت میں تھی لہٰذا وہ لڑکی کے
تمام سوالات کا دل جمعی سے جواب دے رہی تھی۔

باتوں باتوں میں وہ طالبہ سائرہ کی ساری کہانی جان گئی اور اسے اس بدقسمت عورت کی بیماری کا سبب بھی معلوم ہوا۔ سائرہ نے ماضی کا لحہ لحہ اس کے آگے کھول کر رکھ دیا لیکن گفتگو ختم ہوتے ہی اس نے سرد لہجے میں سائرہ سے ہاتھ ملایا اور بے پروائی سے اُٹھ کر چل دی حالانکہ اسے کم از کم سائرہ کی بدقسمتی پر افسوس ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اس کے جانے کے بعد سائرہ نے وہ پمفلٹ کھول کر دیکھا جو ہر طالبہ اپنی موکل کو دے گئی تھی۔

ہر پمفلٹ پر طالبہ کی تصویر اور نام بھی لکھا تھا۔ جب سائرہ نے طالبہ کا نام پڑھا تو اس کی سانس اکھڑ گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور دل کی دھڑکن بے قابو ہوگئی وہ حواس باختہ ہو کر باہر کی طرف دوڑی اور پکارنے لگی۔

''فاطمہ...... فاطمہ...... میری بیٹی، میری بات سنو۔''

سائرہ دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ فاطمہ نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے مگر چہرے پر چھائی سرد مہری صاف پیغام دے رہی تھی کہ وہ اس کی ماں کیسے ہو سکتی ہے جس نے اپنی خواہشات پوری کرتے ہوئے اسے اس ممتا، چاہت، شفقت اور راہنمائی سے محروم رکھا جو ہر ماں اپنے بچوں پر نچھاور کرتی ہے۔ سائرہ نے ایک بار پھر پکارا۔

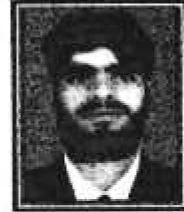
''فاطمہ، میری بچی، میری بات تو سنو۔''

لیکن فاطمہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ سائرہ وہیں ساکت کھڑی رہی۔ اسے تب احساس ہوا کہ پُرآسائش زندگی کے حصول میں وہ ایسی محو ہوئی کہ اپنے ہاتھوں اپنا ہنستا بستا گھر تباہ کر بیٹھی۔ اگر وہ اپنے شوہر کی بات مان لیتی اور تن من دھن سے بیٹی کی پرورش کرتی تو وہ خوشیاں اس کے نصیب میں ہوتیں جن کی تمنا ہر عورت کرتی ہے۔ اب تو اسے سدا اذیت میں رہنا تھا...... شاید مرنے کے بعد بھی!

☆☆......☆☆

چوتھی سچ بیانی

اِک یہی حقیقت ہے



محمد یوسف لغاری

اُس نوجوان کی کہانی، جس نے جو بویا وہی کاٹا

ماجد اور میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے ہم دونوں غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے ماجد کے ابو ایک اسٹور پر کام کرتے تھے جب ماجد چھٹی کر کے گھر جاتا تو وہ ابو کی جگہ کام پر چلا جایا کرتا اس کے ابو چند گھنٹوں کے لیے گھر آجاتے تھے جبکہ میرے ابو ایک فیکٹری میں کلرک تھے جس سے ہمارے گھر کا بس گزر بسر ہی چل رہا تھا۔

ماجد اور میرا گھر ساتھ ساتھ تھا تو کلاس میں بھی ہماری جوڑی ایک جیسی تھی۔ ماجد جب اسٹور سے شام کو گھر واپس آتا تو پھر ہم دونوں مل کر اسٹڈی کرتے تھے اور ماجد مجھے ہر روز اپنے گھر کی غربت کی کہانی سناتا اور بہت حسرت سے کہتا کہ نہ جانے اُس کے حالات کب ٹھیک ہوں گے اور پھر وہ بھی امیروں جیسی زندگی گزارے گا۔ جو ماجد کی تمنا تھی یہ میرے بھی دل کی آواز تھی مگر میرے ابو صبر و شکر والے تھے ابو ہمیں یہی کہتے کہ بیٹا ہر حال میں شکر ادا کرو اور ان لوگوں کو بھی تو دیکھو جن کے پاس روٹی صرف ایک ٹائم کے لیے ہوتی ہے اور دوسرے ٹائم کی نہیں ہوتی پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہوتے، آپ اُن سے تو بہتر ہو اور ہمیشہ اپنے سے اوپر نہیں بلکہ نیچے کے لوگوں کو دیکھنا چاہیے اور پھر اللہ کا شکر ادا اور صبر کرنا چاہیے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر اور شکر کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ تم اپنی توجہ پڑھائی پر دو، محنت کرو تو اللہ آپ کو اس کا صلہ ضرور دے گا۔"

ابو کی کہی گئی باتیں میں ماجد سے کہتا تو وہ تلخی سے ہنس دیتا اور کہتا کہ یار ہمارے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ پڑھائی سے ہمیں کچھ نہیں ملنے والا بلکہ ہم بھی پڑھ لکھ کر دوسروں کی طرح بیروزگار ہی رہیں گے۔ ہم نے ہمیشہ ایسے ہی رہنا ہے اور یہ (آسائشات) سب امیروں کے ہی نصیب میں لکھی ہیں۔ ماجد کی ان باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔

چند دن گزرنے کے بعد ماجد بریک کے وقت کھانے پینے کی بہت ساری چیزیں لے آیا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ آج اتنی رقم کہاں سے آئی۔

تو ماجد نے کہا کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو پھر ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب میں تمہاری بات سمجھا نہیں؟؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

دوست میں جس دکان پر کام کرتا ہوں وہاں

سے میں نے پیسے چوری کیے ہیں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوہ ماجد تم نے چوری کی ہے یار تم نے یہ کیا کر دیا۔ کل ہم نے کیا پڑھا تھا چوری ایک بہت بڑا گناہ ہے اور چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے ۔میں نے افسوس بھرے لہجے میں اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جانتا ہوں یار مگر ہم جس دکان پر کام کرتے ہیں اس کی ایک دن کی کمائی بیس ہزار سے پچیس ہزار روپے ہے تو سوچو اس کی ماہانہ کمائی کتنی ہوگی جبکہ وہ ہمیں ماہانہ تنخواہ صرف نو ہزار روپے دیتا ہے تو اس لیے میں نے یہ کام شروع کیا ہے۔'' ماجد نے اطمینان سے جواب دیا۔

''یار یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کام ہیں تم حسد نہ کیا کرو بلکہ رشک کیا کرو ہمیں اللہ کی رضا پر راضی ہونا چاہیے اور اپنے رب سے دعا کیا کرو کہ وہ بھی ہمیں اس طرح سے نوازے۔'' میں نے ماجد کو کہا۔

مگر ماجد نے میری بات ان سنی کر دی۔

وقت گزرتا رہا، میں کالج میں داخل ہو گیا جب کہ ماجد نے آگے داخلہ نہ لیا حالانکہ اُس کے ابو ماجد کو بہت کہتے رہے کہ داخلہ لے لو مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔

اب میری اور ماجد کی ملاقاتیں بہت کم ہوتی تھیں کیونکہ میں پڑھائی پر پوری توجہ دے رہا تھا کیونکہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میرے والد جس مشقت سے مجھے پڑھا رہے ہیں تو میں بھی محنت کر کے انھیں اس کا صلہ دوں۔

میں ایک دن پڑھائی کر رہا تھا کہ گھر کا دروازہ بج اُٹھا۔ میں باہر گیا تو باہر ماجد کھڑا تھا۔ اُس سے کافی عرصہ بعد ملاقات ہو رہی تھی ہم دونوں باہر ایک جگہ بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے تو ماجد نے بتایا کہ اُن کو دادا کی طرف سے زمین کا حصہ ملا ہے وہ اس کا کچھ حصہ بیچ کر اُسی جگہ سٹور بنا رہے ہیں تاکہ پرائی مزدوری سے جان چھوٹے۔''

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی تو میں نے ماجد کو کہا کہ یار یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر میں تمہیں



ایک نصیحت کروں گا کہ اپنی دوکان پر آنے والے گاہکوں کو مہنگی اشیاء دے کر لوٹنا۔ مت ہمیشہ حلال کی روزی کرنا کیونکہ حلال کمانے میں ہی میں برکت ہے۔''

ماجد میری بات سن کر مسکرا دیا اور بولا کہ میں اپنے دوست کی بات پر ضرور عمل کروں گا۔''

☆☆☆

وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا ابا جان کا انتقال ہو گیا اور میں نے کسی نہ کسی طرح ایم بی اے کر لیا تھا مجھے ابو کے فیکٹری مالک نے ابو کی جگہ نوکری پر رکھ لیا تھا۔ اس دوران ماجد سے میرا رابطہ مکمل کٹ گیا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے شروع میں وہ مہینے میں ایک چکر لازمی لگاتا مگر پھر اس نے بھی اپنے والد کی وفات کے بعد آنا چھوڑ دیا تھا میں دوسرے شہر آ گیا تھا اس لیے ایک دوسرے کی حالات کی خبر نہ تھی کہ ماجد کے حالات کیسے ہوں گے۔ کیونکہ میرے حالات ویسے کے ویسے ہی تھے۔ غربت جوں کی توں موجود تھی معمولی تنخواہ سے بہت مشکل سے گزارا چلتا تھا جس سے میں اکتا جاتا تھا مگر پھر ابو کی نصیحتیں یاد آتیں تو صبر کرتا کہ اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ضرور اس کا پھل دے گا۔

میں ایک دن بیٹھا کام کر رہا کہ مجھے بڑے صاحب نے اپنے پاس بلوا لیا۔

میں حیران ہوتا ہوا ارمان صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گیا کہ انہوں نے مجھے کیوں یاد کیا ہو گا اُن کے پاس نہ ہی اتنا ٹائم ہوتا تھا اور نہ وہ ملازمین سے ملتے تھے کیونکہ تمام معاملات جنرل منیجر دیکھتا تھا۔

''سر میں اندر آ سکتا ہوں؟''

میں نے کمرے کے دروازے کو ذرا کھول کر پوچھا، حالانکہ مجھے گارڈ کے ذریعے اندر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔

''جی جی میاں آ جاؤ۔''

میں کنفیوز ہوتا ہوا کرسی کے قریب کھڑا ہو گیا۔

ارے کھڑے کیوں ہو کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' صاحب نے فائل کے مطالعہ سے سر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

اب میری حیرانی مزید بڑھ چکی تھی نہ جانے کیا معاملہ ہے۔

ارمان صاحب نے فائل ایک طرف رکھی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ کے والد ہمارے صرف کلرک ہی نہیں تھے بلکہ اُن کے ساتھ میری دوستی بھی تھی وہ اس وقت سے ہمارے ساتھ رہے جب ہمارے بزنس کو عروج نہیں تھا مگر انہوں نے کم تنخواہ پر ہمارا بہت ساتھ دیا، اُن کے ہاتھوں ہی میرا بڑا بیٹا نعمان کھیل کود کر بڑا ہوا ہے۔ آج بھی نعمان آپ کے والد کو بہت یاد کرتا ہے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ فیکٹری کی خدمت کی ہے اور اسی خدمت کو بھلایا نہیں جا سکتا ان کی وفات کے بعد جب تمہیں ملازمت دی گئی تو میں نے تمہاری تعلیمی اسناد دیکھی تھیں بہت ہی شاندار ریکارڈ ہے تمہارا مگر جو تمہیں ملازمت دی گئی وہ تمہاری تعلیم کے شایان شان نہیں تھی مگر یہ ہماری مجبوری تھی ہم تمہیں اتنی جلدی کوئی بڑی پوسٹ بھی نہیں دے سکتے تھے اس لیے جس پوسٹ پر تم کام کر رہے ہو ہماری مینجمنٹ ٹیم نے تمہیں چھ ماہ چیک کیا ہے تم ہماری توقعات کے سے بڑھ کر ہمارے معیار پر پورے اُترے ہو ٹائم پر آنا، ٹائم پر جانا ڈیوٹی کو ایک فرض سمجھ کر ادا کرنا اور اہم بات یہ کہ تمہارے پاس ایسی پوسٹ تھی جس سے تم تھوڑی بہت بے ایمانی کر سکتے تھے مگر تم اس معیار پر بھی پورا اُترے اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ ان سب کے بدلے تمہیں کیا ملنے والا ہے۔'' صاحب نے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر میں کوئی اندازہ نہیں کر رہا۔'' میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا، حالانکہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ غالباً مجھے ترقی ملنے والی ہے۔

''بیٹا ہم آپ کو اپنی دوسری فیکٹری جس کو میرا بیٹا نعمان دیکھتا ہے اس میں جنرل منیجر کے طور بھیج رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ اسی ایمانداری کے ساتھ کام کرو گے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کہا۔

"جی سر بہت شکریہ میں آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گا۔" اتنی بڑی پوسٹ کا نام سن کر خوشی کے مارے میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

☆☆☆

اب زندگی نئے رخ پر چل پڑی تھی کیونکہ میں اللہ کے فضل و کرم سے خوشحال ہو چکا تھا۔ کیونکہ نئی پوسٹ میں بہترین زبردست پیکیج تھا اور دوسرا بونس اور دیگر معاملات۔ میرا ذہن بہت تخلیقی تھا میں آئے روز نئے نئے آئیڈیاز دیتا تھا، ملازمین کے ساتھ میرا رویہ بہت دوستانہ تھا میں نے نعمان صاحب سے آتے ہی کہا تھا کہ ملازمین کو جب تک ہم اپنے بھائی جیسا نہیں سمجھیں گے اور اِن کے مسائل کو اپنا مسئلہ نہیں جانیں گے اس وقت تک ہم اُن کا اعتماد نہیں جیت سکتے اور پھر سب ملازمین کی تنخواہیں پہلے کی نسبت کافی حد تک بڑھوا دی تھیں، اور اسی وجہ سے ہماری فیکٹری پہلے کی نسبت بہت آگے چلی گئی۔

اس جنرل مینیجر کی نئی پوسٹ پر مجھے کام کرتے تقریباً آٹھ ماہ گزر چکے تھے کہ اِک دن نعمان صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ ہماری دبئی کی جس برانچ کے ساتھ ہمارے شیئر ہیں اُس میں جو ہم نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں مل نہیں رہے اس لیے ابو اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے اگر تم راضی ہو تو وہاں تمہیں بھیجا جائے تاکہ ہم نے جو رقم شیئر کی ہوئی ہے اس کے مطابق ہمیں منافع مل سکے۔"

یہ میرے لیے ایک خوشخبری بھی تھی اور ایک قسم کا حکم بھی تھا جس کو ٹالنا میرے لیے ممکن نہ تھا اس لیے میں ہاں کر دی۔

☆☆☆

دبئی میں مجھے ایک شاہانہ آفس دیا گیا اور ایسی پرکشش تنخواہ کہ جس کے لیے لوگ ترستے تھے وہ مجھے اتنی جلدی مل جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا شاید یہ میرے والدین کی دعائیں تھیں اور میرے صبر کا بھی نتیجہ تھا کہ اک نہ اک دن اللہ تعالیٰ محنت کا پھل ضرور دیتا ہے۔

میں نے آتے ہی اس برانچ میں مختلف معاملات کو دیکھا اور جہاں جہاں مجھے غلطی نظر آئی وہ میں نے دور کی اور لمحہ بہ لمحہ نعمان صاحب کو رپورٹ دیتا رہا ہر روز منافع و خسارا کی رپورٹ کو میں خود دیکھتا ایک ایک انٹری کو ملاتا جس سے ہمارے منافع میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس دوران کبھی کبھی مجھے ماجد بہت یاد آتا کہ کسی طرح اُس کو تلاش کروں اس سے رابطہ کروں مگر میں کیا کرتا مصروفیت اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ میں صرف ماجد کو سوچتا ہی رہ جاتا۔

☆☆☆

چند دنوں کے بعد میں مجھے ایک نئے (پراجیکٹ) کے لیے پاکستان واپس بلا لیا گیا۔ نئے (پراجیکٹ) کے بارے میں جب میں نعمان صاحب سے ملا تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے غریبوں اور معذروں کے لیے ایک این جی او بنائی ہے جس کا مقصد ان کی امداد کے ساتھ ساتھ ان کو کوئی ہنر سکھا کر معاشرے کا ایسا فرد بنانا ہے کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنیں اس کے لیے پہلے مختلف شہروں اور دیہاتوں کا وزٹ کر کے سب کی لسٹ بنانی ہوگی اور یہ سب ذمہ داری تمہاری ہوگی، اور اس کے لیے تمہیں عملہ اور گاڑیاں مہیا کر دی جائیں گی۔ نعمان صاحب نے مجھے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ہم نے چند دنوں کے بعد وزٹ شروع کر دیے اور لسٹیں مرتب کرنا شروع کر دی۔ ایک دن ہم ایک دیہات میں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ میں گاڑی کے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا مجھے ایک اسکول نظر آیا جس کے باہر ایک ریڑھی کھڑی تھی جس کے ساتھ ایک نوجوان کھڑا تھا جب میری نظر اس پڑی تو میں اچانک چونک اُٹھا، بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

ماجد!!!!

"گاڑی روکو جلدی۔" میں نے ڈرائیور سے فوراً کہا۔

گاڑی رکی تو میں جلدی سے نیچے اتر کر اس نوجوان کی طرف بڑھا۔

''ماجد۔'' میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور پھر اچانک اُس کے منہ سے آواز نکلی۔

''یار......تم!!!!''

''ہاں میں، لیکن تم ماجد ہو نا۔'' جذبات شدت سے میرے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

''ہاں یار میں ماجد ہی ہوں آپ کا پرانا دوست۔''

''مگر ماجد یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ تم تو اپنا سٹور بنانے والے تھے پھر یہ کیا۔'' میں نے حیرانی سے اس سے پوچھا۔

''ہاں دوست میں نے اپنا اسٹور بنایا تھا مگر......'' یہ کہہ کر اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مگر کیا؟؟؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے مجھے کہا تھا نا کہ حق حلال کی روزی کمانا کسی کو مت لوٹنا، مگر یار میں نے یہ سب کچھ کیا میں نے بے ایمانی کی کیونکہ میرا جس علاقے میں سٹور تھا وہاں کوئی اور سٹور نہیں تھا۔ میں نے ان کی مجبوری سے فائدہ اُٹھایا اور بے فکر ہو کر خوب بے ایمانی کی، شروع میں میرا کام بہت اچھا تھا پھر آہستہ آہستہ کام ختم ہونا شروع ہو گیا مگر میں نے اپنے اِس خسارے کو پورا کرنے کے لیے گاہکوں کو اور زیادہ لوٹنا شروع کر دیا مگر کام بالکل ختم ہوتا جا رہا تھا پھر ساتھ کسی اور نے سٹور بنا لیا سبھی اس کے پاس جانے لگے اب میرا کام بالکل ختم ہو چکا تھا پھر میں نے بنک سے ادھار لیا اور نئے سرے سے اسٹور شروع کیا مگر پھر بھی کچھ نہ ہوا میرا کام بالکل ختم ہو گیا بنک کو دینے کے پاس میرے لیے کچھ نہ تھا تو بنک نے بدلے میں میری دوکان ضبط کر لی اور میرا سب کچھ تباہ ہو گیا اور آج میری حالت تمہارے سامنے ہیں۔'' ماجد نے گلوگیر لہجے میں مجھے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''ماجد میں تمہیں ہر وقت یہی سمجھاتا تھا لیکن تم نے میری باتوں پر عمل نہیں کیا لیکن جب سر سے پانی گزر جاتا ہے تو پھر ہم افسوس کرتے ہیں۔'' میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں یار تم ٹھیک کہتے ہو مگر کاش میں نے تمہاری باتوں پر عمل کیا ہوتا تو آج شاید میرا یہ حال نہ ہوتا۔'' اُس نے کہا۔

''ماجد اب جو ہونا تھا وہ چکا ہے اب افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہو گا اب تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں اپنی فیکٹری میں نوکری دلوا دوں گا۔'' ماجد کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی تو میں نے اس کو آفر کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار میں کہیں نہیں جانا چاہتا میں چل پھر کر جو تھوڑی سی روٹی کما لیتا ہوں یہ میرے لیے بہت ہے بس اب ہر وقت یہی دعا کرتا ہوں کہ میں جو بے ایمانیاں کرتا تھا بس وہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں۔'' ماجد نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

مگر میں ماجد کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بہت اصرار کرتا رہا مگر ماجد ٹس سے مس نہ ہوا تو مجبوراً مجھے اُس کو چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

☆☆☆

ہم کافی دن اس نئے (پروجیکٹ) میں مصروف رہے مگر میرا ذہن مسلسل ماجد کی طرف ہی رہا کہ کسی طرح اس کو اس فیکٹری میں لے آؤں مگر مصروفیت اتنی تھی کہ اس کا ٹائم ہی نہ نکلتا۔

پھر اک دن بمشکل ٹائم نکالا میں ماجد کو تلاش کرنے اس جگہ پہنچ گیا۔ مگر اس سکول کے باہر ماجد موجود نہ تھا۔ میں نے سکول کے باہر کھڑے اہلکار سے ماجد کے بارے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ نوجوان کافی عرصہ سے باقاعدگی سے آ رہا تھا مگر اب تقریباً دس دن ہو گئے ہیں وہ نہیں آیا۔''

''کیا اُس کے بارے آپ کو کچھ پتا ہے کہ اس کا گھر یا کوئی ٹھکانہ وغیرہ کدھر ہے۔'' میں نے اس پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں مجھے تو کچھ پتا نہیں ہاں البتہ تھوڑا آگے جا کر دائیں طرف اِک دوکان آئے گی وہ شاید وہاں

سے بیچنے کے لیے سامان وغیرہ خرید تا تھا کیونکہ میں نے اس کو کئی دفعہ وہاں کھڑے دیکھا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد میں اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر موجود تھا۔

میں نے دوکان پر بیٹھے آدمی سے ماجد کے بارے پوچھا تو پہلے وہ چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا اور پھر افسردہ لہجے میں بولا کہ ماجد کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''کک ـ ـ ـ ـ ـ کیا ـ ـ مگر کب کیا ہوا تھا اس کو۔'' میں چلا اٹھا۔

''یہی کوئی دس دن قبل، آگے پیچھے شاید کوئی نہیں تھا بے چارے کا۔ اکثر میرے پاس ہی بیٹھا رہتا رات کو ادھر میری دوکان کے شیڈ کے نیچے سوتا تھا اچانک بخار ہوا بے چارے کو جس نے ایک ہی دن میں ادھ موا کر دیا۔ میں نے دوائی لا کر دی اور اس کو کہا کہ جب تک بخار ہے میرے گھر رہو مگر وہ نہ مانا اور ادھر شیڈ کے نیچے ہی سو گیا اور جب میں اگلے دن صبح آیا تو وہ انتقال کر چکا تھا۔'' دوکاندار نے مجھے بتلاتے ہوئے کہا۔

چند لمحے تک تو میری حالت ایسی ہو گئی جیسے کاٹو تو لہو نہیں میں افسوس کے مارے اک لفظ بھی نہ کہہ سکا، جب میری حالت کچھ حد سنبھلی تو میں نے اس سے ماجد کی قبر تک چلنے کو کہا۔

قبرستان ساتھ ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ماجد کی قبر پر موجود تھے یہاں میرا صبر جواب دے گیا میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں نے بمشکل ٹوٹے پھوٹے لہجے میں فاتحہ خوانی کی اور اُٹھ آیا۔

میں نے اِدھر اُدھر طرف نظر گھما کر دیکھا قبریں ہی قبریں تھیں کوئی نئی، کوئی پرانی، شکستہ حال ٹوٹی پھوٹی مگر سب کی سب خاموش اور اس کے اندر لیٹے انسان کوئی جوان، بزرگ تو کوئی بچے مگر سب کے سب خاموش۔ زندہ انسانوں کی کل حقیقت انہی قبروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن تھی۔

میں نے گاڑی میں بیٹھ کر اپنے دوست کی قبر کی طرف آخری دفعہ دیکھا اور یہ سوچتا ہوا واپس چل پڑا کہ ہم نے تمہاری طرف آنا ہے تم نے نہیں۔

☆☆☆

پانچویں سچ بیانی

مکافاتِ عمل

سید ملازم حسین شیرازی

اُس مجرم کا بیان، جس کی سزا مجرموں کو بیس برس بعد ملی تھی

میرا تعلق صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) کے خوب صورت شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ چند سال پیشتر دبئی میں کافی عرصہ رہنے کے بعد اپنے شہر واپس آیا تھا۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد خواہش تھی کہ لاہور میں کسی اچھی جگہ زرعی زمین خریدوں کھیتی باڑی اور پھل دار درخت لگا کر سکون و آرام سے زندگی گزاروں اس سلسلے میں لاہور گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ایک مناسب ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لیا اور اراضی خریدنے اور دیکھنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی۔ کسی نے بتایا تھا کہ ملتان روڈ سے قدرے ہٹ کر ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب موٹر وے کا منصوبہ ہے۔ جس کی وجہ سے آنے والے وقت میں زمینوں کی ویلیو بہت بڑھ جائے گی۔ اگر آج زمین خریدی جائے تو مستقبل قریب میں کافی فائدہ ہوسکتا ہے۔

ایک دن میں سانده پٹوار خانے گیا کسی نے بتایا تھا کہ وہاں مظہر پٹواری ہوں گے جو متعلقہ علاقے کو ڈیل کرتے ہیں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ صاحب کسی زمین کی نشان دہی کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک صاحب جو پہلے ہی پٹواری کے انتظار میں تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام ملک فیاض تھا۔ 50/55 سال کے پیٹے میں تھے۔ گٹھا ہوا بدن، کاٹن کے سفید کلف زدہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ سر پر سفید پگڑی، کندھے پر پیچ کرتی چادر تھی بات چیت میں پختگی اور ٹھہراؤ تھا۔

دعا سلام ہوئی انھوں نے میرے استفسار پر بتایا کہ وہ خود پٹواری صاحب کے انتظار میں دو گھنٹے سے بیٹھے ہیں اور اب وہ شاید نہ آئیں۔ مجھ سے میری آمد کا پوچھا میں نے انھیں اراضی سے متعلق بتایا انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور بتایا کہ میرا پروگرام اور فیصلہ بہت مناسب اور صائب ہے۔ اگر اراضی مذکورہ جگہ یا قرب وجوار میں خریدی جائے تو آنے والے وقت میں بہت فائدے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے آفر دی کہ موٹر وے کے ساتھ دریائے راوی کے کنڈے (کنارے) ان کی کافی زمین ہے اگر دلچسپی ہو تو دیکھی جاسکتی ہے۔ پسندیدگی کی صورت میں اگر خریدنا چاہیں گے تو وہ بخوشی فروخت کریں گے۔''

میں تو خود یہی چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں پٹوار

خانے گیا تھا۔ وہاں ایک معزز مالک اراضی سے ملاقات ہوئی تو میں کیسے انکار یا اعتراض کرسکتا تھا۔ فوراً پروگرام بنایا اور انہی کی جیپ میں زمین ملاحظہ کرنے روانہ ہوئے۔ ان کے گاؤں گئے جو دریائے راوی کے نزدیک تھا۔ اپنے گھر لے گئے۔ ساگ مکئی کی روٹی، لسی سے تواضع کی اور پھر ان کی محبت میں پیدل زمین دیکھنے گیا۔ وہ علاقہ سرسبز اور شاداب تھا ہر طرف ہریالی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر موٹروے کا سروے ہو چکا تھا۔ آس پاس کے علاقہ میں لیچی اور دوسرے پھلوں کے باغات تھے۔ زمین پسند آئی پچاس کنال زمین خریدنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ پچاس ہزار روپے فی کنال زمین کا سودا طے پایا۔ انھوں نے زمین سے متعلق فردِ ملکیت میرے حوالے کی تاکہ میں پٹواری سے چیک کراؤں۔ ایک مرتبہ پھر سانده پٹوار خانے گیا۔ پٹواری سے ملاقات ہوئی میں نے مذکورہ اراضی کے جملہ کاغذات دکھائے اور گزارش کی کہ وہ بتائیں زمین کا ٹائٹل کیا ہے؟ زمین کلیئر ہے؟ کوئی قانونی سقم تو نہیں؟ ملکیت وغیرہ میں کوئی مسئلہ تو نہ ہے۔ انھوں نے کاغذات چیک کیے اور تصدیق کی کہ اراضی پاک صاف ہے کوئی جھگڑا یا Litigation نہیں ہے ٹائٹل کلیئر ہے۔

تسلی ہونے کے بعد میں ملک صاحب سے ملا۔ زمین کا سودا طے پایا۔ پچاس ہزار روپے فی کنال کے حساب پچیس لاکھ بنتے تھے مبلغ دو لاکھ روپیہ بطور ایڈوانس دیا اور بقایا رقم بوقت انتقال اراضی رجسٹرار کے روبرو ادا کی جائے گی۔ یوں ملک صاحب سے ایک رشتہ قائم ہوا۔ اکثر ان کے گاؤں جانا ہوتا تھا۔ بہت خاطر مدارت کرتے تھے۔ ان کے اہل خانہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے دو ایک مرتبہ میرے گھر والے لاہور آئے، زمین دیکھی ملک صاحب کے گھر والوں سے تعارف کرایا بہت خوش ہوئے کہ علاقہ خوب صورت اور سرسبز ہے۔ میں نے ان دنوں ماڈل ٹاؤن میں دفتر کرایہ پر لیا تھا جہاں زمین کی خرید و فروخت اور رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ میرا قیام ابھی تک ہوٹل میں تھا۔ ہوٹل مالکان سے تعلقات اچھے تھے آمد و رفت اور کھانے پینے کی کوئی



تکلیف نہ تھی۔ ملک صاحب اکثر دفتر یا ہوٹل آ جاتے تھے اور کبھی کبھی ہوٹل میں قیام بھی کر لیا کرتے تھے۔ چونکہ ہمارے درمیان اعتماد و خلوص اور بھائی چارہ تھا اس لیے وقتاً فوقتاً زمین کی بابت کچھ رقم بھی لے لیتے تھے چونکہ ہمارا سودا پچیس لاکھ روپے کا ہوا تھا اسی ضمن مجھ سے پندرہ لاکھ لے چکے تھے۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ زمین کا انتقال/ٹرانسفر جلد ہو جائے لیکن بقول ملک صاحب ان کے اپنے بھائی سے اس بابت کچھ معاملات طے کرنا تھے۔ مجھے تسلی دیتے تھے کہ فکر کرنے کی چنداں ضرورت زمین آپ کی ہے اور کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

ایک دن کا ذکر ہے ملک صاحب میرے دفتر ماڈل ٹاؤن تقریباً پانچ بجے شام آئے وہ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سات بجے تک آفس میں رہے دفتر بند کرنے کا وقت ہوا ملک صاحب سے گھر جانے کو تیار ہوئے میں نے انھیں دعوت دی کہ چونکہ آج ہفتہ ہے کل اتوار چھٹی ہوگی کیوں نہ میرے ساتھ ہوٹل چلیں۔ رات قیام کریں۔ انھیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا میرے ساتھ ہوٹل روانہ ہوئے۔ ہوٹل پہنچ کر تھوڑا آرام کیا نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر رات کا کھانا وہیں ہوٹل میں کھایا باتیں کرتے رہے اور تقریباً گیارہ بجے سونے کے لیے اُٹھے۔ رات کوئی دو بجے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں لائٹ آن تھی اور ملک صاحب تہجد پڑھنے میں مصروف تھے۔ پانچ بجے دوبارہ اُٹھے صبح کی نماز پڑھی ناشتا منگوالیا ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ دروازے کو کسی نے Knock کیا دروازہ کھولا تو ملک صاحب کے بیٹے ریاض تھے۔ جو اس وقت بہت جلدی میں اور بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ملک صاحب کے پوچھنے پر بتایا کہ گاؤں میں ان کے پرانے دشمن کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور اس قتل کے سلسلے میں پولیس آپ کو تلاش کر رہی ہے۔ یہ واقعہ رات گیارہ بجے پیش آیا۔ ملک صاحب فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے منع کیا

کہ ابھی نہ جائیں نہ جانے وہاں کیا صورت حال ہوگی لیکن بقول ملک صاحب چونکہ ان کا اس قتل سے واسطہ نہیں ہے اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ ملک صاحب کل شام پانچ بجے سے میرے ساتھ تھے۔ ابھی صبح کے سات بجے تھے یعنی پچھلے چودہ گھنٹوں سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے علیحدہ نہ ہوئے۔ پھر ہوٹل والے سارے اس بات کے گواہ تھے کہ رات کے کسی وقت جبکہ ہوٹل کا مین گیٹ بند ہو جاتا تھا کیسے ممکن ہے کہ کوئی ان کی نظروں سے بچ کر جائے۔ پھر ہوٹل سے ان کا گاؤں پچیس کلو میٹر دور تھا۔ رات بارہ سے صبح چار بجے تک اس وقت ٹریفک بھی زیادہ نہ ہوتی تھی یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ رات کو نکلیں، اتنی دور جائیں قتل جیسا سنگین جرم کریں اور پھر واپس چھپ چھپا کر آ جائیں۔ بہرحال ملک صاحب میرے منع کرنے کے باوجود اپنے گاؤں روانہ ہوئے شام تک رابطہ نہ ہوسکا۔ دوسرے دن میں اُن کے گاؤں گیا۔ معلوم ہوا کہ پولیس انھیں اور منشی نیاز (ان پر بھی مذکورہ قتل کا الزام تھا) کو گرفتار کر کے تھانہ چوہنگ لے گئی ہے متعلقہ تھانے پہنچا ملک صاحب اور منشی نیاز تھانے کے لاک اپ میں بند تھے۔ ایس ایچ او صاحب سے ملاقات ہوئی انھیں صورت حال سے آگاہ کیا کہ وقوعہ کے وقت وہ میرے پاس تھے جن کے لیے کافی گواہان اور شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایس ایچ او صاحب کا بھی قدرے یقین تھا انھوں نے دفعہ 302 کے تحت گرفتار کر کے دوسرے دن عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے 5 دن کا ریمانڈ دیا پھر جیل بھیج دیا گیا۔ کیس تقریباً ایک سال چلتا رہا ان کے بیٹوں نے ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ کی ضمانت سیشن میں اور پھر ہائی کورٹ میں خارج ہوئی۔ اب ملک صاحب اور منشی نیاز کوٹ لکھپت جیل میں بند تھے۔ مقدمہ چل رہا تھا۔ سماعت جاری تھی ان کے خلاف گواہان پیش ہوتے رہے میں نے بھی ملک

صاحب کے حق میں سیشن جج کے سامنے اپنی گواہی پیش کی تفصیلاً ساری صورت حال بتائی۔ ہوٹل والوں کو بھی شہادتوں کے لیے پیش کیا۔ اور پھر ایک سال بعد عدالت نے ملک صاحب اور منشی نیاز کو پچیس پچیس سال قید با مشقت کی سزا دی۔

یہ میرے لیے پریشانی اور دکھ کے ایام تھے ایک تو ملک صاحب کو کافی پیسہ دے چکا تھا اور ہنوز زمین ابھی تک ان کے نام تھی۔ میرے نام سوائے ایک ایگریمنٹ کے اور کچھ نہ تھا۔ دوسرا اُن کا مذکورہ اراضی کے سلسلے میں بھائی سے کیس چل رہا تھا۔ مزید برآں زمین کے علاوہ بحیثیت انسان اس لیے بھی پریشان تھا کہ انھیں ناکردہ جرم اور گناہ میں سزا ہوئی ہے وہ بے قصور اور بے گناہ تھے یہ میرے لیے لمحاتِ فکر یہ تھے۔

میں ان سے افسوس کرنے اور ملاقات کرنے جیل گیا۔ ملاقات ہوئی میں نے ملک صاحب کو بتایا کہ آپ پر ظلم ہوا ہے نا انصافی ہوئی ہے۔ بغیر کسی ارتکابِ جرم کے اتنی لمبی سزا ہوئی۔ ملک صاحب نے جواباً بتایا کہ نہیں ایسی بات نہیں۔ انھیں قتل کی صحیح سزا ہوئی ہے۔ انھوں نے واقعی قتل کیا اور اس قتل کی سزا کے حق دار تھے۔ یہ اور بات کہ اس قتل میں وہ ملوث نہ تھے اس سے دُور دُور کا بھی واسطہ نہ تھا یہ تو دراصل اس قتل کی سزا ہوئی جو آج سے بیس سال پہلے ایک بے گناہ اور بے خطا بزرگ کو دونوں یعنی ملک صاحب اور منشی نیاز نے مل کر قتل کیا تھا۔ میں بہت حیران ہوا اور ان سے تفصیلاً معلومات جاننے کی خواہش کی۔

ملک صاحب گویا ہوئے۔ میں اور منشی نیاز پیشہ ور چور تھے۔ لڑائی جھگڑے، چوری چکاری ٹھگ بازی ہماری فطرت میں شامل تھیں۔ ایک دفعہ بغرض چوری ساہیوال گئے۔ ساہیوال سے پندرہ کلومیٹر ایک قصبہ تھا جس میں ہم نے چوری کرنی تھی۔ ہمارے مخبر کی اطلاع کے مطابق وہاں ایک گھر میں کافی مال تھا اور ٹارگٹ بھی آسان تھا۔ ہم قصبہ روانہ ہوئے موسم سرد تھا۔ رات کا وقت تھا اور پھر

غاروں والا شہر

روسی ریاست جارجیا میں ایک ایسا قدیم شہر موجود ہے جس کے مکین زیر زمین تراشے گئے پتھریلے غاروں یا گپھاؤں میں رہتے تھے۔ یہ غار آج بھی موجود ہیں مگر یہ کافی شکستہ ہو چکے ہیں۔ زمانے کے سرد و گرم نے ان غاری رہائش گاہوں کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہے مگر جارجیا کی حکومت نے ان کی مرمت بھی کی اور تزئین و آرائش بھی کی، کیوں کہ یہ ان کی ثقافت کا ورثہ ہے اور دنیا بھر کے سیاح ان غاروں کو بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ پتھریلے مکانات والے اس قدیم شہر کا نام Uplistsikhe ہے جس کا مقامی زبان میں مطلب ہے: ''دیوتاؤں کا قلعہ'' گویا یہاں کی روایات کے مطابق بھی ان مکانوں میں دیوتا رہتے تھے تاکہ آسمانی دیوتا دنیا کے لوگوں کے ہنگامے اور شور و غل سے بچ کر یہاں سکون سے رہیں۔ یہ قدیم طلسماتی شہر مشرقی جارجیا میں واقع ہے۔

حسنِ انتخاب۔ رازِ عدن۔ بحرین

زور دار بارش شروع ہوگی۔ ہم راہ سے بے راہ ہو گئے اور راستہ بھٹک گیا۔ دور کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ مناسب سمجھا کہ اس آبادی میں رات گزاری جائے۔ تھوڑی دیر مسافت طے کرنے کے بعد اس قصبہ میں داخل ہوئے۔ کچے پکے مکانات تھے۔ آبادی زیادہ نہ ہونے کے آثار تھے۔ چونکہ رات کا وقت تھا موسم بھی بہت خراب تھا۔ خاموشی ہی خاموشی تھی ایک گھر سے روشنی دکھائی دی ہم نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بزرگ لاٹھی کے

سہارے دروازے پر آموجود ہوئے اور دروازہ کھول دیا۔ 65/70 سال کی عمر ہوگی۔ سفید باریش تھے۔ چہرہ نورانی تھا جسم قدرے لاغر تھا۔ بیمار دکھائی دے رہے تھے اس لیے بار بار کھانس رہے تھے۔ دعا سلام ہوئی ہم نے اپنا مدعا بیان کیا کہ راستہ بھول چکے ہیں یا تو سیدھے راستے کی نشان دہی کی جائے وگرنہ مہربانی ہوگی ہمیں رات یہیں گزارنے کی سہولت مل جائے۔ وہ بزرگ یہ سن کر فرمانے لگے کہ رات کے اس وقت کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے گھر والے میری پوتی کی رسمِ منگنی کے سلسلے میں دوسرے گاؤں گئے ہیں۔ گھر میں اکیلا ہوں۔ آپ لوگ بسرو چشم اندر آئیں۔ آپ کی مہمانداری میں بہت خوشی ہوگی۔'' وہ بہت مخلص اور مہمانداری کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ رات بزرگ کے گھر رہا جائے۔ وہ اندر لے گئے تین کمرے ساتھ ساتھ بنے تھے ان کے آگے دالان تھا اور تینوں کمروں میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے کے لیے دروازے تھے۔ صحن میں مال مویشی بندھے تھے صاف ستھرا مکان تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں لے گئے وہاں تین چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے انھوں نے اندر لکڑیاں ڈال دیں۔ آگ کا الاؤ روشن کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹرے میں سالن، مکھن، روٹیاں اور دودھ لے آئے۔ معذرت کررہے تھے کہ اس وقت گھر میں یہی کچھ موجود تھا وگرنہ اچھی مدارت کا اہتمام ہوتا۔ ہم نے کھانا شروع کیا اور ان کے خلوص ومحبت کو بہت سراہا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں سو گئے بزرگ دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ رات کے پچھلے پہر کچھ کھٹ پھٹ کی آواز سنائی دی اندرونی کمرے سے جھانکا تو اندر کمرے میں روشنی تھی اور وہ بزرگ غالباً تہجد کے لیے اٹھے تھے۔ کمرے میں مزید دیکھا تو دو چارپائیوں پر سلے اَن سلے قیمتی کپڑوں کے سوٹ شادی کا دیگر سامان اور تین عدد سوٹ کیس نظر آئے۔ انھیں کھول کر دیکھا تو ان میں بھی کپڑے اور سونے کے زیورات دکھائی دیے۔ ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ چونکہ ہم دونوں چور تھے ایسی ہی واردات کے لیے نکلے تھے اور یہ موقع ہمیں بڑی آسانی سے مل گیا تھا ہم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس بزرگ نے ہم پر کتنا بڑا اعتماد کیا۔ مہمان نوازی کی۔ خاطر مدارات سے نوازا۔ بڑی عمر ہونے کے باوجود ہماری خدمت میں لگ گئے۔ لالچ اور خودغرضی نے ہمیں جکڑ لیا تھا۔ انسانیت سے دور ہم درندہ صفت بن گئے تھے۔

ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو مال سمیٹنے کے اشارے کی۔ بڑی سے چادریں لیں اور ان میں مال سمیٹنے لگے۔ بزرگ ہنوز تہجد میں مصروف تھے۔ آوازیں سن کر سلام پھیرا اور حیرانگی کی حالت میں پوچھنے لگے کہ ہم کیا کررہے ہیں کیوں میری پوتی کی شادی کا سامان چُرا رہے ہو۔ میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔''

ہم نے ایک نہ سنی جب وہ شور مچانے لگے تو میں نے جائے نماز کے قریب پڑی ان کی لاٹھی اٹھائی اور ان کے سر پر دے ماری۔ چونکہ وہ بہت کمزور ونحیف تھے اور میری ضرب بھی شدید تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گر پڑے۔ ان کی نظروں میں حسرتوں کے آثار واضح تھے۔ گرتے ہی ان کی روح جسم سے نکل گئی۔ وہ بے گناہ، معصوم، بے خطا ہمارے لالچ، حرص، جرم کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ہمیں کوئی ڈر، خوف افسوس نہ ہوا۔ مال سمیٹا اور فوراً گھر سے نکل گئے۔ وہاں سے واپس ساہیوال آئے پھر ملتان پہنچے۔

دوسرے دن سارا سامان زیورات فروخت کیے اور اگلے دن واپس لاہور آ گئے۔

صاحب! یہ جو سزا ہمیں ملی ہے اسی بزرگ کو قتل کرنے کی ملی ہے جو بیس سال پہلے ہم سے سرزد ہوا تھا۔ موجودہ قتل سے کوئی واسطہ تعلق نہیں ہے یہ ہے مکافاتِ عمل جس سے ہم گزر رہے ہیں۔

☆☆☆

چھٹی سچ بیانی

جب دولت گھر کی باندی تھی

فرزانہ نگہت

اُس سیٹھ کی زندگی کا زہریلا باب جو کبھی دولت کے مینار پر براجمان تھا

شیخ رحیم کا تعلق ایک مخصوص برادری سے تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ دکان دار، ریڑھی بان، آڑھتی، ٹرانسپورٹر وغیرہ۔ شیخ رحیم پکوڑا فروش تھے۔ ان کا گھر اور ہمارا گھر دیوار سے دیوار ملا تھا۔

ان کا دس مرلے کا مکان کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ چہار دیواری کے بیچوں بیچ چار چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ باقی چاروں طرف کافی جگہ ویران پڑی تھی۔ وہ کثیر العیال آدمی تھے۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ اور دو بیٹے۔ تین بیٹیاں شادی شدہ تھیں باقی بچے ابھی پڑھ رہے تھے۔ ان کے مالی حالات دگر گوں ہی رہتے تھے۔ ان لوگوں کے تن پر نہ اچھے کپڑے ہوتے تھے نہ گھر میں اچھے برتن، فرنیچر، پھر جیسا کہ اس برادری کی باہمی اخوت، اتحاد و اتفاق ضرب المثل ہے۔ شیخ رحیم کو ان کے امیر رشتہ داروں نے کاروبار کے لیے بھاری رقم قرض دی۔ اس رقم سے انھوں نے شہر کے بڑے بازار میں پرچون کی دکان کھول لی۔ ان کا بڑا لڑکا شیخ سعید بھی جو اس وقت تک میٹرک کر چکا تھا ان کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا۔ جلد ہی وہ دکان چل نکلی۔ اس سے جو کثیر منافع ہونے لگا تو ان لوگوں کی مالی حالت بھی بہتر ہونا شروع ہوگئی۔ پہلے ان لوگوں نے اپنے رشتہ داروں کا قرض اتارا۔ پھر پرانے مکان گرا کر اس کی جگہ ایک دو منزلہ شاندار مکان تعمیر کروایا۔ اس میں بڑی قیمتی ٹائلیں اور ماربل لگوایا۔ قیمتی سے قیمتی سامان سے اسے آراستہ کیا سجایا۔ شیخ صاحب کی بیوی جو چٹی ان پڑھ تھیں۔ اب بروکیڈ اور کم خواب میں ملبوس سونے سے لدی بیگماتی شان دکھانے لگیں۔ اب اس گھر میں عمدہ سے عمدہ کھانے پکتے، آئے دن دعوتیں ضیافتیں ہوتیں۔ شیخ صاحب نے اب بازار میں کئی اور دکانیں بھی خرید لیں۔ اور مختلف مصنوعات کی کئی ایجنسیاں بھی حاصل کر لیں۔ یوں ان کی دولت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انہی دنوں شیخ صاحب کے بڑے لڑکے شیخ صاحب کے بڑے لڑکے شیخ سعید کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی ظاہر تھا خوب دھوم دھام سے ہوئی اس میں خوب دولت لٹائی گئی۔ شیخ سعید کے پہلے دو لڑکے رفیق اور شفیق پیدا ہوئے پھر دو بیٹیاں نیلوفر اور روبینہ۔ پھر کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب کی دونوں چھوٹی بیٹیوں اور چھوٹے بیٹے علیم کی بھی شادیاں ہوگئیں۔

ان شادیوں پر بھی خوب اسرافِ بے جا کا مظاہرہ کیا گیا۔ اور لوگوں پر اپنی دولت وحشمت کی دھونس جمانے کی کوشش کی گئی۔ علیم اس وقت کئی ایجنسیاں چلا رہا تھا۔

شیخ صاحب کے دونوں بیٹے ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ دولت گویا چاروں طرف سے سمٹ سمٹ کر ان کے پاس آ رہی تھی۔ دولت میں اضافے کے ساتھ ہی وہ سب لوگ بھی اب بدلتے جا رہے تھے۔ ان کے رویوں، انداز و اطوار اور گفتگو میں اب متکبرانہ رنگ اور رعونت داخل ہوتی جا رہی تھی۔ جن محلے والوں کے ساتھ مدتوں کا ساتھ اور برادرانہ تعلقات چلے آ رہے تھے وہ اب ان کے نزدیک کسی گنتی، کسی شمار میں ہی نہ رہے تھے۔ انھوں نے ان کے گھروں میں جانا اب موقوف کر دیا تھا۔ ان گھروں سے اگر کوئی ان کے گھر چلا جاتا تو اس کے ساتھ انتہائی سرد مہرانہ بلکہ رعونت آمیز سلوک کیا جاتا۔ یہ دیکھ کر محلے والوں نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ہمارے گھرانے سے شیخ صاحب کے گھرانے کے مدتوں پرانے دوستانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ لیکن ان میں بھی اب بگاڑ اور سرد مہری کا رنگ پیدا ہوگیا۔ مرد تو رسمی علیک سلیک تک محدود ہو کر رہ گئے لیکن عورتیں بھی کبھار آپس میں مل ہی لیتی تھیں۔ اور ظاہر تھا یہ ملاقاتیں کوئی خوش گوار ثابت نہ ہوتیں۔ ایک طرف تو پرانی ہمسائیگی کا خلوص، محبت اور اپنائیت ہوتی تو دوسری طرف نو دولتانہ چھچھورا پن، جھوٹا غرور و تکبر، سرد مہرانہ بے رخی و رعونت۔ نتیجتاً ہمارے گھر کی عورتوں نے بھی ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

غرور، تکبر، شیطانی صفت ہے۔ یہ غرور و تکبر ہی تھا جو ابلیس نے اللہ کی نافرمانی کی اور راندۂ درگاہ ہوا۔ قیامت تک کے لیے ملعون ٹھہرا۔ جن انسانوں نے اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ان کا حشر بھی عبرت ناک ہوا۔ شیخ رحیم کا خاندان بھی ایسے حشر سے نہ بچ سکا اور اللہ کی گرفت میں آ کر رہا۔

شیخ رحیم کے بڑے بیٹے شیخ سعید کے لڑکے رفیق اور شفیق ہر چند کہ انھیں بہترین اور مہنگے ترین تعلیمی

اداروں میں داخل کروایا گیا۔ تعلیمی اعتبار سے نالائق اور نکمے ہی رہے۔ دولت کی ریل پیل اور امیر کبیر گھرانوں کے بگڑے ہوئے لڑکوں کی صحبت نے انھیں غلط راستوں پر ڈال دیا۔ وہ آوارہ گردی، شراب وشباب اور جوابازی کے عادی ہوگئے۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنے لگے۔ ان کی آوارہ گردیوں کو لگام دینے کے لیے شیخ سعید اور ان کی بیوی نے یہ کیا کہ ان دونوں کی اکٹھی شادیاں کردیں۔ لڑکیاں ان کی برادری ہی کی امیرزادیاں تھیں۔ ان شادیوں پر بھی ظاہر تھا خوب دولت لٹائی گئی۔ نودولتیا پن کا مظاہرہ کیا گیا۔

لیکن ہوا یہ کہ شادی کے اگلے ہی دن دونوں لڑکوں کی بیویاں ناراض ہوکر اپنے میکے چلی گئیں اور کہلوا بھیجا کہ وہ اب ہرگز واپس نہ آئیں گی۔ معلوم ہوا کہ رفیق نے شادی کی رات کو اپنی بیوی کو شراب کی بوتل لاکر دی اور اس سے کہا کہ اسے شراب پلائے۔ اس کے انکار پر اس نے اسے بری طرح گالیاں دیں اور مارا پیٹا اور کمرے سے نکال دیا۔ اس کی تمام رات کمرے سے ملحقہ اسٹور میں گزری۔ شفیق کی بیوی نے بھی کم وبیش ایسا ہی بیان دیا۔ اس کے بیان کے مطابق شفیق جب اس کے پاس آیا تو شراب کے نشے میں مخمور تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ وہ تمام رات شراب پیتا اور اس سے بھی زبردستی پلانے کی کوشش کرتا رہا۔

ان واقعات سے ظاہر تھا شیخ صاحب کے گھرانے کی بدنامی ہونی ہی تھی۔ شیخ صاحب ان کی بیوی اور بیٹے بیٹیوں نے بے حد کوشش کی کہ معافی تلافی اور صلح صفائی ہوجائے۔ دونوں لڑکوں کی بیویاں گھر آجائیں۔ لیکن نہ تو بیویاں راضی ہوئیں نہ ان کے گھر والے۔ بڑے لڑائی جھگڑے کے بعد بالآخر دونوں لڑکوں کو اپنی بیویوں کو طلاقیں دینی پڑیں۔ اور جہیز کا بھاری بھرکم سامان بھی لوٹانا پڑا۔ شیخ صاحب اور ان کے خاندان کی ایسی سبکی ہوئی کہ کافی عرصہ تک وہ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب کے چھوٹے بیٹے علیم کا بڑا بیٹا سائیکل پر اسکول سے گھر آتے ہوئے ایک ٹانگے سے ٹکرا گیا۔ ٹانگے کا پہیہ اس کے پیٹ پر سے گزر گیا۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ اس حادثے پر شیخ صاحب کے خاندان پر سے گویا قیامت ہی گزر گئی۔ مگر شاید اللہ کی سزا ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

شیخ سعید کی بڑی بیٹی نیلوفر عرف نیلو ایک بے حد حسین وجمیل دوشیزہ تھی۔ رشتہ داروں میں اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک اچھا رشتہ موجود تھا۔ لیکن اب چونکہ وہ لوگ اونچی ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ اپنے نیم خواندہ رشتے داروں کی بجائے نیلو کی شادی کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ امیر کبیر گھرانے سے ہو۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر انھیں ایک ایسا خاندان مل ہی گیا۔ وہ لوگ اپنی برادری کے اور کراچی کے رہائشی تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے درجے کے کاروباری تھے۔ وہ خاندان ماں باپ تین بہنوں اور چار بھائیوں پر مشتمل تھے۔ جس لڑکے کے ساتھ نیلو کی شادی ہونا قرار پائی تھی وہ امریکہ میں اپنا بزنس سیٹ کیے ہوئے تھا۔ وہ خوب صورت امریکہ کا تعلیم یافتہ اور بڑی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ شادی کے بعد وہ نیلو کو امریکہ لے جانا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی خاندانی وجاہت، قول وتفاخر کی چکا چوند نے شیخ سعید اور ان کی بیوی کو ایسا مرعوب ومسحور کیا کہ انھوں نے ان سے اپنے بہت سے مطالبات منوالیے۔ وہاں یہ بھی منوالیا کہ شادی کے بعد نیلو کا جہیز اس کے شوہر کی ملکیت بن جائے گا۔ اس مطالبے پر شیخ صاحب کے خاندان کے کان کھڑے ہوجانے چاہیے تھے لیکن نہ ہوئے۔ اس رشتے نے ان لوگوں کی عقلیں گویا ضبط کرکے رکھ دیں۔ انھیں غرور وتکبر کی انتہائی بلندیوں پر پہنچادیا۔ یہ لوگ اب اپنے رشتہ داروں تک سے سیدھے منہ بات کرنے کی روادار نہ رہے۔ وہ ان کے ساتھ یوں پیش آنے لگے گویا ان کے مقابلے میں وہ انتہائی گھٹیا اور کمتر درجے کی مخلوق تھے۔ ان کے بھی

خواہوں اور ہمدردوں نے دبی دبی زبان میں انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کراچی والوں پر آنکھیں بند کر کے اعتبار نہ کریں۔ ان کے متعلق کچھ دیکھ بھال کرلیں۔ لیکن ان کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہوچکی تھیں۔ وہ ان باتوں کو ان کا حسد اور جلاپا قرار دیتے ہوئے ان پر ذرا کان نہ دھرتے۔

اب نیلو کی شادی ہوئی اور ایسی دھوم دھام سے ہوئی کہ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ کھانے پر پاکستانی کھانوں کے علاوہ چینی اور یورپی کھانے بھی پکوائے گئے۔ ضرورت سے زائد دیگیں پکوائی گئیں۔ خوب اسرافِ بے جا کیا گیا۔ جہیز میں لاکھوں کے زیورات، ملبوسات، برتن فرنیچر ہر چیز دی گئی۔ سسرال والوں کو بھی خوب خوب نوازا گیا۔ داماد کو نئی چمچماتی لمبی چوڑی قیمتی کار سونے کی گھڑیاں، کپڑے جوتے جانے کیا کیا تحفے میں دیا گیا۔ شادی کے بعد نیلو کراچی چلی گئی۔ اس کا شوہر ہفتہ بھر بعد امریکہ چلا گیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جلد ہی اسے اپنے پاس بلالے گا۔

شادی کے بعد شیخ سعید اور ان کی بیوی کو نیلو کے بخیر و عافیت کراچی پہنچنے کی اطلاع تو مل گئی۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی خط موصول نہ ہوا۔ یہ ویسے بھی 1967ء کا زمانہ تھا۔ جب موبائل فون وغیرہ عام نہ ہوئے تھے اور دوسرے شہروں سے رابطے کے لیے یا تو خط لکھے جاتے تھے یا ٹرنک کالیں کی جاتی تھیں۔ اسی طرح جب کئی مہینے گزر گئے تو شیخ سعید اور ان کی بیوی کو اندیشہ ہائے دور دراز نے ستانا شروع کردیا۔ ان کی راتوں کی نیندیں اڑنے لگیں۔ انھوں نے نیلو کو بہت خط لکھے۔ ٹیلی گرام بھیجے۔ فون پر رابطے کی کوشش کی مگر نہ تو اس کی طرف سے ایک حرف نہیں موصول ہوا۔ نہ ہی فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ فکر و پریشانی جب حد سے گزرنے لگی تو انھوں نے اپنے بڑے لڑکے رفیق کو نیلو کی خبر لینے کراچی بھیج دیا۔ رفیق جب واپس آیا تو وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ لٹی پٹی نیلو بھی اس کے ساتھ تھی۔

بعد میں جو حقائق سامنے آئے۔ نیلو نے جو اپنی کہانی سنائی تو وہ ایسی لرزہ خیز اور ہوشربا تھی کہ جس جس نے سنا تو بہ استغفار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

نیلو کے سسرالی کراچی والے مسلمان ہونے کے باوجود صرف نام کے ہی مسلمان تھے۔ وہ پوری طرح سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے اور حد درجہ آزادی پسند اور حیاباختہ اور ہر برائی میں گلے گلے غرق تھے۔ اس گھر میں بڑی بے تکلفی سے شراب پی جاتی تھی۔ بے حیائی کے کام کیے جاتے تھے۔ لڑکے کھلم کھلا نت نئی لڑکیاں لاکر ان کے ساتھ شب بسری کرتے تھے۔ لڑکیاں رات رات بھر گھر سے غائب رہتی تھیں۔ ساس سسر کے بھی یہی چلن تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔

سسرال کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر نیلو شدید خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو شدید خطرے میں محسوس کرنے لگی تھی اور جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ وہاں بری طرح سے قید تھی۔ اس کے دیور نندیں اور نوکر چاکر اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ نہ گھر خط لکھ سکتی تھی نہ فون کرسکتی تھی۔ پھر ایک رات اس کے ساتھ وہ کچھ ہوگیا جس سے وہ شروع ہی سے ڈرتی آرہی تھی۔ اس کا ایک دیور شراب کے نشے میں بری طرح سے مخمور ایک رات اس کے کمرے میں گھس آیا اور رشتوں کے تقدس کی دھجیاں اڑگئیں۔

اس نے اپنی بربادی کا حال، اپنے ساس سسر کو سنایا۔ بہت فریاد گریہ وزاری کی لیکن انھوں نے اس پر کوئی کان نہ دھرا۔ الٹا یہ کہہ کر اس کے زخموں پر نمک پاشی کی کہ اس گھر میں یہ معمول کی بات تھی۔ ہر بھائی کو ایک دوسرے کی بیوی اپنے تصرف میں لانے کا حق حاصل تھا۔ (نعوذ باللہ)

اب وہ کیا کرتی؟ اس نے کوشش کی کہ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے خاوند کا پتا ہی مل جائے تاکہ وہ اسے خط لکھے کہ وہ اسے اپنے پاس بلالے۔ لیکن کسی نے اسے اس کا پتا نہ دیا۔ بعد میں اسے اسی دیور نے اسے بتایا کہ اس کا خاوند پہلے ہی سے شادی شدہ تھا۔ امریکہ میں اس کی امریکن بیوی اور دو بچے موجود تھے۔ اس سے اس کی شادی سراسر

لالچ کا نتیجہ تھی۔ اس انکشاف نے بے چاری نیلو کو زندہ درگور کر ڈالا۔ اس کی دن رات روتے گزرنے لگے اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی مگر ہر بار بچالی گئی۔ اگر اس کا بھائی اسے لینے نہ آجاتا تو وہ ضرور اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی۔

اب نیلو کو اس کے خاوند سے طلاق دلوائی گئی۔ معاہدے کے مطابق لاکھوں کا جہیز اس کے خاوند کی ملکیت بن چکا تھا۔ لہٰذا وہ واپس نہ ہوسکا۔ اس المیے نے شیخ رحیم کے گھرانے کی کمر ہی نہ توڑ دی بلکہ اس کی بدنامی اور رسوائی میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لوگوں نے کھلے عام کہنا شروع کر دیا۔ ''غرور کا سر نیچا''

لیکن شاید ابھی اللہ تعالیٰ کو انھیں غرور اور تکبر کی مزید سزا دینا منظور تھا۔

شیخ رحیم کی بڑی بیٹی زہرہ فیصل آباد کے ایک تاجر سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس کے صرف پانچ بیٹے تھے۔ یہ لڑکے بھی اپنے ماموں شیخ سعید کے لڑکوں سے مختلف نہیں تھے۔ دولت کی ریل پیل نے انھیں بھی غلط راستوں پر ڈال رکھا تھا۔ سب سے بڑا لڑکا آصف ہر چند کہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ رقص وسرور کا بے حد شوقین اور پرلے درجے کا عیاش اور بدکردار تھا۔ بازارِ حسن کے چکر اس کا شروع ہی سے معمول چلے آرہے تھے۔ ایک دن وہاں ایک نئی طوائف کے حسن و جمال کا شیرہ ہوا۔ اس کی بھنک اس کے کانوں میں پڑی تو وہ فوراً وہاں جا پہنچا اور اسے دیکھتے ہی ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگیا۔ اس کے عشق کا بھوت اس کے سر پر ایسا ہوا کہ وہ سب کچھ بھلا بیٹھا اس نے پہلے تو اس طوائف پر خوب دولت لٹائی۔ پھر اسے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ طوائف نہ اس میں دلچسپی رکھتی تھی نہ اس سے شادی پر آمادہ تھی۔ اس نے اسے صاف دھتکار دیا۔ اس پر آصف کا دماغ ہی الٹ گیا۔ اس نے پاگلوں جیسی حرکتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس کا پاگل پن ایسا بڑھا کہ اسے مینٹل ہاسپٹل داخل کروانا پڑا۔ یوں اس خاندان نے ایک اور رسوائی کھائی۔

محمد علی جناحؒ

☆ جناح بحیثیت قانون داں عظیم تھے، ایک وقت میں کانگریس کے ممبر کے طور پر بھی عظیم تھے۔ مسلمانوں کے رہنما کے طور پر بھی عظیم تھے۔ عالمی سطح کے سیاست داں اور مدبر کے طور پر بھی عظیم تھے' لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم عملی انسان تھے۔ جناح کی رحلت کے باعث دنیا عظیم ترین مدبرین میں سے ایک اور پاکستان اپنے بانی، فلاسفر اور رہنما سے محروم ہوگیا ہے۔ (مائی برادرز'' مولفہ: محترمہ فاطمہ جناح)

☆ جناح تاریخ کی سب سے زیادہ غیر معمولی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ (جواہر لال نہرو)

☆ میں اپنی زندگی میں جتنے بھی لوگوں سے ملا ہوں، ان میں عظیم ترین جناح ہیں۔ (سر سلطان محمد آغا خان سوم)

☆ جناح صرف ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا میں اس صدی کی ایک انتہائی غیر معمولی شخصیت ہیں۔ (ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو)

حسنِ انتخاب۔ ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

شیخ رحیم جو اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ پے در پے دھچکے برداشت نہ کر سکے اور ایک زبردست حملۂ قلب سے آغوشِ لحد میں جا سوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی بیوی بھی ان کے پیچھے چل دیں۔ شیخ سعید اب دل کے مریض بنے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مظلوم دختر نیلو اور چھوٹی بیٹی کی شادیاں دینی مزاج کے حامل شریف آدمیوں کے ساتھ کر دی ہیں۔ ان کے دونوں لڑکوں رفیق اور شفیق کی دوبارہ کہیں بھی شادیاں نہیں ہوسکیں۔ وہ ویسے کے ویسے آوارہ مزاج عیاش طبع چلے آرہے ہیں۔ علیم کے بیٹے بھی انہی کے رنگ میں رنگے جارہے ہیں۔ اس کی بیٹیاں بھی خوب پر پُرزے سے نکال رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں بہت دور دیکھ رہی ہیں اور آنے والے وقتوں کا ادراک کر رہی ہیں۔ مگر علیم اور اس کی بیوی نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اب یہی بہتر ہے اپنی رہی سہی عزت بچانے کا۔

☆☆☆

ساتویں سچ بیانی

اکیلی عورت

سیمیں غزالہ نیہاں

آج بھی اس معاشرے میں اکیلی عورت کے شکار کے لیے بھیڑیے گھات لگائے رکھتے ہیں



''ضرورت ہے ایسی خواتین کی جو پڑھی لکھی ہوں اور لکھنے کے کام سے دلچسپی رکھتی ہوں...... معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ کام گھر پر بھی دیا جاسکتا ہے۔''

اتوار کے اخبار میں اس اشتہار کو پڑھ کر...... ان کو ایسا لگا کہ جیسے یہ اشتہار ان ہی کے لیے شائع ہوا ہے۔ وہ پڑھی لکھی بھی تھیں اور لکھنے سے دلچسپی بھی رکھتی تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں اخباروں اور بچوں کے رسالے میں بچوں کی کہانیاں اور مضامین لکھتی تھیں۔ جو پڑھنے والوں میں خاصے مقبول تھے۔ طالب علمی کے دور کے بعد جب پریکٹیکل لائف میں آئیں تب بھی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ شادی کے بعد بچوں اور گھر بار میں الجھ کر یہ سلسلہ رک گیا۔ پھر جب اسکول میں جاب کرنے لگیں تب بھی بچوں کو مضامین، تقاریر وغیرہ لکھنے میں مدد دینے لگیں۔ اخباروں اور رسالوں میں بھی مضامین چھپنے لگے۔ مگر جب ان کو اس کا معاوضہ نہیں ملا تو انھوں نے چھوڑ دیا۔ اشتہار پڑھ کر وہ پھر لکھنے لکھانے پر تیار ہو گئیں۔ ویسے بھی وہ آج کل صاحب فراش تھیں۔

مسز شاہینہ احمد آج کل بہت پریشان تھیں۔ ان کے شوہر احمد صاحب کا ایک حادثے میں دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی پرائیویٹ جاب تھی اس لیے پنشن کا بھی سہارا نہیں تھا۔ خود شاہینہ بیگم بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں معلمہ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ مگر شوہر کے حادثے کے بعد ان کی تیمارداری کی وجہ سے وہ اپنی جاب چھوڑ چکی تھیں۔ پھر شوہر کے انتقال اور عدت کی مدت کے دوران ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب دوبارہ جاب کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر میں بچوں اور شوہر میں مصروف تھیں۔ جبکہ بیٹا جس کو انھوں نے بڑی مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھا کر پڑھنے کے لیے بیرون ملک بھیجا تھا۔ وہ ایسا گیا کہ پلٹ کے پھر ماں باپ کی خبر بھی نہ لی۔ حتیٰ کہ باپ کے ایکسیڈنٹ اور انتقال کا سن کر بھی نہ آیا نہ تسلی کے دو بول ہی کہے۔

اس نے وہیں کسی گوری سے شادی کر لی تھی اور اس گوری نے اس پر ایسا جال بنا تھا کہ وہ ماں باپ کا نام تک نہیں لے سکتا تھا دراصل اس کی بیوی کو یہ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



خطرہ تھا کہ وہ ماں باپ سے مل کر اس کو چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ کیونکہ اکثر پاکستانی لڑکے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اب وہ اپنی بیوی کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ شاہینہ بیگم تنہا رہ گئی تھیں۔ کچھ دنوں تک تو جمع کیا ہوا خرچ ہوتا رہا۔ مگر جب بینک بیلنس بالکل ختم ہونے پر آ گیا تو ان کو اپنی آئندہ زندگی کے لیے سوچنا پڑا۔

اخبار میں چھپے اشتہار کو پڑھ کر وہ ان کو فون کر کے معلومات حاصل کرنے کا سوچنے لگیں۔

اشتہار میں دیے ہوئے فون نمبر پر رنگ کر کے ان سے جاب کے متعلق پوچھا تو...... انھوں نے بتایا کہ سائنس کے مضامین کے پریکٹیکل جنرل لکھنے کا کام ہے۔ جس کا معاوضہ فی جنرل سو روپے ملے گا۔ اور اگر ڈائگرام بھی بنائیں گی تو فی جنرل ایک سو پچیس روپے ملیں گے۔

وہ سائنس میں بی ایس سی کی ڈگری رکھتی تھیں اور جاب کے زمانے میں سائنس کے مضامین ہی پڑھاتی تھیں۔ اور بچوں کو فزکس کیمسٹری کے پریکٹیکل بھی کرواتی تھیں۔ انھیں یہ کام آسان لگا۔ وہ دو سے تین جنرل تو آسانی سے بنا سکتی تھیں۔ ان کی عمر تریسٹھ سال تھی مگر وہ فزیکلی فٹ تھیں۔ اپنی عمر سے دس پندرہ سال کم کی لگتی تھیں۔ دبلی پتلی اسمارٹ تھیں اور ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کی عادی تھیں اگر دو جنرل بھی روزانہ بنائیں تب بھی تقریباً سات آٹھ ہزار مل جاتے۔

اس طرح ان کو مصروفیت کے ساتھ آمدنی کا ذریعہ بھی مل رہا تھا۔ انھوں نے آفس فون کر کے ان کا مطلوبہ معیار پوچھا تو ان کو جواب کافی حوصلہ افزا ملا۔ کوئی حافظ صاحب تھے جنھوں نے ان کو کام کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اپنا ایڈریس دے دیں میں آپ کو گھر پر کام سمجھا دوں گا۔

شاہینہ بیگم نے ان کو گھر میں بلانا مناسب نہیں سمجھا اس لیے بولیں کہ پہلے آپ مجھے اپنے آفس کا ایڈریس بتا دیں میں خود آ کر آپ سے

کام سمجھ لوں گی۔"

وہ گھر میں تنہا رہتی تھیں۔ بے شک پختہ عمر کی تھیں مگر بہر حال ایک عورت تھیں وہ بھی بیوہ۔ انھیں مناسب نہیں لگا کہ تنہا گھر میں کسی غیر محرم سے ملاقات کریں۔ تاہم ان کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ حافظ ہیں۔ تو یقیناً شریف انسان ہوں گے۔

اسی رات کو ان کے موبائل پر میسیج آیا کہ آپ کو شوہر کی طرف سے آفس آنے کی اجازت ہوگی۔

بس یہیں پر تو شاہینہ بیگم سے غلطی ہوگئی یا سادگی میں انھوں نے یہ بتا دیا کہ اول تو میرے شوہر حیات نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تبھی تو مجھے لکھنے پڑھنے کے کام سے منع نہیں کرتے۔

اس کے بعد ان حافظ صاحب کا میسیج آیا کہ میرا آفس چوتھی منزل پر ہے۔ آپ سیڑھیاں چڑھ سکیں گی۔

انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ سکتی ہوں۔

دوبارہ پھر انھوں نے میسج کیا اور پوچھا کہ آپ سلم ہیں یا بھاری جسم کی۔

شاہینہ بیگم کو بڑی حیرت ہوئی کہ ایسا سوال کیوں کیا۔ مگر پھر انھوں نے سوچا کہ شاید اس لیے پوچھ رہے ہوں کہ اس عمر میں عورتیں بھاری بھرکم ہو جاتی ہیں۔ اور چلنے پھرنے اور سیڑھیاں چڑھنے میں مشکل ہوتی ہے۔

اس بات کا بھی انھوں نے مختصر جواب دیا کہ "مجھے کوئی پرابلم نہیں۔"

انھوں نے پھر میسیج کیا کہ میرا آفس صدر کے علاقے میں ہے آپ کس علاقے میں رہتی ہیں۔ آپ کو آنے میں مشکل تو نہیں ہوگی۔ شاہینہ بیگم نے اپنے علاقے کا نام بتایا اور کہا کہ وہ صدر کے علاقے میں آسانی سے آ سکتی ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے آفس کا پتا Send کر دیا۔ شاہینہ بیگم نے کہا کہ میں آنے سے پہلے آپ کو فون کرلوں گی۔ دوسرے دن انھوں نے اپنے ایک جاننے والے کے بچے کو ساتھ لیا اور آفس جانے کے لیے تیار ہوئیں اور گھر سے نکلنے سے پہلے دفتر فون کیا تو ان حافظ صاحب نے جواب دیا۔ میں اس وقت آؤٹ ڈور کام سے نکلا ہوں۔ اور آپ کے علاقے میں آ رہا ہوں آپ مجھے پتا بتایئے تو میں آپ کے گھر آ کر بات کر لیتا ہوں۔

شاہینہ بیگم کو بہت عجیب لگا کہ وہ بار بار گھر پہ آنے کو کیوں کہہ رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں آپ کو گھر پہ نہیں بلا سکتی۔ اور آفس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسی دن شام کو پھر ان کا فون آیا کہ میں آپ کے علاقے میں فلاں پارک میں ہوں۔ اگر آپ یہاں آ سکتی ہیں تو آ کر بات کر لیں۔

شاہینہ بیگم یہ سوچ کر پارک میں جانے کو تیار ہوگئیں کہ اول تو وہ ان کے گھر کے قریب تھا۔ اردگرد کے سب لوگ ان کو جانتے تھے۔ اس پارک میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ پھر ان کو خود پر بھی اعتماد تھا۔ وہ کوئی بچی تو تھیں نہیں۔ عام طور پر وہ برقعہ اس وقت پہنتی تھیں جب کہیں انجان جگہ پر اکیلے جانا ہوتا تھا۔ ورنہ وہ چادر لیتی تھیں۔ مگر آج انھوں نے یہ سوچ کر برقعہ لے لیا کہ وہ حافظ ہیں، اور ان کے سامنے بے پردہ جانا مناسب نہیں ہوگا۔ پارک کے قریب پہنچ کر ان کو فون کیا تو جواب ملا میں گیٹ پر کھڑا ہوں اور اپنی نشانی بتائی کہ میں اس کلر کے کپڑوں میں ہوں۔

شاہینہ بیگم نے دیکھا کہ پارک کے گیٹ پر ایک صاحب موٹر سائیکل لیے کھڑے ہیں۔ داڑھی تو ان کی بے شک تھی مگر نجانے کیوں ان کو کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا۔ حافظ قرآن کے چہرے پر ایک نور ہوتا ہے۔ وہ انھیں محسوس نہیں ہوا۔

بہر حال جب وہ یہاں تک آ ہی گئی تھیں تو بات کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ ان کے ساتھ پارک کے اندر آ گئے اور ایک بینچ پر بیٹھ کے ان کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ ان کے ساتھ بیٹھیں نہیں بلکہ کھڑی رہیں، تو انھوں نے جنرل کے لکھنے کے کام

کے بارے میں سمجھایا۔ کام تو شاہینہ بیگم کی سمجھ میں آ گیا۔ مگر وہ بندہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے انھوں نے کہا۔ ٹھیک ہے میں آپ کو سوچ کر جواب دے دوں گی فون پر۔ اتنا کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑیں تو انھوں نے کہا آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ میرے پاس بائیک ہے۔ شاہینہ بیگم کو بڑا عجیب لگا۔ انھوں نے سختی سے جواب دیا۔

''میں آپ کے ساتھ بائیک پر کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ ایک غیر محرم شخص کے ساتھ۔''

''آپ مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کر رہی ہیں؟'' حافظ صاحب بولے۔

''میں کسی غیر محرم شخص پر اعتماد نہیں کر سکتی۔''

''اچھا میرا ایک اور کاروبار ہے اس میں آپ میرے ساتھ کام کریں تو آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔'' انھوں نے کہا۔

''وہ کیا؟''

میں شادیاں بھی کرواتا ہوں۔ اس کا معاوضہ میں ایک لاکھ لیتا ہوں۔ آپ کو میں ففٹی پرسنٹ دوں گا۔''

''اول تو کوئی ایک لاکھ نہیں دے گا۔ پھر آپ مجھے ففٹی پرسنٹ کیوں دیں گے؟'' شاہینہ نے سختی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں سیکنڈ میرج کرواتا ہوں۔ بڑے بڑے زمین دار اور دولت مند لوگ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں۔ وہ لڑکیاں غریب گھرانے کی مگر خوب صورت ہوتی ہیں۔ اور دولت کے لیے بڑی عمر کے مرد سے شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ پہلی بیوی اور گھر والوں سے چھپ کر شادیاں کرتے ہیں اسی لیے منہ مانگی رقم معاوضے میں دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔'' انھوں نے تفصیل بتائی۔

''ان لڑکیوں کے گھر والے کیسے تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنی کم عمر بیٹیوں کی شادی بڑی عمر کے لوگوں سے کرنے کے لیے؟'' شاہینہ بیگم نے پوچھا۔

''دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ویسے

مٹی کے رنگ

جہانِ خاک کی پہچان، اسم ہے گویا
ہزار طرح کا جس میں طلسم ہے گویا

ہم اپنے آپ سے گزرے تو یوں ہوا محسوس
حدودِ جسم سے آگے بھی جسم ہے گویا

قاضی حبیب الرحمان

زیادہ تر لوگ خود سامنے نہیں آتے بس دولت کی جھلک دکھا کر۔ رشتہ طلب کرتے ہیں۔ وہ کسی کو درمیان میں ڈال کر بات کرواتے ہیں۔ بعض اوقات لڑکیاں خود اپنے والدین کی اجازت کے بغیر۔ بڑے لوگوں سے شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اپنے آفس میں ان کا نکاح کروا دیتے ہیں۔'' انھوں نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

''یہ تو سراسر دھوکہ ہوا۔'' انھوں نے کہا۔

''وہ لڑکیاں خود خوشی سے تیار ہو جاتی ہیں۔'' بڑے اطمینان سے جواب ملا۔ ''آپ کا کام صرف یہ ہوگا کہ آپ لڑکیوں کو فون کر کے بلوائیں گی اور ان کی ملاقات ان لوگوں سے کروائیں گی جو شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنا نام بدل کر فون کریں۔ اور میرے آفس میں بلوائیں یا اپنے گھر پر۔ یا کسی پارک وغیرہ میں۔ اس کام کے آپ کو پچاس ہزار ملیں گے۔ اور ایسی شادیاں مہینے میں کم از کم دو یا تین تو ضرور ہوتی ہیں۔'' انھوں نے لالچ دیا۔

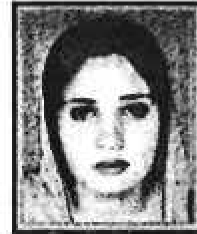
شاہینہ بیگم سمجھ گئیں کہ ان کا فراڈ کاروبار ہے۔ وہ یقیناً جعلی شادیوں کے نام پر لڑکیاں سپلائی کرتے ہوں گے۔ اور ان کو بے وقوف سمجھ کر پیسوں کا لالچ دے کر پھانس رہے ہیں۔ انھوں نے سوچ لیا کہ وہ ان کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ جنرل لکھنے والا کام بھی نہیں کریں گی۔ ان کی چھٹی حس ان کو خبردار کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کو فون پر بتادوں گی۔"
انھوں نے کہا اور جلدی سے جانے کے لیے پلٹ گئیں۔
"چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔" حافظ صاحب بھی اٹھتے ہوئے بولے۔
"میں کسی غیر محرم کے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتی۔" انھوں نے سختی سے جواب دیا۔ اور جب تک وہ بائیک اسٹارٹ کر کے چلے نہیں گئے وہ یونہی دوسری گلی میں مڑ گئیں۔ یہ اطمینان کر کے کہ وہ چلے گئے ہیں۔ جلدی سے رکشہ کر کے گھر آ گئیں۔
اس رات کو کافی لیٹ نائٹ ان کے موبائل پر حافظ کا تفصیل سے میسج آیا۔ جس میں انھوں نے لکھا۔ "آپ بہت خوب صورت اور اسمارٹ ہیں۔ آپ کی گفتگو کا انداز بہت اچھا ہے۔ آپ بہت بااخلاق ہیں۔ آپ کا سراپا بہت متاثر کن ہے۔ یقیناً آپ نے اپنی عمر زیادہ بتائی ہے آپ اتنی عمر کی لگتی نہیں۔ آپ میرے ساتھ ضرور کام کریں۔ مجھے اپنے آفس کے لیے ایسی ہی بولڈ اور پرکشش خاتون کی ضرورت ہے۔ جو اپنی گفتگو سے سامنے والے کو متاثر کر سکتی ہوں۔ آپ مجھ سے دوستی کر لیں۔"
انھوں نے ان کی خوب صورتی کی خوب تعریفیں لکھ کر کچھ نازیبا اور غیر اخلاقی الفاظ بھی لکھے۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ عورتیں اپنی تعریف سن کر خوش ہو جاتی ہیں اور آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہیں۔ یا پھر انھیں بیوہ جان کر ان کو اپنے دام میں پھنسا رہے تھے۔ مگر شاید انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہر عورت اتنی بے وقوف نہیں ہوتی۔ باکردار اور تنہا عورت بھی اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ اور کوئی ان کو آسانی سے فریب نہیں دے سکتا۔ عورت اگر بااعتماد ہو تو چٹان سے زیادہ سخت اور فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ کوئی لالچ، کوئی فریب اُن کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایسی عورت کانچ کی گڑیا ہونے کے باوجود اپنی عصمت کی حفاظت بھی جانتی ہے۔ یہ صنف نازک اور ناقص العقول وجود، انسان نما بھیڑیوں سے بچنا بھی جانتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت کسی بھی عمر میں محفوظ نہیں۔ انسانوں کے جنگل میں بھیڑیے نما انسان۔ ہر وقت اپنے شکار پر جھپٹنے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مگر باکردار اور باعصمت عورت آہنی وجود بن کر ایسے درندوں سے خود کو بچا لیتی ہے۔
انھوں نے میسج کے جواب میں لکھا۔
"حافظ صاحب اگر واقعی حافظ ہیں تو کم از کم آپ کو اپنا وقار رکھنا چاہیے تھا۔ میں آپ کا یہ میسج اپنے بیٹے کو دکھا رہی ہوں۔ اب وہی آپ سے بات کرے گا۔" یہ لکھ کر انھوں نے اس سم کو اپنے موبائل سے نکال کر پھینک دیا۔
وہ صاحب پتا نہیں حافظ بھی تھے یا صرف اپنے نام کے ساتھ حافظ لگایا ہوا تھا۔ جو کوئی بھی تھے۔ اللہ کے خوف سے بے نیاز تھے۔ وہ شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ اوپر بھی کوئی ہستی ہے جو ان کے ایک ایک فعل کو دیکھ رہا ہے اور ابھی رسی بھی دراز کی ہوئی ہے۔
اس کے ساتھ وہ بھی سوچ رہی تھیں کہ عورت چاہے کسی بھی عمر کی ہو محفوظ نہیں اس دنیا میں اکیلی عورت کا رہنا کتنا مشکل ہے۔ ہر قسم پر دھوکہ اور فریب کا سامنا ہے۔
شاہینہ بیگم تو بولڈ اور سمجھ دار تھیں جنھوں نے اس فریب سے خود کو بچا لیا۔ اللہ نے ان پر کرم کیا کہ وہ برائی کے چنگل میں پھنسنے سے بچ گئیں۔ ورنہ عورتیں باآسانی بے وقوف بن جاتی ہیں۔ اور لالچ میں آ کر بڑی مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ جس سے نکلنا محال ہوتا ہے۔
اس لیے ہر عورت کو خصوصاً تنہا اور بیوہ عورتوں کو تو بہت سوچ سمجھ کر آنکھیں کھول کر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے۔
سب سے بڑی بات یہ کہ صرف اللہ سے مدد مانگنی چاہیے اور اس پر مکمل بھروسہ کرنا چاہیے۔ شاہینہ بیگم ایک عبادت گزار اور اللہ پر مکمل اعتماد کرنے والی تھیں۔ اس لیے اللہ نے ان کو بڑی مصیبت سے بچا لیا۔

☆☆☆

آٹھویں سچ بیانی

اصلی چہرہ



نادیہ ملک

اُس قاتل حسینہ کی انوکھی داستان، جو ہمیشہ اپنا اصل چہرہ میک اَپ میں چھپا کر رکھتی تھی

خواتین کی جیل کے شروع حصے میں بنی کوٹھری میں بیٹھی وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنے میں مگن تھی۔ اچانک ہی کوٹھری کا آہنی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو اس نے کتاب سے نظر ہٹا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک خاتون راہبہ اس کوٹھری میں داخل ہو رہی تھی۔ کتاب کا مطالعہ کرنے والی قیدی عورت نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور پھر کتاب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔

آخری ملاقات کیلئے آنیوالی خاتون راہبہ اس کی کوٹھری میں داخل ہو کر رُک گئی تھی۔ غالباً وہ اس قیدی عورت کی بے اعتنائی پر متحیر سی رہ گئی تھی جیسے سوچ رہی ہو کہ اب وہ کیا کرے؟ راہبہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بائبل دوسرے ہاتھ میں منتقل کی اور ایک بار پھر اُمید بھری نگاہوں سے قیدی عورت کی طرف دیکھنے لگی جو ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ مطالعہ میں مشغول ہو گئی تھی۔

راہبہ کے چہرے پر تقدس کی لہر دوڑ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ میں عورت کیلئے محبت اور رحم کے جذبات بھی موجود تھے۔ یہ ایک خاصا گرم دن تھا، وہ تیز دھوپ میں چل کر آئی تھی اور اس کے اوپری ہونٹ اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ وہ کوٹھری کے اس خشک ماحول میں کسی پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑی خاموشی سے اس قیدی عورت کو دیکھے جا رہی تھی اور پھر دفعتاً ہی اس قیدی عورت کے بارے میں کچھ سوچ کر وہ تھرتھرا سی اُٹھی۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھی اور قیدی عورت کے بالکل قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس کرسی کے قریب جہاں وہ مطالعہ کر رہی تھی۔

قیدی عورت نے جب یہ محسوس کر لیا کہ اب اس سے مخاطب ہونے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے تو اس نے جھنجھلانے کے انداز میں کتاب بند کر کے سامنے پڑے واحد پلنگ پر پٹخ دی اور راہبہ کی طرف بڑی خشک اور سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ آخر اب مجھے مزید پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر جب راہبہ اس کی استفسارانہ نظروں کو نظر انداز کر کے خاموش کھڑی رہی تو پھر اسے اپنی زبان کھولنی ہی پڑی۔

''کیا بات ہے؟ تم میرے پاس کس لئے آئی ہو؟''

اس کے لہجے میں بہر حال ناراضی اور برہمی کا

عنصر شامل تھا۔

"میں یہاں تمہیں سکون پہنچانے کی غرض سے آئی ہوں۔ تمہارے ذہنی بوجھ کو ہلکا کرنے کی غرض سے آئی ہوں۔ تمہیں ذہنی اور قلبی سکون بہم پہنچانے آئی ہوں۔"

راہبہ نے تلے الفاظ میں ایسی روانی سے بول رہی تھی جیسے اسے یہ جملے دہراتے دہراتے ایک طویل عرصہ ہو گیا ہو۔ ان سنگین دیواروں اور دہشت زدہ ماحول سے جیسے اس کی خاصی پرانی شناسائی ہو۔

قیدی عورت یہ سن کر آہستہ سے کرسی سے اُٹھی اور آہنی پلنگ پر جا کر بیٹھ گئی۔

"میں پرسکون ہوں۔۔۔۔۔ بے حد پرسکون بلکہ مجھے یہ کہنے میں قطعی کوئی عار نہیں کہ اس سے قبل مجھے کبھی ایسا سکون میسر نہ ہو سکا تھا۔ میں ہر قسم کے ذہنی فکر سے آزاد ہو گئی ہوں اور ظاہر ہے کہ قلبی سکون ذہنی سکون کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر کسی کو ذہنی سکون میسر ہو جائے تو اسے اپنے آپ قلبی سکون بھی میسر آ جاتا ہے۔" وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔

"اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں جتنا سکون خود کو دے سکتی ہوں اتنا سکون کوئی اور مجھے دینے کا دعویٰ بھلا کس طرح کر سکتا ہے؟"

نووارد خاتون کی آنکھوں میں پہلے حیرت سی اُبھری اور پھر وہ مجسم پھیل گئیں۔ چہرے کے تاثرات نے اس کے حقیقی نقش و نگار میں خاصی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اچانک اسے کسی غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہوا۔ اس نے اپنی اُلجھن کے تاثرات چہرے سے ہٹانے کی کوشش کے طور پر بائبل کھولی اور ورق اُلٹنے لگی۔ غالباً وہ کسی موزوں آیت کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔

قیدی عورت راہبہ کی متوحش حالت پر مسکرائی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ راہبہ کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ وہ ایک عام عورت سے ہٹ کر خصوصیت رکھنے

والی عورت کے پاس جا رہی ہے ورنہ یوں حواس باختہ ہو کر بائبل کی ورق گردانی نہ کرتی۔ اس نے اپنے کھلے بالوں کو ایک خاص انداز میں جھٹک دیا تو وہ اس کی پشت سے لہرا کر اس کے دائیں شانے پر پھیل گئے۔ پھر وہ پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے نپے تلے انداز میں جیل کی کوٹھری کے سنگی فرش پر ٹہلنے لگی۔

وہ کوئی ایسی عورت نہیں تھی کہ اس کے چہرے کے نقش و نگار خوبصورت کہلائے جا سکتے۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا بجھا بجھا پن سا تھا اور جوانی کا دور ہونے کے باوجود چہرے پر باریک باریک جھریوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں خاصی دراز تھیں اور آنکھیں بھی بڑی، مگر سرخ سرخ۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کئی رتجگوں کا شکار ہو کر آنکھیں خون آلود ہو گئی ہوں یا خلا میں کسی غیر مرئی شے کو مسلسل ڈھونڈتے رہنے سے چہرے کا تمام خون آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ وہ چند لمحے کی اس چہل قدمی کے بعد راہبہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ اس انداز میں جیسے وہ راہبہ کی آنکھوں میں اُتر کر اس کے من کا حال پڑھنا چاہتی ہو۔

''میرا خیال' میرا مشاہدہ اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ۔۔۔۔'' ایک لمحے کو رُک کر اس نے راہبہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔

''تم ایک پُر تجسس قسم کی عورت ہو۔ تم اپنے تجسس کو تسکین پہنچانے کی خاطر یہاں آئی ہو اور یہ ایک بیمار نسوانی خواہش کا ایک انداز ہے۔ ایک ایسی عورت کی آرزو جس کے احساسات اور جذبات کا قدم قدم پر گلا گھونٹا گیا ہو اور جسے ان جذبوں اور احساسات کا اظہار کرنے کیلئے کسی ذریعہ کی ضرورت ہو۔ براہِ کرم مجھ سے بحث مت کرنا۔''

اس نے جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر راہبہ کو ٹوکا کیونکہ راہبہ اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ ان حالات میں میں خود بھی یہ ہی طرزِ عمل اختیار کیے بغیر نہ رہتی لیکن میں نے۔۔۔ کوئی جرم نہیں کیا۔''

قیدی عورت کے انداز میں بے پناہ خود اعتمادی تھی۔ وہ کوئی ایسی چٹان لگ رہی تھی جو انتہائی مضبوطی سے جمی ہوئی ہو۔ اس نے ایک نظر پھر راہبہ پر ڈالی اور کہنے لگی۔

''تم تو یہاں بوجھ ہلکا کرنے آئی تھیں۔ مجھے سکون عطا کرنے کا ارادہ لے کر آئی تھیں مگر یقین کرو تمہاری آمد سے میرا ذہنی سکون غارت ہو چکا ہے۔ کچھ عرصہ قبل جو کچھ ہو چکا ہے میں اس کی یاد اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری آمد کا مقصد میرے لئے بہت اہم ہے چنانچہ میں تمہارے آگے اپنی کتابِ ماضی کے چند اوراق کی ورق گردانی ضرور کروں گی۔''

قیدی عورت نے پہلو بدلتے ہوئے راہبہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ راہبہ ایک دم چونک اُٹھی۔ وہ اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس کی نظر قیدی عورت کے اذیت آمیز چہرے پر اُٹھ گئی۔ جہاں درد و غم کی پرچھائیاں بُری طرح ایک دوسرے میں مدغم لہرا رہی تھیں۔ چہرے کے اس تاثر نے راہبہ کو مجبور کر دیا کہ وہ بجائے اپنا ہاتھ چھڑانے کے اس مظلوم قیدی عورت کے ہاتھ کو گرم جوشی سے دبا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا جیسے وہ اسے تسلی دینا چاہتی ہو۔ ٹھنڈے پسینے جیسی بو جیل کی دیوار کے پتھروں سے پھوٹ کر کوٹھری کی فضا میں پھیل رہی تھی۔ جیل کی کسی دور افتادہ کوٹھری سے کسی اور قیدی عورت کی ہسٹریائی کی چیخوں نے ماحول کو اور پراگندہ کر دیا تھا۔

''تقریباً چھ ماہ قبل میرا چہرہ نرم، سفید اور گلابی ہوا کرتا تھا۔'' ایک طویل گہری سانس لینے کے بعد قیدی عورت نے روداد شروع کی۔

''میری آنکھوں کی گہرائی کے آگے جھیل شرمگوں ہو جاتی تھی۔ شدید جذبۂ الفت نے میری آنکھوں کو ایک ایسی ساحرانہ چمک عطا کر دی تھی کہ جو دیکھتا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میرے مہکتے بال ریشم جیسے نرم و

ملائم ہوا کرتے تھے جنہیں میں عموماً کھلے رکھتی تھی مگر اب میری آنکھیں اشک بہا بہا کر خشک ہو گئی ہیں اور میرے ریشمی بال ببول کی سوکھی شاخوں کے کانٹوں کی طرح کھردرے ہو چکے ہیں۔ میرے ہاتھ۔۔۔۔۔"

اس نے اپنے ہاتھ کو پھیلا کر دیکھا اور دیوانوں کی طرح مٹھی بنا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر دے ماری۔

"آہ۔۔۔۔! یہ سب کچھ آرٹیفیشل تھا' مصنوعی تھا۔ میرا حسن میک اَپ کا مرہونِ منت تھا۔ میں سرخی پاؤڈر، کریم اور قیمتی غازے کا چلتا پھرتا اشتہار تھی۔ میرے پاس میک اَپ کا پورا سامان ہوا کرتا تھا اس کے علاوہ بھی میرے پرس میں ہمہ وقت یہ تمام اشیاء ہوا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ ریشمی بالوں کی بیش قیمت وِگ بھی میں ساتھ رکھا کرتی تھی۔ میک اَپ کے ان ہتھیاروں سے لیس ہو کر میں بے حد جاذبِ نظر ہو جاتی تھی جبکہ میک اَپ سے عاری چہرہ بے کیف و بے کردار ہوتا تھا۔ بالکل ایسا جیسا کہ اب تم دیکھ رہی ہو۔ بے کشش، بے جاذب' یہ اپنی دانست میں میرا اپنے دوستوں کے ساتھ ایک مذاق تھا۔ ایک عظیم مذاق۔۔۔۔۔ ایک تلخ مذاق۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ اگر کبھی میرے دوست ہمہ وقت میری دوستی کا دم بھرنے والے دوست میرا حقیقی میک اَپ سے عاری چہرہ دیکھ لیں تو ان کے دلوں پر کیا بیتے گی؟"

اس نے استہزائیہ انداز میں ایک قہقہہ لگایا اور کوٹھری میں پھیلی ہوئی عجیب قسم کی وحشت اس قہقہے سے مزید گہری ہو گئی۔

"اور پھر مجھے کسی سے محبت ہو گئی۔ مجھے کوئی چاہنے لگا تو پھر یہ مصنوعی حسن میرے لئے عذاب جاں بن کر رہ گیا۔ میں آئینے میں اپنا مصنوعی چہرہ دیکھتی تو کانپ کانپ جاتی۔ مجھے غازہ، کریم اور پاؤڈر کی تہوں کے اندر چھپا اپنا اصلی چہرہ نظر آنے لگتا' بے کیف ونزار چہرہ۔۔۔۔! اور پھر میں نے سوچا کہ شادی کی رات جب میرا محبوب میرا چہرہ دیکھا گا تو اس پر کیا بیتے گی؟ میک اَپ سے عاری چہرہ دیکھ کر وہ تو مبہوت رہ جائیگا۔ وہ جس چہرے کی دلکشی کا دیوانہ ہے اسے جب یہ معلوم ہوگا کہ محض ایک دھوکہ تھا تو کیا ہوگا؟

اس خیال نے مجھے کچوکے لگانے شروع کر دیے اور پھر میں جس اذیت سے دوچار ہونے لگی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ یہ اذیت ناک خیال مجھے شدت سے کھلنے لگا کہ میری شخصیت متاثر ہونے لگی تھی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ اپنے محبوب پر اس حقیقت کا انکشاف کر دوں مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرا محبوب پرکشش جسم اور نسوانی حسن پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک نسوانی حسن ہی سب کچھ تھا۔ میں سوچوں کے انگاروں پر لوٹتی رہی اور اس عذابِ جان سے گزرتی رہی۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل میں نے ایک بار پھر اس صورتحال کا جائزہ لیا اور اپنے طور پر اندازے لگائے اور ان اندازوں کی روشنی میں مَیں نے ایک فیصلہ کیا۔ ایک حقیقت پسندانہ فیصلہ یا پھر خود غرضانہ فیصلہ۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خودکشی کر لوں۔ مجھے دھواں دھائیں کرنے والے اسلحہ سے ہمیشہ سے خوف آتا تھا مگر اس روز میں اپنے ڈیڈی کے دراز میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال ہی لائی اور اپنے کمرے میں آ کر خودکشی کرنے کیلئے تیار ہو گئی۔

میں نے ریوالور کی نال اپنی کن پٹی پر رکھ دی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ کن پٹی پر فائر کرنے سے انسان فوری موت کا شکار ہو جاتا ہے بغیر کسی خاص تکلیف سے یا پھر دل پر فائر کرنے سے۔ مگر دل کی پوزیشن کے متعلق مجھے پورا یقین نہ تھا۔ ٹرائیگر دبانے سے ایک لحہ پہلے میری چشمِ تصور نے مجھے ایک تابوت میں لیٹے ہوئے دیکھا جو اپنے حقیقی چہرے بے کیف' بے کردار چہرے کے ساتھ تابوت میں پڑی تھی اور تب مجھے خیال آیا کہ تدفین سے قبل نہلا دھلا کر کفن پہنایا جائے گا تو میرا میک اَپ دھل کر میرے چہرے کے بھدے خدوخال، نقش ونگار سب کی نظروں میں آ جائیں گے۔ میرا محبوب مجھے

جب اس بھدے چہرے کے ساتھ دیکھے گا تو اسے دنیا کی تمام عورتوں سے نفرت ہو جائے گی اور باقی ماندہ زندگی ایک زندہ لاش کی مانند گزارنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میری قربانی ضائع ہو جائے گی اور پھر یہ خیال آتے ہی ایک کمزور اور بیمار کر دینے والی مایوسی مجھ پر اثر انداز ہونے لگی۔ تب میں نے خودکشی کا ارادہ ملتوی کر کے کہیں دور چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

ایسی جگہ جہاں کوئی واقف کار نہ ہو' آشنا نہ ہو' شناسا نہ ہو' سب اجنبی ہوں۔ اجنبیوں کے درمیان اجنبی بن کر زندگی گزارنا چاہتی تھی چنانچہ میں نے ریوالور کو لبادے میں چھپایا اور واپس ڈیڈی کے میز کی دراز میں رکھنے کیلئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ لیکن ڈیڈی کے کمرے تک پہنچی نہ تھی کہ ایک ستون کی آڑ سے میرے منگیتر نے نکل کر پیچھے سے مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑ لیا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ میں اس وقت میک اَپ سے عاری اپنے بھدے چہرے کے ساتھ اس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ جوں ہی وہ مجھے گھما کر میرا چہرہ اپنے سامنے لایا میرا ہاتھ لبادے میں چھپے ریوالور پر مضبوطی سے جم گیا اور اس سے پہلے کہ وہ میرا حقیقی نفرت انگیز چہرہ دیکھ کر خوف سے چیخ اُٹھتا۔ میری منحوس شکل دیکھ کر نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیتا۔ میں نے غیر ارادی طور پر ریوالور کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا اور دیوانہ وار دباتی چلی گئی۔''

قیدی عورت کے چہرے پر جنونی کیفیت عود کر آئی تھی۔ اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا تھا۔ راہبہ نے یہ دیکھا تو اس کے منہ سے خوف زدہ سی چیخ نکل گئی۔ اس وقت قیدی عورت کو بھی اپنی وحشیانہ حالت کا ادراک ہو گیا۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں راہبہ سے کہا۔

''پہلے تو میں سکتے کے سے عالم میں رہ گئی پھر جونہی مجھے اِدراک ہوا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ بے اختیار میرا ریوالور والا ہاتھ اُٹھا' میرا ارادہ تھا کہ باقی گولیاں میں اپنے سر میں اُتار لوں اور میں نے جونہی اس ارادے سے ہاتھ اُٹھایا کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پکڑ میں بے بس کر دی گئی۔ یقین کرو میرا ارادہ خود کو بھی شوٹ کر لینے کا تھا کیونکہ اب مجھے یہ فکر نہیں رہی تھی کہ دفن کے وقت میرا چہرہ کیسا نظر آتا ہے؟''

وہ چپ ہو گئی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برس رہی تھی۔ وہ چٹان جیسی عورت اب باقاعدہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

چرچ سے آنیوالی راہبہ جو اس کو سکون بہم پہنچانے کی غرض سے آئی تھی ایک عالم بے سکون میں کھڑی ہو کر اس عورت کو تک رہی تھی۔ اچانک راہداری میں محافظ کے قدموں کی آواز گونجنے لگی تو راہبہ چونکی۔ اس کے ساتھ قیدی عورت نے بھی آنسو پونچھ کر اپنا سر اُٹھایا۔

''تم نے دیکھا بعض معاملات کس طرح خود بخود سلجھ جاتے ہیں۔'' قیدی عورت نے سرد آہ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔۔۔۔'' راہبہ نے جواب دیا۔ اب اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''لیکن میں نے اپنے مصنوعی حسین چہرے کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ چند روز بعد جب اسے میری بدصورتی کا علم ہوا تو اس نے مجھے دھتکار دیا۔'' اس کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔

''وہ میرے جذبوں کا خون کرنے کے بعد تمہارے حسن کا طلبگار بن گیا تھا۔ وہ حسین چہروں کا شیدائی تھا۔ اس نے تمہارا انتخاب کر لیا تھا اور جب مجھے اس کے انجام کا علم ہوا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی لیکن یہ سب ہوا کس طرح یہ سب جاننے کیلئے میں تمہارے پاس آئی تھی۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ کیسی نظر آتی ہوں۔''

راہبہ نے ایک نظر قیدی عورت پر ڈالی اور سلاخوں والوں دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں راہداری سے نکلتے ہوئے بار بار مُڑ کر قیدی عورت کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ اس انداز میں جیسے اس قیدی عورت نے کوئی تحسین آمیز کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

☆☆☆



دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں

کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

نویں سچ بیانی

روٹین لائف

بنتِ حوا



لوگوں سے بھری بس سٹاپ پر آ کر رُکی تو فیصل سمیت کئی لوگ اس پر سوار ہونے کے لیے دوڑے اور وہ بس جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اب اس میں کسی انسان کی تو کیا شاید ہوا کی بھی جگہ نہیں رہی حیرت انگیز طور پر چند لمحوں میں سٹاپ پر کھڑے سب لوگوں کو اپنے اندر غائب کر چکی تھی۔ بس سٹاپ کسی فقیر کے کشکول کی مانند خالی ہو گیا اور بس اچھلتی کودتی آگے بڑھ گئی۔ بس کے چلنے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ بس کا کنٹرول کسی اناڑی کے ہاتھوں میں ہے یکدم لگنے والی بریک سے جھٹکا لگنے پر فیصل نے بے اختیار ایک ہاتھ سے کندھے پر لٹکا چھوٹا سا بیگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ساتھ کھڑے آدمی کا بازو پکڑا تو اس نے جھنجھلاتے ہوئے فیصل کا ہاتھ جھٹک دیا لیکن اپنے بازو کو فیصل کی گرفت سے آزاد نہ کرا سکا تو غصے سے اس کی طرف مُڑا۔

"معاف کرنا بھائی" اس سے پہلے کہ وہ آدمی فیصل کو بُرا بھلا کہنا شروع کرتا فیصل جلدی سے معذرت کرتے ہوئے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی مسافروں کے کھڑکیوں سے سر نکال کر دیکھنے پر وہ دونوں بھی باہر کی طرف متوجہ ہو گئے ان کے اور کھڑکیوں کے بیچ میں اتنے لوگ تھے کہ باہر دیکھنا ممکن نہ تھا لیکن دوسرے مسافروں کی باتوں سے پتا چلا کہ بس کسی موٹر سائیکل سوار کو ٹکر مارتے ہوئے گزر گئی ہے۔

"کچھ بچت ہوئی بھائی صاحب؟" ایک مسافر نے باہر جھانکنے والوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں بچت ہو گئی ہے زیادہ سے زیادہ پاؤں کی ہڈی ٹوٹی ہوگی بس" دوسری طرف خاصی مایوسی سے کہا گیا۔ موٹر سائیکل سوار کو کسی بھی قسم کی مدد دیے بغیر بس آگے بڑھ گئی اور لوگ پھر سے اپنی باتوں میں مگن ہو گئے یوں جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ابھی وہ لوگوں کی بے حسی پر کڑھ ہی رہا تھا کہ آگے سے کسی کے زور زور سے بولنے پر وہ ادھر متوجہ ہو گیا کنڈیکٹر کسی مسافر سے کم کرایہ دینے پر جھگڑ رہا تھا، کچھ لوگ اس مسافر کا ساتھ دیتے ہوئے بس والوں کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے تو کچھ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا رونا رو رہے تھے، پچھلی سیٹوں پر بیٹھی خواتین میں سے ایک کا بچہ شاید گرمی سے گھبرا کر چیخ چیخ کر رونے لگا، گرمی اور گھٹن کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی آوازوں نے اس سفر کو اور بھی تکلیف دہ بنا دیا۔

"کیا زندگی بس کے اس سفر سے کچھ مختلف ہے؟" فیصل نے سوچا اور غیر ارادی طور پر انکار میں گردن ہلانے لگا۔ خوش قسمتی سے اسے زیادہ دور نہیں جانا

تھا جلد ہی اسے اس سفر سے نجات مل گئی وہ بس سے اترا ہی تھا کہ رکشے والوں نے اسے گھیر لیا وہ سب کو منع کرتا ایک طرف چلنے لگا اس کی منزل کچھ زیادہ دور نہ تھی لیکن ذہن میں ابھرتی سوچوں کی وجہ سے چند قدم چلنے کے بعد ہی اس کی چال سے تھکن جھلکنے لگی۔ ٹریفک سے بچتا بچاتا وہ دائیں طرف کی ایک گلی میں مڑ گیا۔ گلی کی حالت اور وہاں پر موجود مکان وہاں بسنے والوں کی غربت کی کہانی سنا رہے تھے۔ گلی آخر میں جا کر کافی تنگ ہو جاتی تھی کچھ ہی دیر میں وہ اس تنگ گلی کے آخری مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گرمیوں کی اس دوپہر میں سب لوگ گھروں میں آرام کر رہے تھے گلی میں کوئی بچہ تک دکھائی نہ دے رہا تھا۔ مطلوبہ مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا وہ ایک لمحے کو ہچکچایا لیکن پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینے لگا دروازہ دوسری دستک پر ہی کھل گیا۔

''فیصل بھائی آپ اتنی اچانک'' دوسری طرف دروازہ کھولنے والی اس کی بہن آمنہ بھائی کو اچانک سامنے پا کر بے انتہا خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''آؤ نا اندر آؤ'' اس کے جواب کا انتظار کیے بنا وہ فیصل کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

''سلام خالہ'' آمنہ کی ساس بھی دستک کی آواز سن کر اپنے کمرے کے دروازے تک آ گئی تھی اس پر نظر پڑتے ہی فیصل نے بڑے ادب سے سلام کیا جواب میں خالہ منہ بنا کر بڑبڑاتے ہوئے کمرے کے اندر چلی گئی۔ آمنہ بھائی کے اس استقبال پر دل ہی دل میں کلس کر رہ گئی جب کہ فیصل شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

''ماموں جی ماموں جی'' پانچ سالہ بھانجی شہزادی ماموں کو دیکھتے ہی خوشی سے چلاتے ہوئے فیصل سے لپٹ گئی تو آمنہ اور فیصل بھی سب بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''تم بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں''

''نہیں آمنہ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے چلتے ٹائم ہی نان چنے کھائے تھے'' اس نے دانستہ جھوٹ بولا۔



"اچھا شربت تو پیو گے نا؟"

"نہیں پیاری بہنا صرف سادہ پانی کا ایک گلاس لے آؤ" فیصل کے کہنے پر آمنہ پانی لینے کمرے سے باہر چلی گئی اور فیصل شہزادی کی طرف متوجہ ہو گیا، اس کے معصوم سوالوں کا جواب دیتے ہوئے فیصل وقتی طور پر سب کچھ بھول گیا۔

☆......☆......☆

فیصل اور آمنہ اپنے ماں باپ کی دو ہی اولادیں تھیں، آمنہ فیصل سے عمر میں تین چار سال چھوٹی تھی ،فیصل کا باپ مزدوری کرتا تھا، ان کی ساری زندگی کرائے کے مکان میں گزری تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہاں تمام زندگی جسم وجاں کا تعلق قائم رکھنے کی تگ ودو میں گزر جایا کرتی ہے، خواب اگر بھولے بھٹکے آنکھوں میں اتر آئیں تب بھی گھبرا کر جلد ہی فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں پڑھائی لکھائی عیاشی اور بڑے لوگوں کے چونچلے مانے جاتے ہیں، ان دونوں بہن بھائیوں کی زندگی بھی ایسے ہی گزری تھی۔

آمنہ اٹھارہ سال کی تھی جب اس کے لیے منیر کا رشتہ آیا۔ منیر پھل، سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا بقول آمنہ کے باپ نے لڑکے کا اپنا کاروبار تھا سسرال میں دو بیاہی نندیں اور ایک ساس تھی رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا ویسے بھی جب کسی رشتے کی امید نہ ہو تو آنے والا پہلا رشتہ ہی بہترین دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسے میں منیر کی بڑھتی عمر، پکے رنگ اور تیزی سے کھنچے ہوتے سر کی طرف کس کا دھیان جاتا تھا۔ ماں باپ بیٹی کو رخصت کر کے گنگا نہا لیے۔ فیصل بھی اپنے ساتھ کے دوسرے لڑکوں کی طرح چھوٹی عمر سے ہی باپ کے ساتھ مزدوری کے لیے جانے لگا تھا۔ سخت محنت نے فیصل کے باپ کو عمر سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا کمزور جسم زیادہ دیر بیماری کو برداشت نہ کر سکا اور تھوڑا عرصہ بیمار رہنے کے بعد ہی وہ زندگی کی اس قید با مشقت سے رہائی پا گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری فیصل کے کاندھوں پر آ گئی۔ ایک مستری کی شاگردی میں جا کر وہ اچھا مستری بن گیا۔ دونوں ماں بیٹا کچھ دن غم منانے کے بعد ایک بار پھر زندگی سے جنگ میں مصروف ہو گئے اس بے رنگ زندگی میں ارم رنگ بھرنے چلی آئی، ارم جو کہ آمنہ کی نند کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھی آمنہ کے گھر ہونے والی پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھے۔ اس سے پہلے کہ فیصل اپنی ماں کو ارم کے گھر بھیجتا ایک رات سینے میں اٹھنے والے اچانک درد نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اسے خالقِ حقیقی سے ملا دیا، منیر آمنہ کو کم ہی میکے آنے کی اجازت دیتا تھا اور اس کے میکے والوں کے آنے پر بھی منیر اور اس کے گھر والوں کا رویہ بہت خراب ہوتا تھا اسی وجہ سے ماں باپ کے بعد فیصل ایک دم ہی پوری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ وہ کئی دن اپنے ایک کمرے کے مکان میں پڑا رہا، زندگی سے اس کا دل اوب گیا تھا بے کاری کے اس دور میں اس کے پاس جو کچھ تھا سب خرچ ہو گیا جس ٹھیکیدار کے پاس وہ کام کرتا تھا اس کی اتنی لمبی غیر حاضری نے اسے غصہ دلا دیا اور اس نے ہزار منت سماجت کے باوجود فیصل کو دوبارہ کام پر رکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ کرایہ نہ دینے کی وجہ سے گھر سے بھی بے گھر ہو گیا یار دوست بھی سب اس کی طرح تازہ کمانے تازہ کھانے والے لوگ تھے ان سے کچھ زیادہ مدد کی امید رکھنا بے کار تھا کوئی اور راستہ نہ پا کر وہ اپنے گھر کا سامان ایک دوست کے گھر رکھ کر آمنہ کی سسرال چلا آیا تھا جہاں ہمیشہ کی طرح اس کا استقبال بہت بددلی سے کیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

"اور سناؤ سالے صاحب کیا ہو رہا ہے آج کل" شام کو منیر گھر لوٹا تو فیصل صحن میں چارپائی پر بیٹھا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سلام دعا کے فوراً بعد ہی منیر نے سوال داغا۔

"بس وہی بھائی جان اور کیا کرنا ہے" فیصل نے گول مول سا جواب دے کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"اچھا مجھے تو پتا چلا تھا ٹھیکیدار نے تجھے کام سے نکال دیا ہے" منیر کچھ زیادہ ہی باخبر تھا جانے کیوں۔ فیصل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لیں باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں" آمنہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے فوراً بھائی کی مدد کو آئی۔

"ہاں بھوک تو بہت لگی ہے آج دوپہر میں بھی کچھ

نہیں کھایا" منیر کی توجہ کھانے کی طرف ہوتے دیکھ کر فیصل نے سکون کا سانس لیا اور تشکر بھری نظروں سے اپنی بہن کو دیکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ منیر کے سوالوں سے بچنا چاہتا تھا اسی لیے گھر سے باہر نکل آیا اور سمت کا تعین کیے بنا چلتا ہوا گھر سے کافی دور نکل آیا، اسے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی سڑک کی دوسری طرف ایک چھپر ہوٹل تھا اس نے اپنی جیب کو ٹٹول کر پیسوں کی موجودگی کو محسوس کیا اور ہوٹل کی طرف چلا آیا۔ ٹی وی پر کوئی پرانی فلم چل رہی تھی۔ وہ دیر تک سکرین پر نظریں جمائے چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ منیر سو چکا ہو گا تب وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو کچن سے آتی آوازوں میں ارم کی آواز پہچانتے ہوئے فیصل کا دل ارم کو دیکھنے کو مچلنے لگا۔ وہ جان بوجھ کر خاصی بلند آواز سے بول رہی تھی مقصد فیصل کو جگانا اور اپنی آمد کی خبر کرنا تھا۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے فیصل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، ہاتھ سے بالوں کو سنوارتے ہوئے وہ کچن کی طرف چل دیا جہاں ارم بڑے زور و شور سے آمنہ کے ساتھ کسی ڈرامے کو ڈسکس کر رہی تھی۔

"السلام علیکم!" سلام کی آواز پر دونوں نے چونک کر کچن کے دروازے پر کھڑے فیصل کی طرف دیکھا۔

"صبح ہو گئی جناب کی؟" ارم کے بے اختیار کہنے پر آمنہ اور فیصل ہنس دیے تو ارم جھینپ گئی۔

"چلو تم دونوں باہر چل کر بیٹھو میں ناشتا لے کر آتی ہوں" آمنہ کے کہنے پر وہ دونوں صحن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھے۔

"کیسی ہو؟" فیصل نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"زندہ ہوں" ارم کے لفظوں اور لہجے میں اداسی کا رنگ جھلکنے لگا۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو کوئی مسئلہ ہے کیا" فیصل نے پریشانی سے پوچھا لیکن ارم اس کی بات کا جواب نہیں دے پائی تھی کیونکہ اس کی نظر باہر سے آتی آمنہ کی ساس پر پڑ گئی تھی۔

"اور سنائیں کب تک ہیں یہاں؟" خالہ پر نظر پڑتے ہی ارم موضوع بدل گئی۔

"یہ بات نہ پوچھو بی بی گھر بار رہا نہیں اب تو لگتا ہے یہیں عمر گزرے گی، ایک ہمارا زمانہ تھا بھائی بہن کے گھر کا پانی تک نہ پیتے تھے اب تو کوئی شرم حیا ہی نہیں رہی لوگوں میں" خالہ نے ہاتھ میں تھاما سبزی کا شاپر چارپائی پر رکھتے ہوئے اونچی آواز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کچن میں ناشتا بناتی آمنہ کا تیزی سے چلتا ہاتھ تھم گیا، بھائی کی ذلت پر اس کا دل بے حد دکھی ہو گیا رہ کون گیا تھا اس کے میکے میں ایک بھائی ہی تو بچا تھا اور فیصل کا بھی اور کون تھا ایک بہن کے سوا لیکن آمنہ کی ساس کو بھلا یہ بات کون سمجھاتا، خالہ کی بات پر فیصل کا چہرہ بھی ذلت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔ "خالہ یہ سوٹ تو آپ پر بہت ہی جچ رہا ہے کتنے میں لیا؟"

"ارے جچے گا کیسے نہیں پورے پانچ سو کا ہے، کم بخت آٹھ سو کا کہہ رہا تھا بڑی مشکل سے پانچ سو پہ مانا" ارم خالہ کا دھیان ان کی پسند کے موضوع کی طرف لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب انہیں فیصل کا تو کیا کسی کا بھی خیال نہیں آنا تھا۔

"رات کو دس بجے چھت پر ملنا میں انتظار کروں گی" ارم نے سرگوشی کی فیصل سر ہلاتا وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ اندر جا کر وہ سستی سے بستر پر بیٹھ گیا باہر سے ارم اور خالہ کی باتوں کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیا مسئلہ ہے کیوں پریشان وہ" فیصل بالوں میں ہاتھ پھیرتا اسی سوچ میں گم تھا۔ "لو ناشتا کر لو" آمنہ کی آواز پر وہ چونکا اور کچھ کہے بنا خاموشی سے ناشتا کرنا شروع کر دیا، ناشتے کے بعد وہ ایک بار پھر گھر سے باہر نکل گیا اس کے پاس سڑکیں ناپنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی نظر کرکٹ کھیلتے لڑکوں پر پڑی تو وہ بے دھیانی میں کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا، وہ ایک چھوٹا سا خالی پلاٹ تھا جس پر جنگلی پودوں کے ساتھ ساتھ کوڑا کرکٹ بھی پڑا تھا مگر

کھیلنے والوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا ابھی صبح کا ہی وقت تھا پھر بھی گرمی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ لڑکے بُری طرح پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

مگر انہیں جیسے اس بات سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ کھیلنے میں مگن تھے بیٹنگ کرتے لڑکے نے پوری قوت سے بلا گھمایا گیند بڑی تیزی سے فضا میں اچھلی اور فیصل کی طرف آئی فیصل نے بالکل بے خیالی میں تیزی سے اپنی طرف آتی گیند کو کیچ کر لیا۔

''واہ بھائی بڑا اچھا کیچ کیا تم نے آؤ تم بھی ہمارے ساتھ کھیلو'' ایک لڑکا جو شاید ان سب میں خاص اہمیت رکھتا تھا توصیفی لہجے میں کہتے ہوئے اسے کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا فیصل نے ایک نظر ان سب کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔

☆......☆......☆

فیصل نے آمنہ سے کہہ کر اپنا بستر چھت پر لگوایا تھا اور اب وہ کافی دیر سے بستر پر بیٹھا دس بجنے کا انتظار کر رہا تھا ارم اور آمنہ کے گھر کی چھتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ بڑی آسانی سے ایک چھت سے دوسری چھت پر آیا جا سکتا تھا، ساتھ والی چھت پر ہلکی سی آہٹ ہوئی فیصل چونک کر اس طرف دیکھنے لگا لیکن آمنہ کی بجائے بلی کو چہل قدمی کرتے دیکھ کر فیصل کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی، ہوا بند ہونے کی وجہ سے حبس بڑھ گئی تھی گھر کا واحد سٹینڈ پنکھا صحن میں رکھا ہوا تھا جہاں پانی چھڑک کر سرِ شام ہی سب کی چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں، نیچے گھر کی بھی روشنیاں بند کر دی گئی تھیں آسمان پر موجود آخری راتوں کے چاند کی روشنی اندھیرے کو مٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ ''ابھی تک آئی کیوں نہیں'' موبائل سکرین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پریشانی سے بڑبڑایا جہاں رات کے ساڑھے دس ہونے والے تھے۔ گرمی اور حبس نے فیصل کی حالت خراب کر رکھی تھی اب وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے چھت پر سونے کا فیصلہ کیا تھا رہی سہی کسر موٹے موٹے مچھروں نے پوری کر دی تھی جو بڑی بے تکلفی سے فیصل کے خون سے فیض یاب ہو رہے تھے، دس منٹ اور گزرے تو فیصل کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو گیا وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور چھت پر دائیں بائیں چلنے لگا چھت زیادہ بڑی نہ تھی اسے بار بار رک کر دوسری طرف مڑنا پڑتا تھا فیصل جلد ہی اس مشغلے سے اکتا گیا اور واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے جب اسے ارم کی سرگوشی سنائی دی وہ اسے پکار رہی تھی فیصل کے بے جان جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی اکتاہٹ ایک دم اڑن چھو ہو گئی۔

''کب سے انتظار کر رہا ہوں کہاں رہ گئی تھیں تم؟'' وہ تیزی سے ارم کی چھت کی طرف بڑھتے ہوئے دھیمی آواز میں ناراضگی سے پوچھنے لگا۔

''کیسے آتی آج امی ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ ابھی ان کی آنکھ لگی تو میں دوڑی دوڑی تمہارے پاس آ گئی''

اچھا چھوڑو اس بات کو تم وہاں کیوں کھڑی ہو ادھر آ جاؤ ناں، بیٹھ کر بات کرتے ہیں'' فیصل کا اشارہ چھت پر بچھی چارپائی کی طرف تھا ارم نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور چھوٹی سی منڈیر پر سے کود کر فیصل کے پاس آ گئی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے اتنی کمزور ہو رہی ہو اور رنگ بھی کتنا پیلا زرد ہو رہا ہے کیا بیمار ہو؟'' چارپائی پر ساتھ ساتھ بیٹھتے ہوئے فیصل نے بغور ارم کی طرف دیکھتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا ارم سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

''کیا ہوا کچھ تو بتاؤ'' فیصل نے دائیں ہاتھ سے ارم کا چہرہ اوپر کیا تو اور ارم کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے اسے اور بھی پریشان کر دیا ''میرے چاچے نے اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگا ہے'' اتنا کہہ کر وہ پھر سسکنے لگی ''اور تم نے ہاں کر دی؟'' فیصل نے بے تابی سے سوال کیا۔

''میرے ہاں یا ناں کرنے سے کیا ہوتا ہے' ہونا تو وہی ہے جو ابا چاہے گا، تو کچھ کرنا، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی'' ارم نے روتے ہوئے اپنا سر فیصل کے کاندھے پر ٹکا دیا مگر وہ اسے تسلی تک نہ دے سکا کہ اپنے حالات اس کے سامنے تھے وہ اس وقت بے روزگار تھا کوئی بھی ماں باپ اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دیتے ہوئے ہزار

بار سوچتے۔ ان حالات میں ارم کے گھر رشتہ بھیجنا ہی اسے بے وقوفی لگ رہا تھا ویسے بھی ارم کا باپ فیصل کو کچھ خاص پسند نہ کرتا تھا اور اب تو مقابلے میں اس کا سگا بھتیجا تھا پھر وہ اپنے بھتیجے کی بجائے فیصل کا رشتہ کیونکر قبول کرتا لمحوں میں ساری صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے فیصل کا دل اس کے سینے میں ڈوبنے لگا۔ ''تو چپ کیوں ہے کچھ بول نا، تو بھابی آمنہ کو بھیجے گا نا میرے گھر؟'' ارم نے اس کی خاموشی سے جانے کیا مطلب نکالا تھا کہ اس کے لہجے میں ہجر کا خوف جھلک آیا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں میں ضرور بھیجوں گا اور مجھے یقین ہے کہ تیرا ابا انکار نہیں کرے گا آخر ایسا گبرو جوان کہاں ملے گا اسے اپنی بیٹی کے لیے'' فیصل نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے ارم سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔ فیصل کے یقین پر ارم کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں'' ارم نے اٹھتے ہوئے کہا تو فیصل بے اختیار اس کا ہاتھ تھام گیا۔

''اتنی جلدی کیا ہے تھوڑی دیر تو بیٹھ'' وہ اصرار کر رہا تھا۔

''نہیں ابھی مجھے جانا ہوگا کوئی جاگ گیا تو مصیبت آجائے گی''

''چل جیسے تیری مرضی'' فیصل بھی اس وقت محتاط رہنا چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ ارم کو کھو بیٹھے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ارم کو جانے کی اجازت دے دی۔

''بھابھی آمنہ کو جلدی بھیجنا'' ارم نے جاتے جاتے یاد دہانی کرائی فیصل کچھ بھی نہ کہہ سکا ارم احتیاط سے منڈیر کراس کرتی دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

''پتا نہیں اور کیا کیا لکھا ہے قسمت میں'' ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے فیصل نے یوں آسمان کی طرف دیکھا جیسے اپنے سوال کا جواب مانگ رہا ہو۔ پھر جانے کتنی دیر وہ آمنہ سے بات کرنے کے منصوبے بناتا رہا ارم کے ماں باپ کو اس رشتے کے لیے راضی کرنے کے لیے اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے خبر بھی نہ ہوئی اور رات دبے قدموں گزرتی چلی گئی۔ موذن کی آواز اسے سوچوں کی دنیا سے باہر نکال لائی تو وہ نماز پڑھنے کے لیے بستر سے اٹھ بیٹھا۔

☆......☆......☆

فیصل صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا گرمیوں کی صبح ذرا جلدی ہی ہو جایا کرتی ہے اسے اندازہ تھا کچھ ہی دیر میں ساری چھت دھوپ سے بھر جائے گی اسی لیے وہ نیچے آکر کمرے میں سو گیا آمنہ کو بھی اندازہ تھا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے اس لیے اس نے فیصل کو ناشتے کے لیے بھی نہیں جگایا۔

اس کی آنکھ گرمی کی وجہ سے کھلی تھی بجلی کے جانے سے پنکھا بند ہو گیا تھا وہ تھوڑی دیر بستر پر پڑا کسمساتا رہا اس کے کپڑے پسینے سے تر ہو چکے تھے۔

''اٹھ جاؤ بھائی ناشتا کر لو'' گھر کے کام ختم کر کے آمنہ گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو فیصل کو جاگتا دیکھ کر بولی۔

''ابھی نہیں... بھوک نہیں ہے'' فیصل کا کچھ بھی کھانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا اسی لیے صاف انکار کر گیا۔

''بھائی ...وہ ایک بات پوچھنا تھی'' آمنہ کچھ جھجک کر بولی۔

''ہاں پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟'' فیصل نرمی سے کہتا بستر پر اٹھ بیٹھا اب وہ منتظر نگاہوں سے آمنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ اب آگے کا کیا سوچا ہے میرا مطلب ہے کیا کام کرنے کا ارادہ ہے؟''

''کرنا تو وہی ہے جو ساری عمر سے کرتا چلا آ رہا ہوں۔ ایک ٹھیکیدار سے بات کی ہے امید ہے جلد ہی کام مل جائے گا''

''چلو خیر اللہ بہتر کرے گا تم منہ ہاتھ دھو لو کچھ کھانے کا دل نہیں کر رہا تو میں لسی لے آتی ہوں'' آمنہ اس کا جواب سنے بنا کمرے سے نکل گئی اور فیصل ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کے وہاں رہنے سے آمنہ کو روز اپنے سسرال والوں سے ہزار طرح کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اسے خود بھی اس طرح رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا'' مجھے جلدی ہی کچھ کرنا پڑے

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

گا'' وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے مخاطب تھا اور پھر وہ کچھ فیصلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

''آخر تجھے تکلیف کیا ہے؟ کیوں انکار کر رہی ہے'' ارم کے مسلسل انکار نے اس کی ماں کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

''میں نے کہہ دیا نا امی میں نے ابھی شادی نہیں کرنی اور اس قاسم سے تو کبھی بھی نہیں کرنی'' ماں کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر اس نے پھر اپنی بات دہرا دی۔

''چپ کر جا بے شرم خود تو مرے گی ہی مجھے بھی پٹوائے گی اپنے باپ سے'' فاخرہ نے غصے سے کہتے ہوئے پاس بیٹھی ارم کی کمر پر زور کا دوہتڑ مارا وہ اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی تبھی آگے کو گر گئی ''ہائے'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''امی میری پٹائی کروا یا جان سے مار دو مگر میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا'' ارم کی اس دیدہ دلیری پر فاخرہ نے پھر سے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اس بار ارم ہوشیار تھی اس لیے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''تو رک جا آج تیرے باپ کو بتاتی ہوں تیرے سارے کرتوت، کیا سمجھتی ہے تو مجھے خبر نہیں کہ تو کس کے چکر میں اس رشتے سے انکار کر رہی ہے'' فاخرہ غصے سے چلائی۔

''جب تُو اچھی طرح جانتی ہے تو پھر میری بات مان کیوں نہیں لیتی آخر'' شاید آج ارم بھی اس مسئلے کو حل کر لینا چاہتی تھی۔

''ہائے میرے ربا کیا گناہ کیا تھا میں نے جو ایسی بے شرم اولاد میری قسمت میں لکھی گئی لو سنو بھلا اپنے منہ سے اپنا بَر مانگ رہی ہے۔ ایسی بے حیا اولاد سے تو بندہ بے اولاد بھلا'' فاخرہ نے سینے پر ہاتھ مار کر دہائی دینا شروع کر دی تو ارم بدمزہ سی ہو کر کمرے میں چلی گئی فاخرہ دیر تک اسے گالیاں اور کوسنے دیتی رہی لیکن وہ کان لپیٹے اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگی رہی۔

☆......☆......☆

ارم مسلسل روئے چلی جا رہی تھی اسے چپ کرانے کی آمنہ کی ہر کوشش بے کار جا رہی تھی۔

''دیکھو ارم اس طرح رونے سے مسئلہ تو حل نہیں ہو گا نا'' وہ بلاشبہ بیسویں مرتبہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''روؤں نہیں تو اور کیا کروں تم ہی بتاؤ میں کیسے کر لوں قاسم سے شادی...... ایک نمبر کا آوارہ چھچھورا انسان ہے وہ اور سب سے اہم بات کہ وہ آسمان سے اترا فرشتہ بھی ہوتا تب بھی مجھے اس سے شادی نہیں کرنا تھی میں تو...'' وہ روانی سے کہتی ایک دم خاموش ہوئی آمنہ نے ارم کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو دروازے پر فیصل کو کھڑا پایا، وہ بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی شاید ان دونوں کو بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ وہ ارم کی ادھوری بات کا مطلب بھی بخوبی جانتی تھی کہ فیصل کے ذکر پر ارم کے چہرے پر کھلتے گلاب بھی دیکھ رکھے تھے اور ارم کو دیکھ کر فیصل کی آنکھوں میں جلتے دیپوں سے بھی واقف تھی۔ ارم اسے بھی بہت پسند تھی وہ دل سے چاہتی تھی کہ ارم اس کی بھابی بنے لیکن حالات کو بدلنا اس کے اختیار میں نہیں تھا ورنہ سارے جہان کی خوشیاں سمیٹ کر اپنے پیارے بھائی کے دامن میں ڈال دیتی۔

☆......☆......☆

''کیوں رو رہی ہو تم؟'' فیصل نے ارم کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا تو وہ اسے شاکی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

''وہ سب جانتا ہوں میں لیکن دیکھو میں کوشش کر تو رہا ہوں مجھے تھوڑا وقت دو میں جلد آمنہ کو تمہارے گھر بھیجوں گا سب ویسے ہی ہو گا جیسے ہم نے سوچا تھا کبھی''

ارم کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ اس سے زیادہ خود کو یقین دلا رہا تھا۔ ''ارم تمہارا بھائی آیا ہے تمہاری امی بلا رہی ہیں تمہیں'' آمنہ نے دروازے کے باہر سے آواز لگائی تو ارم کچھ بھی کہے بنا دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، فیصل اداس نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

''آ گئی ہے تمہاری لاڈلی خود بات کر لو اب اس سے'' ارم گھر میں داخل ہوئی تو فاخرہ اسے دیکھتے ہوئے ناراض لہجے میں ارم کے باپ سے بولی اور خود اٹھ کر

باورچی خانے میں چلی گئی۔ ارم باپ کا اشارہ پا کر چپ چاپ چارپائی پر ٹک گئی۔ آخری نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے برتن سائیڈ پر کھسکائے اب وہ پوری طرح ارم کی طرف متوجہ تھا۔

''دیکھ پتر میں نے ہمیشہ تیری ہر خواہش پوری کی ہے'' انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے تمہید باندھی۔

''برادری میں لڑکیوں کو سکول بھیجنے کا کوئی رواج نہیں پھر بھی تیرا شوق دیکھتے ہوئے میں نے تجھے پانچ کلاسیں پڑھائیں'' اماں کے سامنے پٹر پٹر بولنے والی ارم باپ کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی وہ بولنا چاہتی تھی مگر خاموش بیٹھی تھی اور تو اور اس کے آنسوؤں نے بھی نہ بہنے کی قسم کھالی تھی۔ باپ ایک کے بعد ایک احسان پہ احسان گنوائے جا رہا تھا اور ارم کا سر جھکتے جھکتے گھٹنوں سے جا لگا تھا اور پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے ارم کو چپ لگ گئی۔ اگلے دن شام کو چاچا چاچی مٹھائی لے کر آئے اور قاسم کے نام کی انگوٹھی ارم کی انگلی میں ڈال گئے۔

☆......☆......☆

''ہاں بھئی بات یہ ہے کہ ابھی تو مجھے کسی بندے کی ضرورت نہیں جب ضرورت ہو گی تو تجھے بلوا لوں گا'' ٹھیکیدار بے نیازی سے کہتے ہوئے موبائل پر کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا گویا اس نے فیصل کو جانے کا اشارہ دے دیا وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا کمرے سے باہر آیا وہیں اسے نیاز مل گیا۔

''کیا ہوا کام نہیں بنا؟'' فیصل کے چہرے پر پھیلے مایوسی سے تاثرات سے وہ بنا کہے ہی سب سمجھ گیا۔

''اچھا فکر نہ کر میں آج پھر بات کر کے دیکھتا ہوں ٹھیکیدار سے'' نیاز نے فیصل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو جواب میں وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''چل تجھے اچھی سی چائے پلواتا ہوں''

''نہیں یار پھر کبھی'' فیصل نے انکار کرنا چاہا مگر نیاز کے محبت بھرے اصرار پر اسے اس کے ساتھ جانا ہی پڑا چائے پینے کے دوران فیصل نے نیاز کو تفصیل سے اپنے حالات بتائے وہ کافی پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کافی عرصہ ایک ہی ٹھیکیدار کے پاس کام بھی کرتے رہے تھے یہی وجہ تھی کہ نیاز کی ہمدردی پا کر فیصل اپنی ہر پریشانی کہتا چلا گیا۔

''سمجھ نہیں آتی یار آخر قسمت میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ تُو جانتا ہے میں کیسا اچھا مستری ہوں۔ کیسی صفائی ہے میرے ہاتھ میں مگر جس کے پاس بھی کام مانگنے جاتا ہوں انکار ہو جاتا ہے'' فیصل کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے سے بھی مایوسی جھلک رہی تھی۔

''فکر نہ کر یار کبھی کبھی ہوتا ہے ایسا بھی لیکن جیسے اچھے دن ہمیشہ نہیں رہتے ایسے ہی بُرے دنوں نے بھی آخر گزر جانا ہوتا ہے، تیرے حالات دیکھتے ہوئے فی الحال میرے ذہن میں بس ایک ہی بات آ رہی ہے۔ دیکھ تُو بُرا نہ ماننا لیکن اگر تو کچھ دن اڈے پر جانا شروع کر دے'' نیاز کا مشورہ سن کر فیصل چپ سا ہو گیا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''میرا مطلب ہے کہ دیہاڑی لگ جائے تو کچھ تو آئے گا ہاتھ میں'' فیصل اس بار بھی خاموش رہا وہ کسی سوچ میں تھا۔ نیاز کا مشورہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ چائے کا کپ خالی ہوتے ہی فیصل جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''یار ایک کام تو کرنا یہ موبائل ہے وہ اپنے عابد صاحب نہیں ہیں وہ تمہاری بہن کی گلی سے ایک گلی چھوڑ کر جن کا گھر ہے، وہی جو سکول میں پڑھاتے ہیں'' فیصل کی شکل سے پتا چل رہا تھا کہ وہ عابد نامی اس شخص کو اپنی یادداشت کے خانوں میں سے تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے تبھی نیاز نے تفصیل سے عابد کے بارے میں بتایا۔

''یہ موبائل باہر سے ان کے سالے نے بھیجا ہے اس میں کوڈ لگ گیا تھا پچھلے ہفتے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنا مسئلہ بتایا۔ تُو تو جانتا ہے میرا چھوٹا بھائی موبائلوں کے ٹھیک کرنے کا کام کرتا ہے تو اسی لیے انہوں نے یہ موبائل میرے حوالے کیا تھا، میرا چکر تو جانے کب لگے اب تو ادھر جا ہی رہا ہے تو میرے بھائی یاد سے ان کی امانت ان تک پہنچا دینا'' نیاز نے موبائل کی پوری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔

''یار ذرا دھیان سے لے جانا بڑا مہنگا موبائل ہے'' نیاز نے پھر تاکید کی۔

"تو فکر نہ کر میں آج ہی عابد صاحب کو ان کی امانت بہ حفاظت پہنچا دوں گا" فیصل نے اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"یار یہ کچھ پیسے رکھ لے کام آئیں گے" فیصل کے انکار کرنے کے باوجود چلتے وقت نیاز نے کچھ پیسے فیصل کی جیب میں ڈال دیے۔

نیاز کو خدا حافظ کہتا وہ بس سٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے جیب سے پیسے نکال کر دیکھے پورے دو ہزار روپے تھے نیاز کی محبت اور خیال اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی لے آیا وہ سر جھٹک کر بس میں سوار ہو گیا۔

☆......☆......☆

فیصل چار دن کا گھر سے نکلا ہوا تھا کام کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا کبھی کسی دوست کی طرف تو کبھی کسی جاننے والے کے پاس۔ آج چار دن بعد جب وہ آمنہ کے گھر پہنچا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ ان چار دنوں میں وہ جانے کتنے گھنٹے پیدل چلا تھا اور سب سے بڑھ کر نا کامی کی تھکن اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی وہ اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے آمنہ کی غیر معمولی خاموشی کا احساس بھی نہیں ہوا، کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ آمنہ آ کر اس کے پاس بیٹھی اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے، آرام کرنے کی شدید خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا آمنہ سب خیریت تو ہے نا؟" آمنہ کو خاموش دیکھ کر وہ خود ہی پوچھنے لگا۔

"ہاں بھائی سب خیریت ہے" اتنا کہہ کر وہ پھر سے خاموش ہو گئی۔

"بہت جلد مجھے کام مل جائے گا بس ایک دو دن اور پھر میں اپنے رہنے کا ٹھکانا بھی کر لوں گا" آمنہ کی خاموشی سے اسے یہی بات سمجھ میں آئی کہ آمنہ کی ساس اور شوہر کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے۔

"نا بھائی ایسی بات نہیں وہ اصل میں مجھے یہ بتانا تھا کہ۔۔۔۔ وہ ارم ہے نا اس کی منگنی ہو گئی ہے اپنے چاچا کے بیٹے سے" آمنہ نے جیسے دھماکہ کیا اور اس دھماکے میں فیصل کی خوشیاں، خواب اور زندگی سب کے سب لمحوں میں بکھر گئے۔ آمنہ اپنی بات کہہ کر فیصل کے چہرے کو تکے جا رہی تھی جہاں ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ آمنہ کتنی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ بالکل خاموش تھا آخر وہ ساس کی آواز پر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ فیصل الجھے ہوئے ذہن اور بے جان ہوتے جسم کے ساتھ پورا دن کمرے میں پڑا رہا یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ آمنہ کئی بار اس کے پاس آئی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ بس "ہوں، ہاں" میں ہی جواب دیتا رہا حتیٰ کہ منیر کی آمد پر بھی وہ اس سے ملنے باہر نہیں نکلا بلکہ سوتا بن گیا۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔ اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کی خوشیاں واپس پا سکتا۔

"کیا بات ہے تیرا بھائی کل سے دکھائی نہیں دے رہا" اگلی صبح آمنہ کی ساس ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے طنزیہ لہجے میں پوچھ رہی تھی پھر آمنہ کے جواب کا انتظار کیے بنا ٹوکری اٹھائے سبزی لانے کے لیے گھر سے نکل گئی۔ آمنہ آنسو بہاتے ہوئے گھر کے کام سمیٹتی رہی۔

☆......☆......☆

شام ڈھلے منیر کے گھر آنے کا وقت ہوا تو فیصل جان بوجھ کر گھر سے نکل آیا۔ وہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا وہ سر جھکائے سست قدموں سے بے مقصد چلا جا رہا تھا کبھی اسے کسی نے پکارا۔

"سنو بیٹا" اسے لگا کہ شاید اس سے غلطی ہوئی ہے اس کا یہاں کسی سے ایسا ملنا جلنا نہیں تھا بلکہ وہ تو کسی کو ٹھیک سے جانتا تک نہ تھا پھر بھلا اسے کوئی کیوں پکارتا وہ یہی سوچ کر آگے بڑھ رہا تھا تب دوبارہ آواز آئی۔

"رکو بیٹا میں تم سے ہی کہہ رہا ہوں" اس بار فیصل رک گیا اور مڑ کر پکارنے والے کی طرف دیکھنے لگا وہ شاید نہیں بلکہ یقیناً فیصل کے لیے اجنبی تھا درویش دکھنے والا وہ شخص عمر میں پچاس سے اوپر کا لگ رہا تھا نورانی باریش چہرہ لبوں پر ہلکی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ فیصل آنکھوں میں الجھن اور حیرت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ درویش نے چند قدموں میں اپنے اور فیصل کے بیچ کا راستہ پار کر لیا اور عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آپ..." فیصل پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس نے فیصل کو کیوں روکا ہے لیکن بزرگ نے اس کی بات اچک لی اور مسکراتے ہوئے پُر شفقت لہجے میں کہنے لگا۔

"بیٹا تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں اور تمہاری پریشانیوں کو بہت اچھے سے جانتا ہوں بس یوں سمجھو کہ میں بس تمہارے لیے ہی یہاں آیا ہوں" بزرگ کا انداز گفتگو بڑا متاثر کن تھا، "بڑے بُرے حالات میں ہو تم آج کل، مالی مسائل بھی اور زندگی کی پریشانیاں بھی، بہت مشکل میں ہو" بزرگ نے گہری نگاہوں سے فیصل کی بڑھی ہوئی شیو بکھرے بال اور میلے مسلے ہوئے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ... آپ کو کیسے پتا چلا یہ سب؟" فیصل کا حیران ہونا فطری تھا اگرچہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی بھی انسان اس کے حالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

"میں نے کہا نا تمہارے لیے ہی آیا ہوں" بزرگ نے مسکراتے ہوئے اپنی بات دہرائی فیصل نے بے ساختہ بزرگ کے ہاتھ تھام لیے اور التجائیہ لہجے میں کہنے لگا۔

"بابا جی آپ اللہ والے ہیں سب جانتے ہیں آپ میری مدد کریں مجھ پر مہربانی کریں میں بہت مشکل میں ہوں آپ تو اللہ والے ہیں اللہ آپ کی بات ضرور سنے گا میرے حق میں دعا کریں" اس کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا ایک کام کرو اپنی آنکھیں بند کرو اور دو منٹ تک خاموشی سے کھڑے رہو اس کے بعد گن کر سو قدم چلو، جہاں سو قدم پورے ہوں گے وہاں ایک کریانے کی دکان ہے وہاں سے اگربتیاں خریدو اور واپس یہاں آؤ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا چلو اب آنکھیں بند کرو" بزرگ کی بات ختم ہوتے ہی بنا کوئی سوال کیے فیصل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اس کے بعد اس نے تبھی آنکھیں کھولیں جب بزرگ نے اسے آنکھیں کھولنے کے لیے کہا "پیچھے مڑ کر مت دیکھنا" بزرگ نے مزید ہدایت دی فیصل نے اثبات میں گردن ہلائی اور قدم گنتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر دیا سو قدم پورے ہوئے اور وہ کریانے کی دکان پر پہنچ گیا اگربتیاں لینے میں اسے پانچ منٹ سے زیادہ لگ گئے کیونکہ دکان پر اس سے پہلے ہی دو گاہک موجود تھے فیصل نے بڑی بے چینی سے وہ وقت گزارا اور اگربتیاں خریدنے کے بعد فیصل جس طرح قدم گنتا وہاں پہنچا تھا اسی طرح واپس اس جگہ پہنچا جہاں وہ بزرگ کو کھڑا چھوڑ آیا تھا لیکن اب بزرگ کا دور دور تک نام و نشان تک نہ تھا فیصل بے چینی سے آگے بڑھا اور کافی دیر تک مختلف گلیوں میں بزرگ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بزرگ وہاں سے ایسے غائب تھا جیسے کبھی وہاں تھا ہی نہیں، آخر اس تلاش سے مایوس ہو کر گھر کی طرف چل پڑا، وہ بہت الجھن میں تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا ساتھ کیا ہوا، فیصل گھر میں داخل ہوا تو اس کی بھانجی بھاگتی ہوئی آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"ماموں جی چیز دلائیں" وہ لاڈ سے بولی تو فیصل نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا اور اسے گود میں لیے لیے الٹے قدموں گھر سے باہر نکل آیا، محلے کی دکان پر پہنچ کر اس نے سامنے کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی پا کر اسے خیال آیا اس جیب میں جتنے پیسے تھے ان کی وہ اگربتیاں خرید چکا تھا تبھی اسے نیاز کے دیے پیسوں کا خیال آیا تو اس نے سائڈ کی جیب سے پیسے نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس کی جیب خالی تھی اس نے پریشانی سے دوسری جیب بھی کنگال ڈالی مگر پیسے ہی نہیں اس کا اپنا اور نیاز کا دیا گیا موبائل بھی اس کی جیب سے غائب تھا جبکہ اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس نے اپنی جیبیں اچھی طرح چیک کی تھیں پیسے اور موبائل جیب میں موجود تھے اس کے بعد وہ صرف بزرگ کے پاس ہی رکا تھا "اوہ تو یعنی وہ بزرگ..." اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا وہ بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا مایوسی کی انتہا پر پہنچا ہوا فیصل فراڈیہ بزرگ کے لیے بہت ہی آسان شکار ثابت ہوا تھا، فیصل کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ اپنے پیسے اور موبائل کے ساتھ ساتھ نیاز کی امانت بھی کھو چکا تھا۔ کمزوری اور پریشانی سے اسے زور کا چکر آیا اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھتا چلا گیا۔

☆☆......☆☆

دسویں سچ بیانی

موتی آئی لو یو

حنا بشریٰ



ایک جانور کی بے مثال محبت اور وفاداری سے جڑی بہت خاص کتھا

''عائشہ بیٹا جلدی آجاؤ وین والا کب سے کھڑا ہے۔'' امی کی آواز پر میں نے جلدی جلدی دوپٹہ سر پر ڈالا اور بیگ پکڑ کر باہر آگئی۔

''بیٹا کیا کرتی ہو؟ وقت پر اٹھا کرو۔'' امی نے مجھے دیکھتے ہوئے ہدایت کی۔

''جی امی کوشش کروں گی آئندہ شکایت نہ ہو۔'' میں شرمندگی سے بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

''عائشہ!'' امی کی پکار پر میں نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''بیٹا بادل چھائے ہوئے ہیں موسم کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔'' امی نے آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھے دیکھا۔

''امی آج میرا بہت ضروری ٹیسٹ ہے آج چھٹی نہیں کی جاسکتی۔ اچھا امی اللہ حافظ۔'' میں نے وجہ بتاتے ہوئے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔

وین والے نے مجھے دیکھتے ہی اپنے دانتوں کی نمائش کرنی ضروری سمجھی تھی۔ میں جل بھن کر وین میں بیٹھ گئی۔ وین والے نے بے ہودہ پنجابی گانے کی آواز مزید تیز کرلی تھی۔ میرا دل اُس کی گردن دبانے کو چاہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر تک بادل خوب گرجے اور پھر برسے ہر طرف جل تھل سی ہوگئی تھی۔ بارش تھی کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں تقریباً بھیگ چکی تھی۔ جلدی جلدی کرتے بھی کافی دیر ہوگئی تھی۔ چھٹی کے وقت رضا بھائی نے آنا تھا مگر آج اُن کی ضروری میٹنگ تھی۔ سو مجھے خود ہی آنا تھا۔

جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی تو سکون کا سانس لیا تھا۔ اِس سے پہلے کہ میں گھر میں داخل ہوتی گھر کے باہر ایک کتا بیٹھا ہوا نظر آیا جو سر سے پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔ مجھے اُس پر بہت رحم آیا۔ وہ چھوٹا سا سفید کتا مجھے مظلوم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندر سے گرم دودھ لاکر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ جسے وہ فوراً پینے لگ گیا۔ نجانے بے چارہ کب سے بھوکا تھا۔ میں نے اُس پر رحم بھری نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا بارش رُک چکی تھی۔ میں اندر آگئی۔

''امی یہ وین والا بہت بدتمیز ہے۔ فضول میں دیکھ کر ہنستا رہتا ہے چھچھورا کہیں کا۔'' میں نے بیگ رکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' امی نے حیرت سے پوچھا۔

''امی مجھے دیکھ کر گانوں کی آواز تیز کر دیتا ہے۔ بلاوجہ تنگ کرتا ہے جتنا اُسے دیکھ کر چڑتی ہوں اتنا ہی وہ فری ہونے کی کوشش کرتا ہے۔'' میں ابھی بھی غصے میں تھی۔

''اچھا شام کو تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں کہ یہ وین والا ہٹا دیں۔'' امی نے تشویش بھرے انداز میں جواب دیا تھا۔

☆......☆......☆

وین سے ایک ایک کر کے تمام لڑکیاں اُتر چکی تھیں۔ میں اکیلی بیٹھی تھی اور گھر آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا

میں گانے کی آواز پر چونک اٹھی تھی۔ وین والے کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر خباثت چھائی ہوئی تھی۔ وین گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ گھر قریب آ چکا تھا میں اُس پر لعنت بھیج کر وین سے اُتر گئی۔ گھر کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ وین والا میرے راستے میں حائل ہو گیا۔

''رشید بھائی میرے راستے سے ہٹ جائیں۔'' میں اُس کی حرکت پر حیران ہوتے ہوئے پھنکاری۔

''بھئی اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ کبھی ہم پر بھی غور کر لیا کرو عائشہ!'' رشید بھائی نے بے تکلفی سے مجھے پکارا۔

میں انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگی تھی کہ وین والے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری مزاحمت پر بھی وہ بضد تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھاتی کہ نجانے کہاں سے ایک کتا وین والے پر حملہ آور ہو گیا۔ میں تو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ وین والے کے تو چھکے چھوٹ گئے تھے۔ جلدی سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا وہ وین میں سوار ہو گیا۔ اس سیریس چویشن میں بھی مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ کتا اُس وقت تک



بھونکار رہا تھا۔ جب تک وین والا گلی سے باہر نہیں نکل چکا تھا۔ کتا اُس کے تعاقب میں گلی سے باہر جا چکا تھا اور میں ایک بڑی مصیبت سے بچ چکی تھی۔

☆......☆......☆

امی کو ساری بات بتانے کے بعد میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو کتا ابھی تک گھر کے باہر بیٹھا تھا۔ یوں جیسے چوکیداری پر مامور ہو۔ میں نے اندر سے دودھ کی پیالی لاکر اُس کے آگے رکھ دی۔ جسے وہ ذوق وشوق سے پینے لگا۔

شام کو امی نے تمام بات ابو اور بھائی کو بتادی۔

''اُس خبیث کی یہ جرأت منہ توڑ دوں گا اُس کا!'' رضا بھائی سنتے ساتھ ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''بیٹا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب!'' ابو پریشانی سے بولے۔

''ابو میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی''۔ میں ابو اور بھائی کے ردِعمل پر خوفزدہ ہوکر بولی۔

''پھر بھی بیٹا آئندہ محتاط رہنا خاموشی سے ایسے لوگ مزید شیر ہوجاتے ہیں۔'' ابو نے مجھے پریشان دیکھ کر نرمی سے سمجھایا۔

''جی ابو آئندہ دھیان رکھوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اُس کتے نے اُس خبیث پر حملہ کردیا۔'' امی شکر گزار انداز میں بولیں۔

''ہاں بیٹا کبھی کبھی جانوروں میں انسان سے زیادہ وفا اور انسانیت محسوس ہوتی ہے۔ ابو دل گرفتگی سے بولے۔

''اچھا میں ذرا دیکھتا ہوں کہ وہ کتا اب تک باہر موجود ہے یا نہیں۔'' رضا بھائی باہر کی جانب بڑھتے ہوئے بولے۔ میں بھی اُن کے پیچھے ہی لپکی۔

رضا بھائی نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ کتا جھٹ اندر آ گیا جیسے موقع کی تلاش میں تھا اور آتے ہی یوں لپکا کہ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ میری جانب تیزی سے بڑھا اور پیروں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ شاید وہ احسان کا بدلہ لوٹا رہا تھا۔ میں جھک کر اُسے پیار کرنے لگی۔ وہ کسی پالتو جانور کی طرح میرے اردگرد دم ہلانے لگا۔

''لو بھئی عائشہ تمہارا باڈی گارڈ تم تک خود ہی پہنچ گیا۔'' رضا بھائی محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے آج سے اِس کا نام موتی ہے میرا محافظ!'' میں نے موتی کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

امی ابو اور رضا بھائی میرا اور موتی کا پیار دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

☆......☆......☆

پھر اُس دن کے بعد سے موتی ہمارے گھر کا فرد بن گیا تھا۔ وین والے کا گلی میں گھسنا بالکل بند تھا۔ جہاں کہیں بھی اُس پر نظر پڑ جاتی موتی بھونکنا شروع کردیتا تھا۔ وین والا بھی شاید موتی کے رعب میں آچکا تھا۔ میرے گھر کے قریب سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ موتی نے میرے ساتھ کالج جانا شروع کردیا تھا۔ اُس کی موجودگی کے باعث میں کافی سکون محسوس کرتی تھی۔ موتی کے آنے سے میری زندگی بہت آسان ہوگئی تھی۔ میں نے اِس بے زبان معصوم جانور کے بےلوث جذبات کی دل سے مشکور تھی۔

میں ابھی کالج سے لوٹی تھی کہ معلوم ہوا کہ بھائی کی آفس فائل گم ہوگئی ہے بہت ڈھونڈنے کے باوجود مل کے نہ دے رہی تھی۔ امی ابو بہت پریشان تھے۔ موتی نے ہماری باتوں سے جانے کیا اندازہ لگایا کہ گھر کے کونے کونے میں گھس گیا اور فائل تلاش کرنے لگا۔

''یار نہ تنگ کرو۔'' بھائی نے پلٹ کر موتی کو کہا جو جانے کیوں اُن کی قمیض کا کونہ کھینچ رہا تھا۔

''پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہا ہے۔'' میں مسلسل موتی کی طرف متوجہ تھی۔

''بیٹا سن لو دیکھ لو کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ جانوروں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔'' ابو نے موتی کی پریشانی دیکھ کر کہا۔

رضا بھائی جو موتی سے چڑ رہے تھے۔ ابو کے سمجھانے پر موتی کے ساتھ چل پڑے۔ واپسی پر وہ گمشدہ فائل اُن کے ہاتھ میں تھی۔

ابو سارا گھر چھان مارا تھا مگر فائل مل نہیں رہی تھی

یہ موتی پتا نہیں کیا چیز ہے جو فائل تک پہنچ گیا مان گئے باس!'' رضا بھائی کے لہجے میں اطمینان کے علاوہ موتی کے لیے شکریہ بھی تھا۔

اور موتی دودھ پینے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اُس کی بے نیازی دیکھ کر ہم سب ہنس پڑے۔

☆......☆......☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کبریٰ خالہ کھڑی تھیں۔ ہماری پڑوسن......

''آئیں خالہ اندر آجائیں!'' میں نے انہیں سلام کرتے ہوئے شائستگی سے کہا۔ کبریٰ خالہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے عینک سے گھورا تھا۔

''بھئی عائشہ یہ کتا کیوں پال لیا ہے تم لوگوں نے!'' کبریٰ خالہ امی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''ارے آپا پالا کہاں ہے۔ اپنی عائشہ کا بہت خیال رکھتا ہے اس لیے گھر میں رکھ لیا ہے۔'' امی نے پیار سے موتی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے فضیلت مگر گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے یہ بھی تو سمجھا کرو۔'' کبریٰ خالہ نے ذہن لڑاتے ہوئے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔

''بالکل بجا فرمایا آپا مگر ہم نے اِسے پالا نہیں ہے نہ ہی اِسے پالنا ہمارے شوق میں آتا ہے۔ احسان کے بدلے میں بے چارہ بے زبان احسان کر رہا ہے۔'' امی وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

''جیسی تم لوگوں کی مرضی مگر دیکھنا کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے۔'' کبریٰ خالہ نے ایک تنقیدی نظر موتی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کریں آپا ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' امی نرمی سے بولیں۔ کبریٰ خالہ جاتے ہوئے مجھے اور موتی کو تنقیدی نظروں سے دیکھنا نہیں بھولی تھیں۔

☆......☆......☆

امی کی کزن کی بیٹی کی شادی تھی۔ اسی لیے وہ رضا بھائی کے ساتھ شہر سے باہر گئے تھے۔ میں ابو کی طبیعت کی خرابی کی بناء پر اُن کے ساتھ گھر رُک گئی تھی۔ رات کو ابو کی طبیعت مزید بگڑ گئی تھی۔ اُن کی ایک بہت ضروری دوا بھی ختم ہوگئی تھی۔ میں بہت پریشان تھی۔ ابو کی بگڑتی حالت مجھے مزید ہراساں کر رہی تھی۔ موتی ہمارے قریب ہی بیٹھا تھا اور نا جانے کب سے ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ میری بے چینی اور ابو کی بگڑتی حالت پر وہ بھی اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا۔ میں دوائیوں کے نسخے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا کروں کہ اچانک سے ہی موتی نے میری قمیض پکڑ کر مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اور پھر اُس رات موتی نے مجھ پر اور میرے گھر پر ایک اور احسان کیا تھا۔ ابو کو دوا لا کر دی۔ صبح ابو اٹھے تو اُن کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ میں نے ساری بات انہیں بتائی تو انہوں نے موتی کو بہت پیار کیا تھا۔ میں جو رات کے وقت اکیلے جانے سے خوف زدہ تھی۔ موتی کی وجہ سے یہ کام بھی آسانی سے ہو گیا تھا۔ موتی کی موجودگی سے مجھے بہت حوصلہ ہوا تھا۔

☆......☆......☆

رضا بھائی جاگنگ کے لیے جا رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا انہوں نے مجھے آفر کی ساتھ جانے کی تو میں جھٹ تیار ہوگئی تھی۔ اور موتی اُس سے تو پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں تیار دیکھ کر وہ ہم سے پہلے چھلانگ مار کر باہر نکلا تھا۔ سارے راستے ہم موتی کی اچھل کود سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ موسم بے حد سرد تھا۔ وقفے وقفے سے دھوپ بھی نکل آتی تھی مگر سردی برقرار تھی۔ پارک میں بھی کافی گہما گہمی تھی۔ بھائی جاگنگ کرنے چلے گئے تھے اور میں موتی کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ قریب ہی ایک بے حد پیاری سی بچی بال سے کھیل رہی تھی۔ اُس کا بال بار بار میرے قریب آجاتا تھا جسے میں مسکرا کر اُسے پکڑا دیتی تھی۔

موتی نرم نرم گھاس پر آرام فرما رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی پارک میں چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں میں اور بھائی وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہی چھوٹی سی بچی جو بال سے کھیل رہی تھی وہ جھیل میں گر گئی تھی۔ اپنا بال جھیل سے نکالنے کے باعث وہ خود بھی پانی میں گر چکی تھی۔ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ بچی

کی ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بچی کو کیسے بچائے کہ اچانک موتی نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ شاید وہ جانور ہم سب سے زیادہ سمجھدار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک منٹ ضائع کرنے کا مطلب تھا کہ بچی کی جان جا سکتی تھی۔

موتی بچی کو اس کے فراک سے پکڑ کر کنارے تک لے آیا تھا اور بھائی نے آگے بڑھ کر بچی کو باہر نکالا تھا۔ بچی کی ماں نے اُسے سینے سے لگا لیا وہ ابھی بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ بچی کی ماں نے میرا اور بھائی کا بہت شکریہ ادا کیا۔ حالانکہ شکر تو اُس پاک ذات کا تھا جس نے موتی کے ذریعے بچی کی جان بچائی۔ تمام لوگ موتی کی بہادری کی بے حد تعریف کر رہے تھے۔ موتی پانی جھاڑ کر اپنا جسم بار بار خشک کر رہا تھا۔ بھائی نے موتی کے سر پر تھپکی دی اور کہا۔

''موتی آج تو تم ہیرو لگے ہو۔''

☆......☆......☆

گھر آنے تک موتی کافی سُست ہو گیا تھا۔

ہیٹر کے سامنے بیٹھ گیا تھا اور بار بار سو جاتا تھا۔ شاید گیلا ہونے کی وجہ سے اُسے سردی لگ گئی تھی۔ بھائی نے کھانا سامنے رکھا مگر موتی نے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

''عائشہ مجھے لگتا ہے موتی کو سردی لگ گئی ہے اِسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔'' رضا بھائی نے موتی کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ بھائی موتی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔

اسی دوران میری دوست ثانیہ کا فون آ گیا اُس کی کل سالگرہ تھی۔ بے حد اصرار کر رہی تھی کہ میں ضرور آؤں مگر میں موتی کی وجہ سے فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ بھائی گھر آئے تو بتایا کہ موتی کو سردی لگ گئی تھی۔ انجکشن کے بعد اب وہ آرام سے سو رہا تھا۔ میں نے سالگرہ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

صبح میں نے دیکھا تو موتی ابھی تک سو رہا تھا۔

اتنی دیر میں ثانیہ کا پھر فون آ گیا۔ عائشہ جب تک تم نہیں آؤ گی میں کیک نہیں کاٹوں گی۔'' ثانیہ کی آواز میں محبت بھرا اصرار تھا۔

میں پھر اُلجھ سی گئی امی نے دیکھا تو کہا۔

''تم چلی جاؤ تھوڑی دیر کی بات ہے تم جاؤ موتی ابھی سو رہا ہے۔''

☆......☆......☆

سالگرہ کا فنکشن بہت اچھا رہا۔ ثانیہ خوب چہک رہی تھی کہ اتنی دیر میں امی کا فون آ گیا۔

''عائشہ بیٹا کب تک پہنچ رہی ہو؟'' امی نے پوچھا۔

''کیوں امی کیا ہوا خیریت؟'' میں نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے وہ موتی جاگ گیا ہے اور سارے گھر میں تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ کھانا دے رہی ہوں کھانا نہیں کھا رہا۔'' امی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ جیسے ہی میں گھر آئی تو موتی پر نظر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی لیٹا رہا تھا۔

''کیسا ہے میرا دوست؟'' میں نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ موتی نے آنکھ کھول کر دیکھا تھا اور پھر فوراً بند کر لی تھی۔ یعنی کہ ناراضگی برقرار تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں گئی تو پھر اس کی سزا ملنی چاہیے میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گی آج!'' میں نے موتی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

موتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا اور پھر کھانا کھانے لگ گیا تھا۔ میں اور امی اس کی حرکت پر مسکرا دیے تھے۔

☆......☆......☆

رات کافی ہو چکی تھی۔ کبریٰ خالہ کے گھر سے ڈھولک بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُن کی بیٹی کی شادی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ہی اُن کے گھر سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ چور چور کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ابو اور بھائی فوراً باہر گئے تھے۔ موتی بھی اُن کے پیچھے لپکا تھا۔

کبریٰ خالہ نے بہت محنت مشقت سے بیٹی کا

جہیز تیار کیا گیا تھا۔ نا جانے کیا ہو گیا تھا اچانک۔ میں دل گرفتگی سے سوچ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ابو اور بھائی آگئے ان کے ساتھ موتی بھی تھا۔ باہر اب خاموشی تھی۔ ابو نے آتے ہی بتایا کہ کبریٰ خالہ کے گھر چور آگئے تھے۔ سارا سامان لوٹ کر لے جا رہے تھے کہ موتی پہنچ گیا۔ ایک چور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا کہ موتی نے بھاگ کر اُس کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔ اُس نے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر موتی نے اُس کی جان نہیں چھوڑی۔ اُس کا ساتھی یہ صورتحال دیکھ کر بھاگ نکلا۔ اور وہ آدمی جس کی ٹانگ موتی نے پکڑی تھی اُسے محلے والوں نے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اگر موتی وہاں بروقت نہ پہنچتا تو کبریٰ بے چاری کی ساری جمع پونجی لٹ جاتی۔'' ابو نے موتی کی جرأت مندی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح کبریٰ خالہ گھر آئیں۔ موتی کو دیکھ کر وہ مسکرائے جا رہی تھیں۔ امی اور میرا بار بار شکریہ ادا کر رہی تھیں۔

''فضیلت اگر رات موتی نہ آتا تو وہ چور تو سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہمارے لیے تو یہ خدا کی رحمت بن کر آیا تھا۔'' کبریٰ خالہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔

''بس خالہ اللہ نے دنیا میں کوئی بھی شے بیکار نہیں بنائی۔ یہ جانور اور پرندے تو بہانا ہیں انسان کی حفاظت کا۔ اور بعض اوقات تو یہ بے زبان مخلوق وہ کام کر جاتی ہے جو ہم انسان نہیں کر پاتے۔ اللہ کی یہ مخلوق بے حد معصوم اور حساس ہوتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے خالہ کو تسلی دی۔

کبریٰ خالہ کے چہرے پر شرمندگی سی تھی۔ جو انہوں نے اُس دن موتی کے بارے میں سخت الفاظ کہے تھے۔

''میری بیٹی کی شادی میں ضرور آنا۔'' اور جاتے وقت وہ موتی کے سر پر پیار کر کے گئی تھیں۔

☆☆☆

امتحان سر پر تھے میں رات کو دیر تک پڑھتی تھی۔ چھت پر ہلکے سے شور کی آواز آئی تھی۔ جیسے کوئی چھت پر چل رہا ہو۔ موتی بظاہر سو رہا تھا۔ مگر فوراً چوکنا ہو جاتا تھا۔ اور بھونکنے لگ جاتا تھا اور پھر دوبارہ خاموشی چھا جاتی تھی۔ موتی پابندی سے میرے ساتھ کالج جاتا تھا۔ پیپر بہت اچھے ہوئے تھے۔ میں دن رات اپنی کامیابی کے لیے دعا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک رات موتی ایک دم اُٹھ گیا تھا۔ مسلسل بھونکتا جا رہا تھا۔ بار بار سیڑھیاں چڑھ کے چھت پر جاتا تھا اور بھونکتا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی راتوں سے جاری تھا۔ چھت پر جا کر ابو اور بھائی نے بھی دیکھا مگر کوئی نہ تھا۔ مگر میرے دل میں وہم بیٹھ گیا تھا کہ موتی بلاوجہ نہیں بولتا اور وہ مسلسل بھونکتا رہتا تھا۔

بار بار چھت پر جانے کی وجہ سے بھائی نے موتی کو زنجیر سے باندھ دیا تھا اور یہی رضا بھائی کی غلطی تھی۔ ہم سب سو رہے تھے کہ موتی کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آج موتی بالکل خاموش نہیں ہو رہا تھا۔ بندھا ہونے کے باعث وہ بہت بے چین تھا۔ اتنی دیر میں چھت پر شور کی آواز آئی۔ میں کچھ دیر لیٹی رہی۔ شور کی آواز تیز ہونے لگی تھی۔ جیسے چھت پر کوئی کودا ہو۔ موتی کے بھونکنے میں بھی شدت آگئی تھی۔ میں جو خوفزدہ تھی۔ امی اور ابو بھائی بھی اٹھ گئے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی ہماری آنکھیں خوفناک منظر دیکھ رہی تھیں۔ ہمارے گھر میں چور گھس آئے تھے۔

''خبردار کوئی بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو!'' ایک چور نے پستول لہراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''گھر میں جو بھی کچھ ہے ہمارے حوالے کر دو۔'' ایک دوسرا چور بولا تھا۔ موتی مسلسل بھونک رہا تھا۔

میرے گلے میں سونے کی چین اور کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں۔ ایک چور مسکراتا ہوا قریب آگیا تھا۔ اُسے قریب آتا دیکھ کر خوف سے میرے

منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اور کیسے ہو سکتا تھا کہ موتی کو میری آواز آتی اور وہ نہ آتا۔

موتی بھاگتا ہوا آیا تھا۔ شاید اُس نے زنجیر توڑ دی تھی۔ موتی نے آتے ہی ایک چور کی ٹانگ پکڑ لی چور نے خوفزدہ ہو کر شیشے کا گلدان موتی کو دے مارا۔ جس سے وہ زخمی ہو گیا مگر ٹانگ نہ چھوڑی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتا کہ میرے مالک مشکل میں ہوں اور میں مدد نہ کروں۔

''فائر مار فائر!'' ایک چور نے چلا کر دوسرے کو پکارا تھا۔ وہ موتی کو مارنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ رضا بھائی جو موقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اُسے زور کا دھکا دیا تھا۔ چور گر تو گیا مگر گرتے گرتے گولی چلا دی جو موتی کو لگ گئی۔ گولی کی آواز پر اردگرد کے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ چوروں کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ امی اور میرا رو رو کر بُرا حال ہو گیا تھا ابو اور بھائی موتی کو اسپتال لے گئے تھے امی مجھے حوصلہ دے رہی تھیں۔

فجر کی اذان کی آواز آئی تو ہم نے وضو کر کے نماز پڑھی تو میری دعا صرف موتی کی زندگی کے لیے تھی۔ نماز کے دوران بھی میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔ موتی کا خون میں لت پت جسم میری نظروں کے سامنے بار بار آ رہا تھا۔

''یا اللہ میرے دوست کو بچا لے۔'' میرے لبوں سے یہ دعا نکلی تھی۔

کچھ دیر بعد ابو نے فون کیا تھا۔ میرے اندر سُننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مگر امی نے سُنا ابو نے بتایا تھا کہ موتی بچ گیا ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گولی ٹانگ کو چھو کر گزری تھی۔ میں نے اللہ کے حضور سجدہ شکر کیا تھا۔

موتی کی ٹانگ پر پٹی بندھی تھی۔ میں دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے ایک دو بار دیکھا تھا اور پھر سو گیا۔ موتی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُس کا زخم بھر گیا تھا۔ ابو نے آفس جاتے ہوئے موتی کو کہا۔

''بس بہت ہو گیا آرام' شام کو ہمارا ٹائیگر گیٹ کے پاس ملے۔''

☆......☆......☆

میرا رزلٹ نکل چکا تھا۔ سب گھر والے بہت خوش تھے۔ مجھے بہت اچھے سے کالج میں جاب مل گئی تھی۔ ابو نے گھر میں چھوٹی سی دعوت رکھی تھی۔ سب نے مجھے بہت اچھے سے تحائف دیے تھے۔ موتی کہاں پیچھے رہ سکتا تھا۔ بھاگتا ہوا باغ میں گیا۔ اور منہ میں گلاب کا بڑا سا پھول دبائے۔ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ امی نے کہا۔

''لو عائشہ موتی بھی تمہارے پاس ہونے کا تحفہ لایا ہے۔'' موتی کو دیکھ کر سب گھر والے مسکرانے لگے۔

ابو نے کالج کے لیے ڈرائیور رکھوا دیا تھا۔ میں چھٹی کے وقت انتظار کر رہی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موتی بیٹھا ہوا تھا وہ شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میری موتی کو دیکھ کر ہنسی نکل گئی کہ ڈیوٹی کے معاملے میں ''نو کمپرومائز''......

☆......☆......☆

موتی کی بے مثال محبت کو دیکھ کر اکثر میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ معاشرے کا بے حد حقیر سا جانور ہم بے حس لوگوں کی خاطر اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتا اور ہم انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں۔ جو ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ جہاں دہشت گردی کے ذریعے معصوم جانیں لے لی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ اسکول کے معصوم بچے بھی ہمارے شر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انسانیت دن بدن اپنے مقام سے گرتی جا رہی ہے۔

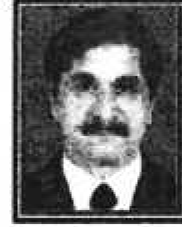
کیا انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔

مگر نہیں حیوان ہمیں اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا ہم انسان ایک دوسرے کو پہنچا رہے ہیں کاش ہم سمجھ جائیں۔ اور ہاں مجھے یہ کہنے میں اب کوئی عار نہیں کہ موتی آئی لو یو۔

☆......☆......☆

گیارہویں سچ بیانی

کر بھلا سو ہو بھلا



ممتاز احمد

اُس شخص کا قصہ، جس نے ہمیشہ خیر خواہی کو شعار بنایا

ہماری رہائش ایک دور افتادہ انتہائی پسماندہ گاؤں میں تھی جہاں نہ بجلی تھی، نہ ٹیلی فون، نہ ہسپتال اور نہ ہی شہر سے ملانے والی کوئی سڑک۔ گاؤں میں بہت زیادہ غربت تھی۔ میرے والد ساتھ والے گاؤں کے ایک زمیندار کے مزارع تھے۔ وہ دن رات کھیتوں میں کام کرتے جس کے بدلے میں ہمیں سال بھر کے لیے گندم مل جاتی اور کچھ روپے بھی جس سے گزر بسر ہو جاتی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا غربت کے ماحول میں میری پرورش ہوئی۔ گاؤں میں کوئی اسکول نہ تھا۔ ساتھ والی گلی میں ایک استانی بھی رہا کرتی تھیں جن سے میں نے قرآن پاک ناظرہ پڑھا اور انھیں سے ہی پکی کا قاعدہ پڑھا اور تختی لکھنا سیکھی۔

جب میری عمر دس سال ہوئی تو ہوا کچھ یوں کہ جس زمیندار کے میرے والد مزارع تھے اس نے اپنی کچھ زمین بیچ دی اور کھیتی باڑی کے لیے ٹریکٹر ہل، ٹرالی وغیرہ لے آیا اسی طرح گندم کاٹنے اور گاھنے کے لیے ویٹ تھریشر جیسے زرعی آلات لے لیے جس کا نتیجہ یہ نکلا بہت سارے لوگ بے روزگار ہو گئے اور ان بے روزگار ہونے والوں میں میرے والد بھی تھے۔ کیونکہ وہ صرف مزدور تھے کوئی ٹیکنیکل کام نہ کرسکتے تھے۔ دراصل پہلے کھیتوں میں ہل بیلوں سے چلایا جاتا فصلوں کی کاشت کٹائی وغیرہ سب کام ہاتھ سے سرانجام دیے جاتے تھے۔ مگر اب یہی کام ٹریکٹر ہل اور دیگر زرعی آلات سے ہونے لگے ہیں۔ والد صاحب نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے شہر کا رخ کیا جہاں انھیں بھاگ دوڑ کے بعد ایک بہت بڑی فیکٹری (مل) میں مزدوری کی نوکری مل گئی جہاں وہ آٹھ گھنٹے معمول کی ڈیوٹی سرانجام دینے کے علاوہ کچھ اوور ٹائم بھی لگا لیتے۔ ابا مہینے بعد گھر آتے تھے اور ایک دو دن رہ کر پھر شہر چلے جاتے۔

کوئی سال ڈیڑھ سال کے بعد ابا کی نوکری مل میں پکی ہوئی اور اُن کو مل کی کالونی میں ایک چھوٹا سا فیملی کوارٹر مل گیا تو وہ مجھے اور امی کو شہر لے کر آ گئے۔ مجھے ایک قریبی سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔ میں زندگی میں پہلی بار شہر آیا تھا۔ بڑی بڑی سڑکیں، گاڑیاں، اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک بہت بڑا صنعتی شہر تھا۔ یہاں بجلی، گیس، ٹیلی فون وغیرہ ہر طرح کی سہولیات تھیں اور سچ یہ ہے کہ مجھے شہر بہت اچھا لگا تھا۔ میں اکثر دعا کرتا کہ اب ہمیں کبھی گاؤں واپس نہ جانا پڑے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ گاؤں کی نسبت یہاں آسودگی تھی۔ ابا اپنی تنخواہ اور اوور ٹائم کے پیسے لاکر اماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے جسے وہ بڑی کفایت شعاری سے خرچ کرتیں اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچت بھی کرلیتیں۔ سال میں ایک بار بونس بھی مل جاتا تھا۔ قصہ کوتاہ گاؤں کی نسبت زندگی کا وہ دور بہت اچھا تھا اور وقت خوشگوار اور بھلا گزر رہا تھا۔

اس وقت میری عمر 18 سال تھی میں نے کلاس 9th کا امتحان دیا تھا تو ایک رات ابا بھلے چنگے سوئے مگر صبح جب اپنے مقررہ وقت پر نہ جاگے انھیں اٹھانے کی کوشش کی گئی مگر پتا نہیں رات کے کس پہر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

اگلے دن عصر کے بعد انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مل کے ویلفیئر فنڈ سے ابا کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔ کچھ مالی مدد بھی کی گئی۔ اب مل کے قواعد وضوابط کے مطابق کسی ورکر کی موت کے بعد اُس کے بیٹے یا بیٹی کو مل میں ملازمت مل سکتی تھی۔ تھوڑی سوچ بچار کے بعد میں نے مل میں نوکری کے لیے اپلائی کر دیا۔ کیونکہ ابا تو اس دنیا میں رہے نہیں تھے آمدنی کا ذریعہ بند ہو گیا' دوسرا ہمیں مل کا کوارٹر بھی خالی کرنا پڑتا۔ اب میں جوانی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا تو اب ظاہر ہے زندگی کا پہیہ چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی روزگار تو تلاش کرنا ہی تھا۔ سردست اسی مل میں نوکری کرنا ہی ہر لحاظ سے سودمند تھا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھے مل میں نوکری کا پروانہ مل گیا۔

☆☆☆

شروع میں میرے ذمے یہ کام تھا آنے اور جانے والی گاڑیوں سے مال لوڈ، اِن لوڈ کرنا تھا۔ مل بہت بڑی تھی اور یہاں پر کئی قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی تھیں تو سارا دن ٹرکوں کی آمدورفت جاری رہتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسال کا عرصہ بیت گیا میری پڑھائی چھوٹ گئی۔ 9th کلاس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ اسی دوران میری ڈیوٹی تبدیل ہوتی رہی۔ اسی فیکٹری (مل) سے بہت سی مصنوعات روزانہ دوسرے شہروں میں بذریعہ ٹرک بھیجی جاتی تھیں۔ جہاں ٹرک وغیرہ نہیں جاتے تھے تو وہاں بذریعہ مال گاڑی (ٹرین) کے ذریعے بھیجا جاتا۔ اب میری

ڈیوٹی ادھر لگ گئی۔ صبح آٹھ بجے ایک مال گاڑی نکلتی تھی تو میں روزانہ سامان کے کارٹن ایک مزدا منی ٹرک میں لوڈ کروا کے ریلوے اسٹیشن لے آتا اور مال گاڑی میں بک کروا کر رسید لے کر واپس مل چلا جاتا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو کہ خوب صورت نہیں تھی سانولا رنگ معمولی نین نقش درمیانہ قد اور تھوڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ اس کے لباس اور جسمانی خدوخال اس کی غربت کی عکاسی کرتے نظر آتے تھے۔ وہ روزانہ ریلوے اسٹیشن پر نظر آتی تھی اور دوسرے پلیٹ فارم جہاں سے ایک پسنجر ٹرین چلتی تھی وہاں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ میں اُسے سرسری طور پر چند لمحوں کے لیے دیکھتا پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ مجھے دیکھتی یا نہیں دیکھتی اس بات کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

ایک دن ریلوے اسٹیشن سے باہر میں کارٹن اتروا رہا تھا تو دیکھا کہ وہ لڑکی لنگڑاتی ہوئی آ رہی تھی' تین چار لفنگے منچلے اس پر آوازیں کس رہے تھے کوئی اُسے لنگڑی بندریا، کوئی لنگڑی معذور کے القابات سے نواز رہے تھے۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ مجھ سے یہ دیکھ کر برداشت نہ ہوا تو اپنے ساتھ تین چار مزدوروں کو لے کر میں نے اُن لفنگے منچلوں کو ڈانٹا اور خوب برا بھلا کہنے کے ساتھ وارننگ دی کہ اب اگر اس لڑکی کو چھیڑا یا یہاں نظر آئے تو پھر تمہاری ہڈی پسلیوں کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں ہو گی۔ اس سے اگلے لمحے وہ فوراً رفو چکر ہو گئے۔ لڑکی نے متشکرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور اسٹیشن چلی گئی۔ چونکہ اسی ٹائم پر میں بھی سامان کے ساتھ روزانہ آتا تھا تو اب وہ لفنگے منچلے نظر نہیں آتے تھے۔ اب کبھی کبھار ہماری بات چیت بھی ہو جاتی کئی دفعہ اس کی گاڑی لیٹ ہوتی تو میں دس پندرہ منٹ کے لیے اس کے پاس بیٹھ جاتا۔

اس سے تفصیلی تعارف ہونے پر معلوم ہوا وہ بہت ہی مظلوم لڑکی تھی۔ اس کی ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس کے تینوں بھائی شادی شدہ تھے دو بھائی تو دوسرے شہروں میں تھے وہ اپنے تیسرے بھائی کے ساتھ یہاں اس شہر میں رہ رہی تھی۔ اس کی بھابی بہت ظالم عورت تھی وہ دن بھر اسے طعنے دیتی' گالیاں دیتی اور کوسنے دیتی رہتی اسے کھانے کو کچھ نہ دیتی تھی۔ اس کا بھائی جورو کا غلام تھا۔ اس بے چاری کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔ لڑکی نے اپنا نام نرگس بتایا تھا۔ نرگس ساتھ والے ایک قریبی شہر میں ایک پرائیویٹ ہسپتال میں معاون نرس کا کام کرتی تھی جس سے اسے اتنے پیسے مل جاتے وہ اپنی گزر بسر کر رہی تھی۔ مجموعی طور پر نرگس کی زندگی بہت کٹھن اور تکلیف دہ تھی۔ وہ بے چاری آنے والے اچھے دنوں کی آس میں زندگی گزار رہی تھی۔

سیانے کہتے ہیں ہمیشہ اپنے سے نیچے دیکھو تو انسان کے اندر شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوں گے اور نعمتوں کی قدر آئے گی۔ دوسروں کے دکھ تکلیف پریشانیاں دیکھ کر انسان کو اپنے حالات میں ہزار گنا خوشحالی آسودگی اور سکھ نظر آتے ہیں۔ میں اکثر اپنے حالات خاص طور پر گاؤں میں گزری غربت کی زندگی کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتا رہتا تھا۔ مگر جب نرگس کو دیکھا تو مجھے اپنی زندگی اس سے بہت بہتر اور اچھی لگی۔ گو کہ نرگس خوب صورت لڑکی نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور سادگی تھی۔ مجھے اُس سے دلی ہمدردی تھی۔ میرے دل میں اکثر خیال آتا تھا کہ کاش میرے پاس اتنی دولت ہو جس سے میں نرگس کی مالی مدد کر سکوں۔ امی جان کی طبیعت اب تھوڑی تھوڑی خراب رہنے لگی تھی ان کو جوڑوں کا درد لاحق ہو گیا تھا۔ اب وہ صحیح طرح سے گھر کا کام بھی نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ جلد از جلد میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے اردگرد کے گھروں میں نظر رکھے ہوئے تھیں مگر ابھی تک انھیں میرے جوڑ کی کوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ جو تین چار لڑکیاں پسند آئیں ان کے والدین نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم ان کی نظر میں بھوکے ننگے لوگ تھے۔

ایک رات میں لیٹا ہوا تھا نیند نہیں آ رہی تھی۔ نرگس کا چہرہ میری آنکھوں کے آگے آ رہا تھا۔ یکلخت میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا کہ اگر میرے پاس دولت نہیں ہے جس سے میں نرگس کی مالی مدد کر سکوں کوئی ضروری تو نہیں کہ خوشیاں صرف دولت سے ہی ملتی ہیں۔ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں مگر یہ زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا۔ میں نرگس کو اپنا کر عزت دے کر اس کی عذاب بھری زندگی سے نجات دلا کر خوشی اور سکھ تو دے سکتا تھا اور میرے اس عمل سے اللہ مجھ سے کتنا خوش اور راضی ہوتا...... گویا میں نے نرگس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے دن میں نے نرگس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہتے خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

آنے والے دنوں میں تمام معاملات خوش اسلوبی سے سرانجام پا گئے اور انتہائی سادگی سے نکاح ہوا اور نرگس میری دلہن بن کر آ گئی۔

نرگس کے چہرے سے ہر دم خوشی پھوٹتی تھی ایسے لگتا تھا جیسے اُسے دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہو۔ میں نے نرگس کی ہسپتال والی نوکری چھڑا دی تھی۔ نرگس نے شادی کے دوسرے دن سے ہی گھر سنبھال لیا۔ وہ امی جان کی دل سے خدمت کرتی اور بدلے میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ پیار وصول کرتی۔ میرا بھی ہر طرح سے خیال رکھتی۔ وہ بہت ہی اچھی بیوی ثابت ہوئی اس نے گھر کو چھوٹی سی جنت بنا دیا۔

نرگس اکثر و بیشتر میرے ذہن میں یہ بات ڈالتی رہتی کہ اپنا گھر ہونا چاہیے۔ بے شک چھوٹا سا ہو مگر ہو اپنا۔ بقول اس کے جب تک مل کی نوکری ہے تو یہ کوارٹر بھی ہے اگر خدانخواستہ نوکری ختم ہو جائے تو یہ کوارٹر بھی ہم سے چھن جائے گا۔ بات تو اس کی ہر لحاظ سے درست اور حقیقت پر مبنی تھی۔ اب میں نے معمول کی ڈیوٹی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اوور ٹائم بھی لگانا شروع کر دیا۔ نرگس پائی پائی جوڑ رہی تھی۔ اپنا گھر اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔ اللہ نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی صورت میں اولاد سے نوازا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا بچے بڑے ہونے لگے۔ انھیں سرکاری اسکولوں میں داخل کروا دیا گیا۔ میری ڈیوٹی مختلف شعبوں میں تبدیل ہوتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ میری اور نرگس کی خدمت گزاری کی وجہ سے امی جان ہم دونوں سے بہت خوش تھیں وہ ہماری سلامتی، صحت، خوشحالی اور خیر و برکت کے لیے ہر وقت اللہ کی بارگاہ میں دعا گو رہتیں۔ وہ سارا دن اپنے پوتے نبیل اور پوتیوں شائلہ اور نائلہ کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔ گھر میں ہر طرح سے سکون تھا۔

☆☆☆

مل مالکان کی تعداد تین تھی۔ سیٹھ حارث، سیٹھ عبداللہ اور سیٹھ فضل کریم یہ تینوں سیٹھ صاحبان مل کے برابر کے شراکت دار تھے۔ مل کا رقبہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ مل کے رہائشی ایریا میں تینوں سیٹھوں کی بہت بڑی بڑی اور عالیشان کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں جہاں وہ اپنی اپنی فیملیز کے ہمراہ رہائش پذیر تھے۔ مل کے جس شعبہ میں میں کام کرتا تھا وہ براہِ راست سیٹھ فضل کریم کی نگرانی میں آتا تھا۔

سیٹھ فضل کریم ایک با اصول اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ سیٹھ صاحب نے اپنی بیٹی کا رشتہ اپنی ہم پلہ فیملی سیٹھ روشن کے بیٹے فیضان سے طے کیا اور آنے والے جمعہ کو منگنی کی تقریب ہونا تھی۔ سیٹھ صاحب منگنی کی تقریب کو یادگار بنانا چاہتے تھے کیونکہ ان کی اولاد میں سب سے بڑی بیٹی کی منگنی تھی اور پہلا خوشی کا فنکشن تھا۔ وسیع پیمانے پر تیاریاں کی جا رہی تھیں انواع و اقسام کے پکوان تیار کرنے کے لیے ماہر کاریگروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کھلے میدان میں شامیانے ٹینٹ لگائے جا رہے تھے۔ تقریب کے انتظامات کے سلسلہ میں کام کاج کے لیے سیٹھ فضل کریم نے اپنے شعبے کے چیدہ چیدہ ملازمین کو بلایا ہوا تھا اور ان میں بھی

شامل تھا۔

ہم سب ملازمین بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے کہ سیٹھ صاحب کو کسی قسم کی شکایت کا کوئی موقع نہ ملے۔

جمعہ کے روز وقت مقررہ پر مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ لڑکے والے بھی آگئے۔ سیٹھ صاحب کی بیٹی بہت ہی خوب صورت، معصوم اور حور لگ رہی تھی جبکہ اس کا منگیتر شکل سے ہی انتہائی عیار، تیز طرار اور مکار نظر آرہا تھا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا نہیں لگا تھا اس کے برعکس سیٹھ صاحب کی بیٹی پری لگ رہی تھی۔

خیر منگنی کی تمام رسومات کی ادائیگی کے بعد تمام مہمانوں کو پُر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ اس روز میں نے پہلی دفعہ سیٹھ صاحب کی بیگم صاحبہ کو دیکھا تھا۔

ہم تمام ملازمین پوری رات کام میں مصروف رہے۔ بہر حال یہ تقریب بہت شان دار رہی اور تمام معاملات بخیر وخوبی سر انجام پائے۔

کوئی ایک ماہ بعد سیٹھ فضل کریم صاحب نے میری ڈیوٹی مل کے سیلز آفیسر کے ساتھ لگادی۔ اب میں اُس کے ساتھ مختلف شہروں میں جانے لگا۔ اسی روٹین میں تین چار ماہ گزر گئے۔

ایک مرتبہ ایک بہت بڑے شہر میں جانا ہوا یہاں کام زیادہ تھا تو تین چار دن یہاں رکنا تھا۔ سیٹھ روشن کا بزنس بھی اسی شہر میں تھا۔ سیٹھ روشن کا بہت بڑا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ وہ فرم کے چیئرمین تھے۔ جبکہ ان کا بیٹا فیضان (جس کی منگنی سیٹھ فضل کریم کی بیٹی سے ہوئی تھی) فرم کا مینجنگ ڈائریکٹر (ایم ڈی) تھا۔ میرا مختلف فرمز میں آنا جانا ہوتا رہا۔ اگلے دن ایک فرم میں گیا تو وہاں چار پانچ گھنٹے کا کام تھا۔ مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی تو میں آفس سے اُٹھ کر بلڈنگ سے باہر آیا کار، موٹر سائیکل پارکنگ کے ساتھ ایک کیفے ٹیریا تھا تو میں وہاں ایک سائیڈ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ وہاں ایک جانب میرے قریب ہی دو بندے بیٹھے آپس میں محو گفتگو تھے جب ان کی باتوں میں سیٹھ روشن اور فیضان کا ذکر آیا تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نامحسوس انداز سے ان کے بالکل اور قریب ہو کر بیٹھ گیا اور بظاہر لاتعلق سا ہو کر اخبار کا ورق گردانی کے ساتھ سگریٹ نوشی کرتا رہا اور بڑے دھیان توجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان بندوں کی گفتگو سے سنی گئی باتوں کا نچوڑ اور خلاصہ یہ تھا۔ بظاہر تو سیٹھ روشن اور اس کے بیٹے فیضان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا مگر اس کی آڑ میں بہت سارے غیر قانونی دھندے ہوتے تھے۔ فیضان ایک عیاش اور شراب، جوا اور عورت کا رسیا تھا۔ اس نے پہلے ایک شادی کی' سال بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اس کے بعد اس نے ایک خفیہ شادی کر رکھی تھی اور اب تیسری شادی کے لیے سیٹھ فضل کریم کی بیٹی سے منگنی کروائی تھی۔ فیضان کی نظر سیٹھ فضل کریم کی دولت پر تھی۔ جو دو آدمی یہ باتیں کر رہے تھے ان میں ایک خاص فیضان کا بندہ تھا جو اس کے سارے کرتوت جانتا تھا۔ دراصل وہ بندہ بھی کسی خاص چکر میں تھا اور فیضان سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مختلف خفیہ ذرائع سے کھوج لگایا تو ان تمام باتوں کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ ان کے علاوہ بھی کئی معلومات حاصل ہوئیں۔ جن کے مطابق فیضان بہت غلط انسان تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے بعد اپنے کام نمٹا کر واپس مل میں آگیا اور دو تین دن فیضان کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر نرگس نے پوچھا کہ خیر تو ہے آج کل کس سوچ میں رہتے ہو۔' تو میں نے نرگس کو شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتادی۔ بالآخر صلاح مشورے کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ ساری صورت حال سیٹھ فضل کریم کو بتا دینی چاہیے۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس روز کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔ اس روز میں بازار گیا تو وہاں ایک بہت بڑے شاپنگ سینٹر میں بیگم صاحبہ نظر آگئیں تو میں نے آگے بڑھ کر انھیں

سلام کیا اور تعارف کروایا کہ میں آپ ہی کی مل میں کام کرنے والا ایک ورکر ہوں اور ایک بہت ضروری اور خاص بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں تو انھوں نے کہا شام کو اپنی بیوی کے ہمراہ کوٹھی آ جانا چنانچہ شام کو مقررہ وقت پر میں نرگس کو ساتھ لے کر کوٹھی پہنچ گیا۔ ہمیں کوٹھی کے لان میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ آ گئیں اور کہنے لگیں اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

تو میں نے اُن کو ساری بات بتادی جس پر وہ کہنے لگیں کہ وہ کیسے یقین کرلیں کہ سچ بتا رہا ہوں تو میں نے کہا کہ بیگم صاحبہ میں نے پوری تسلی کرنے کے بعد یہ بات آپ کے گوش گزار کی ہے۔''

تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد انھوں نے کہا کہ وہ اپنے طور پر ان باتوں کی تحقیق اور چھان بین کروائیں گی اگر یہ بات غلط ثابت ہوئیں تو وہ میری کھال اتروا دیں گی۔ تو میں نے کہا بیگم صاحبہ اگر فیضان کے بارے میں یہ باتیں غلط ثابت ہوئیں تو آپ جو سزا دیں گی مجھے وہ قبول ہوگی۔

☆☆☆

کوئی مہینہ ڈیڑھ گزرا تو بیگم صاحبہ نے اپنا ایک ملازم بھیج کر ہمیں کوٹھی بلوایا۔ وہ ہمیں پرتپاک طریقے سے ملیں۔ انھوں نے ہمیں بڑی عزت سے بٹھایا اور کہنے لگیں کہ جو باتیں تم نے بتائی تھیں وہ سچ ثابت ہوئی ہیں۔ وہ ہماری بہت ممنون اور شکر گزار تھیں۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بہت سراہا اور پھر پوچھنے لگیں کہ میں نے یہ اتنا بڑا رسک کیوں لیا اور کس مقصد کے تحت فیضان کے متعلقہ معلومات پہنچائی ہیں؟ تو میں نے نہایت احترام سے کہا کہ بیگم صاحبہ بات یہ ہے کہ میرے والد نے بارہ سال آپ کی مل میں ملازمت کی۔ ان کی وفات کے بعد مجھے نوکری ملی، مفت کا گھر ملا ہوا ہے ہم عرصہ دراز سے آپ کا نمک کھا رہے ہیں تو اس حوالے سے اپنے مالکوں کی خیر خواہی اور نمک حلالی ہمارا فرض ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے مجھے دو بیٹیاں دی ہیں تو آپ کی بیٹی جو کہ بہت معصوم اور پیاری ہے اس میں مجھے اپنی بیٹیوں کا عکس نظر آتا ہے۔ بہنیں بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ اگر میں یہ سب باتیں آپ کو نہ بتاتا اور خدانخواستہ آپ کی بیٹی کو کوئی نقصان پہنچتا تو میں سب سے بڑا مجرم گردانا جاتا اور اپنے ضمیر کی عدالت میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔

میری یہ باتیں سن کر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں انھوں نے بطور خاص ہمارا شکریہ ادا کیا اور تاکید کی کہ ان باتوں کا کسی کے آگے تذکرہ نہیں کرنا۔ انھوں نے اپنی بیٹی کی منگنی فیضان سے ختم کردی ہے۔ انھوں نے ہمیں بڑی عزت سے رخصت کیا۔

دو دن بعد سیٹھ فضل کریم نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا وہ میری نیک نیتی' میری خیر خواہی اور نمک حلالی پر بہت خوش تھے اور میرا شکریہ ادا کیا تو میں نے مؤدب ہو کر کہا۔

جناب سیٹھ صاحب بات یہ ہے کہ اپنے مالک کی خیر خواہی کرنا شریعت کا حکم ہے اور میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اللہ کریم آپ کو' آپ کی پوری فیملی اور اس مل کو سلامت رکھے۔'' تو میری اس بات پر وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فی الفور مجھے ایک انتہائی اہم شعبے کا سپروائزر انچارج بنا دیا۔ میری تنخواہ ڈبل کردی اور کالونی میں مکان بھی بڑا اور اچھا دے دیا۔ اس کے علاوہ ایک فریج، ائیر کولر اور کچھ گھریلو سامان بھی دیا۔ ان کی اس مہربانی پر میں نے رب کا شکر ادا کیا اور پہلے سے زیادہ تندہی، محنت، لگن خلوص اور وفاداری سے کام کرنے لگا۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا اسی دوران نرگس نے اپنی کفایت شعاری اور بچت سے، کمیٹیاں ڈال کر اتنی رقم جمع کرلی کہ ایک نئی کالونی میں پانچ مرلے کا پلاٹ خرید لیا۔ مل کی طرف سے بلاسود قرضہ فراہمی کی سہولت تھی تو مجھے آسانی سے قرضہ مل گیا اور مکان کی تعمیر شروع کردی۔ اللہ نے کرم کیا اور دو سال کے عرصہ میں مکان تعمیر ہو گیا۔ اپنا مکان بننے کی نرگس کو بہت زیادہ خوشی تھی وہ ہر دم اللہ کا شکر ادا کرتی اور

یقیناً میری ضعیف ماں کی دعائیں شامل تھیں۔ میں نے یہ مکان نرگس کے نام لکھوایا تھا۔ اسی دوران امی جان کا انتقال ہو گیا دوسرا یہ ہوا کہ مل مالکان کے آپس میں کچھ اختلافات ہو گئے۔ مزید حکومت کے ساتھ مالکان کی پیچیدگیاں اور قانونی معاملات ایسے ہو گئے کہ مل بند کر دی گئی اور تمام مشینری وغیرہ فروخت کر دی گئی اور تمام دفاتر، رہائشی کالونی اور مل کی زمین فروخت کر دی گئی اس طرح ایک ہزار ورکر بے روزگار ہو گئے مگر تمام ورکرز کو معقول رقم دے کر کمپن سیشن کی مد میں مالی معاونت کر دی گئی۔

مل بند ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ بنی فضائیہ کا ہوائی اڈہ بالکل قریب تھا۔ وہ سارا علاقہ ریڈ زون قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت نے مل کا وہ رقبہ پاک فضائیہ کے حوالے کر دیا جس سے ہوائی اڈہ کو وسعت دے دی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا اپنا گھر بن چکا تھا۔ ہم اپنے گھر میں شفٹ تو ہو گئے مگر بے روزگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بچوں کی پرورش کے ساتھ پیٹ کا دوزخ تو بھرنا تھا اس کا حل نرگس کے مشورے پر میں نے یہ نکالا ایک چھوٹے پیمانے پر کاروبار کا آغاز کیا جس کالونی میں گھر بنایا تھا وہ نئی تھی اور وہاں کوئی جنرل اسٹور کریانہ کی کوئی دکان نہ تھی تو میں نے اللہ کا نام لے کر ایک دوکان کرایہ پر لی اور جو رقم مل کی طرف سے ملی تھی اس سے ایک جنرل اسٹور اور کریانہ شاپ بنالی۔ ایک سال کے اندر اندر کام چل نکلا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کالونی میں گھر بنتے گئے آبادی بڑھ گئی اور تھوڑے عرصے میں تمام پلاٹوں پر مکانات تعمیر ہو گئے۔ میں نے بھی کام کو وسعت دی اور چھوٹے جنرل اسٹور کو بہت بڑے سپر اسٹور میں تبدیل کر دیا۔ دونوں بیٹیاں شمائلہ اور نائلہ جوان ہو چکی تھیں۔ شمائلہ سب سے بڑی تھی اس نے ایف اے کر لیا تھا، نائلہ فرسٹ ایئر میں تھی جبکہ بیٹا نبیل میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔

ہمارے پڑوس میں ایک فیملی رہتی تھی جن کے ساتھ ہمارے بہت اچھے مراسم تھے اور آنا جانا تھا ان کی ایک بیٹی جوان تھی جو کہ تھوڑی مغرور اور نک چڑھی تھی۔ وہ شمائلہ کی سہیلی بنی ہوئی تھی۔ گو کہ دونوں کی طبیعتیں اور مزاج متضاد تھا۔ کبھی دونوں میں لڑائی ہو جاتی پھر صلح ہو جاتی تو اس طرح ان کی دوستی چل رہی تھی۔ نرگس خوب صورت عورت نہیں تھی۔ بہت معمولی شکل وصورت کے ساتھ ایک ٹانگ میں پیدائشی نقص کی وجہ سے لنگڑا کر چلتی تھی مگر اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ایک نیک سیرت عورت ہے۔ میں بھی پیدائشی طور پر دیہاتی اور غربت میں پلا بڑھا تھا۔ میری شکل وصورت واجبی سی تھی کوئی بھی مجھے خوب صورت مرد نہیں کہہ سکتا تھا مگر اس کے برعکس ہمارے تینوں بچے انتہائی خوب صورت گورے چٹے تھے۔ مزید نرگس کی اچھی تربیت کی وجہ سے تمیز، ادب اور اچھے اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے ساتھ شریعت پر کاربند تھے۔

ایک دن یوں ہوا کہ ہمارے پڑوسیوں کے کسی رشتہ دار کا انتقال ہو گیا اور وہ وہاں چلے گئے اور ہمیں بتایا کہ عصر کے بعد تدفین ہو گی تو شام تک آجائیں گے۔ یہ وہ دور تھا پی ٹی سی ایل ٹیلی فون کی سہولت چیدہ چیدہ لوگوں کو حاصل تھی۔ ہمارے پڑوسیوں کی بیٹی کے رشتہ کی کہیں دوسرے شہر میں بات چل رہی تھی تو دوپہر کے وقت وہ لوگ اپنی کار پر لڑکی دیکھنے آئے۔ مگر ہمارے پڑوسیوں کے گھر تالا لگا ہوا تھا تو آنے والے مہمانوں نے ہمارے گھر کی ڈور بیل بجائی تو نرگس نے دروازہ کھولا۔ وہ دو مرد اور تین خواتین تھیں۔ انھوں نے ہمارے ہمسائیوں کا پوچھا تو نرگس نے بتایا کہ وہ کسی فوتگی والے گھر میں گئے ہیں اور شام کو آئیں گے تو وہ کہنے لگے کہ بڑی دور سے آئے ہیں ان سے ملنا بہت ضروری ہے تو نرگس نے ہمسائیوں کے حقوق کا خیال کرتے ہوئے انھیں کہا کہ ان کے آنے تک آپ لوگ ہمارے گھر بیٹھ جائیں۔ وہ شام تک لازمی آجائیں گے۔ چنانچہ دونوں مرد ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور تینوں عورتیں بیڈ روم میں بیٹھ گئیں۔ میں بھی اپنا ڈپارٹمنٹل اسٹور بند کر کے آ گیا۔ نرگس نے فوراً شمائلہ، نائلہ کے ساتھ

مل کر کھانا تیار کیا مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کی۔ ان عزت احترام دیا جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔
شام کو ہمارے پڑوسی آگئے تو وہ لوگ ہمارا شکریہ ادا کر کے ان کے ہاں چلے گئے۔ ان دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کی طرف آنا جانا رہا۔ ان کا رشتہ طے ہوا یا نہیں ہمیں معلوم نہ ہو سکا پھر اچانک ہمارے پڑوسی مکان بیچ کر کہیں اور چلے گئے اور ان سے ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔
نرگس اب شمائلہ کی شادی کے لیے فکر مند رہنے لگی اور مجھ پر زور ڈالنے لگی کہ اپنے ارد گرد نظر رکھیں اور شمائلہ کا رشتہ تلاش کریں۔ میں اس کوشش میں لگا رہا مگر کوئی معقول رشتہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
دو یا تین ماہ گزرے اس روز جمعہ تھا۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور بند ہونے کی وجہ سے میں گھر میں تھا۔ تو اچانک ہی وہ لوگ آگئے جو چند ماہ پہلے ہمارے ہمسائیوں کے ہاں آئے تھے خیر ہم نے انھیں گھر میں بٹھایا تو انھوں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے جو کہ ایک سرکاری محکمے میں افسر تھا اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔ ہمارے سابقہ ہمسائیوں کی بیٹی کے ساتھ رشتہ طے نہ ہو سکا تھا جس کی وجہ یہ تھی ایک تو ان کی بیٹی مغرور اور نک چڑھی تھی دوسری ان کی کچھ ایسی شرائط تھیں جو ان کو قبول نہیں تھیں۔ انھوں نے بہت سے گھرانوں میں رشتے دیکھے تھے مگر انھیں کوئی لڑکی مناسب نہ لگی تو انھوں نے آپس میں صلاح مشورہ اور غور وخوض کیا۔ انھوں نے چند گھنٹے ہمارے گھر میں گزارے تھے تو انھیں ہمارے گھر کا ماحول، ہماری مہمان نوازی کے ساتھ شمائلہ بہت پسند آئی تھی اور ان کے بیٹے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھی تو وہ شمائلہ کے رشتے کے سوالی بن کر آئے تھے۔
انھوں نے ہمیں سوچنے کا ٹائم دیا اپنے گھر کا ایڈریس دیا اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور چلے گئے۔

☆☆☆

ایک ہفتے کی سوچ بچار کے بعد ہم نے ان کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور انھیں بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی کہ اگلے روز ہم آ رہے ہیں تو دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ان کے گھر پہنچ گئے۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور خوب آؤ بھگت کی۔ ہم نے لڑکا دیکھا جو کہ بہت سلجھا ہوا شریف اور خوب صورت تھا۔ ہمیں پسند آیا۔ اگلے دو ماہ ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا اور پوری تسلی کرنے کے بعد ہم نے شمائلہ کے رشتے کی ہاں کر دی۔ فوراً منگنی کی رسم ادا کر دی گئی اور چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ اللہ کے فضل و کرم سے شمائلہ کی شادی بخیر وخوبی سرانجام پا گئی۔ وہ رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی گئی۔ شمائلہ کا خاوند اور اس کے سسرال والے بہت اچھے ثابت ہوئے۔ شمائلہ نے اپنے اچھے عادات واطوار، خدمت گزاری، اچھے اخلاق سے سب کے دل جیت لیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا سال بعد انھوں نے اپنے دوسرے بیٹے کے لیے نائلہ کا رشتہ مانگ لیا وہ بھی تعلیم مکمل کر کے بہت اچھے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ چنانچہ نائلہ کی شادی بھی کر دی۔
دونوں بیٹیاں صاحب اولاد ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش وخرم زندگی گزار رہی ہیں۔ نبیل نے ایف اے کرنے کے بعد ڈپارٹمنٹل اسٹور سنبھال لیا ہے اور بڑی ذمہ داری سے کاروبار چلا رہا ہے۔ میں نے اور نرگس نے اللہ کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے حج کی سعادت حاصل کر لی ہے۔
نرگس آج کل نبیل کی دلہن اور اپنے لیے بہو تلاش کر رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنا گوہر مقصود حاصل کر لے گی۔ قارئین کرام! میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید یہ قدرت کی طرف سے مجھے بہت بڑا انعام ملا ہے۔ میں نے کسی کی بیٹی کے بارے میں اچھا سوچا، اچھا چاہا، نیک نیتی سے سیٹھ صاحب کی بچی کو برباد ہونے سے بچایا۔ اپنے مالکوں کی خیر خواہی بھلائی سوچی تو شاید یہ سب اسی کا صلہ ہے۔ کہتے ہیں کر بھلا سو ہو بھلا...... تو قارئین کرام آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں......؟

☆☆☆

بارہویں سچ بیانی

جرس

محمد بلال فیاض

صحرا کی اُس بے بسی کی داستان' جہاں ہمیشہ پیاس بندے کھا جاتی ہے



تھر کے پیاسے صحرا میں سورج کسی ظالم و جابر حکمران کی طرح قہر برسا رہا تھا۔ صحرا کی پیلی ریت، بھٹی کی طرح دہک رہی تھی۔ مسرت نے جھونپڑی کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو گرم لو کے تھپیڑوں نے اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔
یہ ایک چھوٹا سی جھونپڑی نما گھر تھا جس کی

دیواریں مٹی اور گارے کی تھیں۔ اور چھت بھوسے سے بنی ہوئی تھی، چھت کو سہارا دینے کے لیے کچھ چھوٹے بڑے بانس استعمال کیے گئے تھے، گھر کا دروازہ نہ کواڑ تھا۔ گھر کے بیرونی حصے میں ایک لاغری بکری بندھی ہوئی تھی جو ان کی کل کائنات تھی۔ مسرت اور اکرم کو یہ بکری اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی کیونکہ گھر کا گزر بسر اس بکری کے ہی مرہون منت تھا۔ خیر! پیٹ بھر کے تو انھوں نے سالوں سے ہی کچھ نہ کھایا تھا مگر یہ بکری سسکتی بلکتی زندگی کو دم توڑنے سے روکے ہوئے تھی۔

پچھلے سال ان کی تعداد دو تھی مگر وہ جگہ جہاں انسان بھوک اور پیاس کی تاب نہ لاتے ہوئے اس عفریت کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے تھے وہاں بے زبان بکری کا مرجانا معمول کی بات تھی۔

''مسرت...... او مسرت۔'' اندر داخل ہوتے ہی اکرم نے حسب عادت پکارا۔ مسرت سامنے ہی بیٹھی فاطمہ کو کھجور کے پتوں سے بنے پنکھے سے ہوا دے رہی تھی۔ یہ پنکھا اور اس جیسی کچھ اور چیزیں اس کے ہاتھوں کی محنت کا کمال تھا۔

''لے پکڑ۔ یہ رکھ لے۔ پانی پلا مجھ کو۔'' اس نے ایک میلا سا زنگ اڑا تھیلا مسرت کی طرف بڑھایا جس میں چند سیر گندم کے دانے تھے۔ جوان کے لیے سونا چاندی سے بڑھ کر تھے۔

اس نے تھیلا ایک طرف کسی متاع کی طرح سنبھال کر رکھا اور اپنی میلی چولی سے ہاتھ پونچھ کر پیالہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا جس میں پانی دو گھونٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اکرم نے بڑے صبر و شکر سے پانی پیا اور پیالہ ایک طرف رکھ کر اپنی مقامی زبان میں بولا۔

''فاطمہ کا بخار کچھ کم ہوا؟''

''نہیں...... ویسے ہی تپ رہی ہے۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ وہ اُٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ پانچ سالہ کمزور اور نحیف سی فاطمہ بخار سے پھنک رہی تھی۔ اس کی مٹیالی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ زیادہ صحت مند تو وہ کبھی نہیں رہی تھی مگر آج کل تو بالکل ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی زرد مٹیالی جلد ہڈیوں کے ساتھ چپک گئی تھی اور جسم پر گوشت ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتا تھا۔

یہاں فاطمہ ہی نہیں ہر دوسرے بچے کی حالت قریب قریب ایسی ہی تھی۔ گوٹھ کے بچوں کا رواں رواں پیاسا تھا۔ ننگے دھڑ والے بچوں کے لاغر اور کمزور جسموں پر بس ہر طرف سے ہڈیاں ہی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں جو چیخ چیخ کر غربت اور غذائی قلت کی داستان سناتی تھیں۔ برسوں کے پیاسے چہروں پر صرف اس وقت مسکراہٹ دوڑتی جب کبھی تھر پر ابر رحمت برستا تھا۔

☆☆☆

جون اپنے جوبن پر تھا۔ اور کڑاکے کی اس گرمی میں چرند پرند کا مرنا ایک طرف، گرمی سے دن بدن انسانی ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کمرے میں اے سی کولنگ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ انھیں کپکپی سی محسوس ہونے لگی۔ کندھوں پر طمطراق سے شال جما کر انھوں نے پاس کھڑے مؤدب ملازم کی طرف دیکھا جو ان کی آنکھوں کی جنبش کی زبان بھی جانتا تھا۔ ملازم نے کسی روبوٹ کی طرح حرکت کی اور اے سی کی اسپیڈ کم کر دی۔

'کمال' جو کہ ان کا میڈیا سیکریٹری تھا اجازت پا کر کمرے میں داخل ہوا۔ ہاتھ باندھ کر بڑی فرمانبرداری سے سلام جھاڑا۔ جس کا جواب انھوں نے سر کی ہلکی سی جنبش سے دیا۔

''ہاں بھئی کمال، کیا کہتا ہے میڈیا آج کل۔'' ٹانگ کر ٹانگ جما کر انھوں نے دریافت کیا، لہجے میں رعب و دبدبہ نمایاں تھا۔

''وہی تھر میں ہونے والی ہلاکتوں کا رونا رو رہا ہے میڈیا ابھی تک۔''

''تو بند کرواؤ میڈیا کا یہ رونا دھونا۔'' تحکم اور

حقارت سے انھوں نے کہا۔

''منسٹر صاحب یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔'' اس نے لہجے میں بے نیازی سمو کر کہا پھر توقف کے بعد بولا۔ ''مگر حضور، موقع اچھا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے مخالفین اپنی سیاست چمکائیں کیوں نہ ہم ان پر بازی لے جائیں۔'' کمال کی اس بات پر انھوں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

''منسٹر صاحب! میڈیا نے تو وہی چلانا ہے ٹی وی پر جو آپ بولیں گے۔ یا پھر وہ جو زہر ہمارے مخالفین اُگلیں گے اور تیسری صورت میں میڈیا وہی اپنا رونا دھونا جاری رکھے گا۔ چینلو والوں کو تو بس دو چیزوں کی فکر ہوتی ہے آمدن اور چینل کی ریٹنگ۔''

''ہوں۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' گھنی سیاہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔

''تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی سرکار۔ بس ایک تھر پارکر کا دورہ۔ اس کے بعد ہم جانیں اور میڈیا۔ آپ کو بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مخالفین کو تو سانپ سونگھ جائے گا اور میڈیا کا منہ بھی بند ہو جائے گا اور عوام کا کیا ہے' وہ تو ویسے بھی کسی کھاتے میں نہیں...... وہ وہی دیکھتے اور سنتے ہیں جو میڈیا دکھاتا اور بتاتا ہے۔'' چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلا کر اس نے کہا اور پھر اُن کو مزید بریف کرنے لگا۔

☆☆☆

سرخ مرچوں کو کوٹ کر اس نے اس نے ان میں نمک ملایا اور ایک طرف رکھ دیا۔ دو روٹیاں جو گھر کے چھ افراد کے لیے تھیں کپڑے میں لپیٹ کر چنگیر میں رکھیں۔

''امی ...... بھوک لگی ہے۔'' فاطمہ سے دو سال بڑی موتل نے مقامی زبان میں کہا۔ بھوک سے آنتوں میں پڑنے والے بلوں کی تکلیف اس کے چہرے پر واضح دیکھی جا سکتی تھی۔

''بس بیٹی۔ تمہارے بابا سائیں آ جائیں تو کھاتے ہیں کھانا۔''

''فاطمہ کا بخار کم ہوا؟'' تھکا ہارا اکرم گھر آیا تو بیوی سے پہلا سوال یہی پوچھا مگر اس کے چہرے پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

''منسٹر آ رہا ہے ہمارے گوٹھ میں، دورے پر۔'' کھانے کے دوران اکرم نے بتایا تو تھر کے باقی لوگوں کی طرح مسرت کو بھی مدھوم سی امید ہوئی کہ شاید یہ حکمران ان درد کے ماروں کو کچھ داد رسی کریں۔

''مجھے یہ نہیں کھانا بابا سائیں۔ یہ کھا کر میرے گلے میں تکلیف ہوتی ہے۔'' موتل نے نمک ملی کچی سرخ مرچوں کی طرف دیکھ کر منہ بسورا۔

اکرم نے اُس کا منہ کھول کر دیکھا اندر سے اس کا سارا گلا سفید چھالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا بلاشبہ اس نے خود بھی کچھ ایسی ہی زندگی گزاری تھی۔ مگر اپنی تکلیف اولاد کی تکلیف کے آگے ہیچ لگتی تھی۔

''او...... مسرت، ہماری بٹیا رانی کو بکری کے دودھ کے ساتھ روٹی دو آج۔'' اس نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ خوش ہو گئی مگر حسرت کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ آدھا کٹورا دودھ اس نے بخار میں جلتی فاطمہ کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ چند ثانیوں تک وہ سوچتی رہی پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دو گھونٹ دودھ میں اس نے ایک گلاس پانی ڈالا اور موتل کے آگے پیالہ رکھ دیا۔ وہ پھولی نہ سمائی۔ اس کے لیے یہ بڑی نعمت تھی۔ خشک لبوں پر زبان پھیر کر اس نے دودھ کم پانی والے پیالے کی طرف دیکھا۔ اس کے باقی بہن بھائی پیالے کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے جس میں موجود دودھ ملے پانی کے نیچے پیالے کا پیندا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

موتل ان سب میں راج کماری بنی پیالے میں روٹی ڈبو ڈبو کر بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔

☆☆☆

''ہم جانتے ہیں۔ آپ لوگوں کے بہت مسائل ہیں۔''

منسٹر صاحب کی لاؤڈ اسپیکر سے آتی آواز سن کر اس نے سوچا شاید منسٹر صاحب بے خبر ہیں کہ اس گوٹھ کے لوگوں کے بہت مسائل نہیں ہیں بلکہ 'صرف مسائل' ہیں۔

لوگ پر امید نظروں سے پیاسے چہرے لیے سن رہے تھے کہ شاید منسٹر صاحب کوئی مژدہ سنائیں۔

''ہم جانتے ہیں، تھر کا سب سے بڑا مسئلہ پانی اور خوراک ہے۔ یہاں صحت کی سہولیات کا بھی فقدان ہے۔'' شاید وہ یہاں ان کو انہی کے مسائل گنوانے آئے تھے۔ مسرت کو کوفت ہونے لگی۔ وہی رٹے رٹائے جملے، وہی باتیں، وہی یقین دہانیاں دہرائی جا رہی تھیں جنھیں وہ لوگ سن سن کر تھک گئے تھے۔

اتنے گوٹھ کے لوگ وہاں جمع نہیں تھے جتنے لوگ منسٹر صاحب کے ساتھ میڈیا کے آئے تھے۔ وہ پورے پروٹوکول کے ساتھ وہاں آئے تھے مگر گرمی کی شدت ان کی برداشت سے باہر تھی بولنے کے دوران وہ بار بار رک جاتے اور مہنگے، ٹھنڈے منرل واٹر کی بوتل لبوں سے لگا لیتے۔

گوٹھ کے بچے جن کو چوبیس گھنٹوں میں چند گھونٹ ہی گدلا پانی نصیب ہوتا تھا وہ منسٹر صاحب کو کسی اور ہی سیارے کی ''مخلوق'' سمجھ رہے تھے۔ جو ہر دو منٹ بعد پانی پیتی تھی وہ بھی اتنا صاف شفاف۔

مسرت کو یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ محض کاغذ پر لکھے لفظ زبان سے ادا کر رہے ہیں حقیقتاً وہ بھوک، پیاس اور غربت جیسے مسائل سے نا آشنا تھے۔ اپنی بوسیدہ میلی اوڑھنی دانتوں میں دبا کر اپنی دانست میں اس نے سوچا۔ 'شہری لوگوں کے مسائل بھی تو اور ہوتے ہیں۔ بڑا فرق ہوتا ہے جی یہاں اور وہاں کے مسائل میں۔'

ان لوگوں کو اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ گھر میں فریج نہیں ہے یا پھر فریج چھوٹا پڑ گیا ہے اور فیملی بڑھ گئی ہے۔ خوراک کو اچھے سے محفوظ کرنے کے لیے بڑا ڈیپ فریزر لینا چاہیے۔ اور یہاں گوٹھ میں سرے سے خوراک ہی نہ تھی تو محفوظ کرنے کی کیا فکر؟

بڑے شہروں میں لوگوں کو یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ کس موسم میں کون سا اور کس رنگ کا مشروب پینا چاہیے۔ اور یہاں سرے سے پانی ہی نہ تھا۔

وہاں لوگ لوڈ شیڈنگ کو کوستے رہتے ہیں...... اور یہاں سرے سے بجلی ہی نہ تھی۔

اس نے سن رکھا تھا کہ شہری عورتیں ہمہ وقت سلائی اور کپڑوں کی بڑھتی قیمتوں پر بولتی رہتی ہیں۔ اور یہاں تو بوری اور تھیلے سے بھی تن ڈھانپ لیا جاتا تھا۔''

اکرم اکثر بتاتا کہ اب شہر کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں رہے، ملازمت مشکل سے ملتی ہے۔ مگر یہاں گوٹھ میں تو ملازمت سرے سے ہی نہ تھی۔''

''شہری لوگ واویلا مچائے رکھتے تھے کہ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ گزر بسر مشکل سے ہوتا ہے۔ مگر یہاں گوٹھ میں 'گزر بسر' نام کی کوئی چیز نہ تھی زندگی صرف سسکتی اور بلکتی تھی۔

فرق تو ہے اور بہت فرق ہے بڑے شہر اور گوٹھ کی زندگی میں اب بھلا منسٹر صاحب کا کیا قصور کہ وہ ان کے مسائل سے نا آشنا تھے۔ انھوں نے کبھی زندگی کا ایک دن بھی تو اس گوٹھ میں نہیں گزرا تھا۔ اور شاید وہ گزار بھی نہ سکیں۔'' مسرت نے سوچا اپنا میلا گھاگرا سمیٹ کر اٹھی اور گھر چلی آئی۔

اگلے روز تمام چینلوں پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ نیوز اینکرز حلق پھاڑ رہے تھے۔

''منسٹر صاحب کا دورہ تھرپارکر''

''ہم اپنے لوگوں سے بے خبر نہیں ہیں۔''

''مسائل حل کریں گے۔''

''تھر کے باسیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔''

''کمال ہے۔ تُو نے تو کمال کر دیا۔ ارے

بھی جیسا نام ویسا کام۔'' انھوں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر خوشی سے کہا وہ جب بہت موڈ میں ہوتے تو اسے کمال کی بجائے کمالے کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

''میں نے تو کوئی کمال نہیں کیا سرکار۔ اس کمال کا سہرا تو آپ کو جاتا ہے۔'' کمال نے عاجزی وانکساری کا مصنوعی لبادہ اوڑھ کر کہا۔ منسٹر صاحب کے تفاخر میں اور اضافہ ہو گیا۔

''کمالے! اس دفعہ تو تُو تنخواہ کے علاوہ ایک بڑے انعام کا حق دار ہے۔'' معنی خیز انداز میں انھوں نے کہا تو کمال کی باچھیں کانوں تک پھیل گئی۔

☆☆☆

''اتنا کم پانی؟'' مسرت نے گھڑے میں جھانک کر پریشانی سے کہا۔ یہ بھی بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ ذرا دیر ہو جاتی تو یہ پانی بھی اونٹوں کے پیٹ میں اتر جاتا۔''

''بچے کل سے پیاسے ہیں۔ خوراک کی کمی ایک طرف پانی نہ ہونے کی وجہ سے بکری کا دودھ بھی چند گھونٹ تک محدود ہو گیا ہے۔ اگر بارش نہ ہوئی تو مجھے ڈر ہے کہ دودھ سے تو جائیں گے ہی بکری سے بھی نہ ہاتھ دھو بیٹھیں ہم۔ پچھلے سال کی طرح۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''بارش کی دعا کرو اللہ کرم کرے۔'' اکرم نے تسلی دی۔

''اگر ہماری دعائیں قبول ہوتیں تو کیا ہم اس حال میں ہوتے؟''

''کفر نہ بکا کر تجھے پہلے بھی سمجھایا ہے۔'' غصے سے اس نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ ''فاطمہ کا بخار کم ہوا؟''

''نہیں۔'' فاطمہ کے لیے گدلے سے پانی میں روٹی کے ٹکڑے بھگوتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔

''اللہ سائیں خیر کرے گا۔'' کہہ کر اس نے کچی دیوار سے ٹیک لگالی۔

پاندان

پان ترقی کی منازل طے کر کے بی بی کے ہاتھوں سے پنواڑی کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بیبیاں اپنے شوہروں کو گھر سے نکلنے سے پہلے ایک عدد گلوری دینا نہ بھولتی تھیں۔ اس گلوری میں چونا' کتھا' چھالیہ' سپاری تو کیا ان کی سلیقہ شعاری سب کچھ موجود ہوتی تھی۔ اللہ اللہ اب یہ زمانہ ہے کہ بیوی شوہر کو صرف ایک مسکراہٹ سے نوازتی ہے جو محبت سے عاری اور وفا شعاری سے مبرا ہوتی ہے۔

حسن انتخاب: نبیل جاوید۔ سرگودھا

'دعا کے ساتھ دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے سائیں جی۔ اگر صرف دعا سے ہی شفا ملتی ہوتی تو دنیا میں طب کا شعبہ نہ ہوتا' اس نے فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا جس کا زردی مائل سیاہ چہرہ بخار کی شدت سے تمتما رہا تھا۔

☆☆☆

خوش قسمتی سے کل اکرم کو آدھا گھڑا پانی مل گیا تھا۔ مگر آج سارا دن کی تلاش کے بعد بھی وہ ایک بوند پانی حاصل کرنے میں بھی ناکام رہا تھا۔

''پانی نہیں ملا؟'' مسرت نے برتن خالی دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کوشش کرتے تو......'' مسرت کی بات کاٹ کر وہ تلخی سے بولا۔

''تمہارے خیال میں کیا میں نے کوشش نہیں کی ہوگی؟ بس ایک کسر رہ گئی تھی کہ لاغر اونٹوں کے پیٹ چیر کر پانی نکال لاتا۔''

مسرت اس کے لہجے کی تلخی کا زہر پی کر خاموش ہو گئی۔

''کل کا کچھ پانی بچا ہے؟''

صرف ایک پیالہ۔'' مسرت کے لہجے اور چہرے دونوں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ نام تو اس کا مسرت تھا مگر اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے

اپنی چوبیس سالہ زندگی میں کوئی مسرت دیکھی ہو۔

ایک پیالہ پانی۔ چھ افراد اور ایک بکری۔

اکرم نے سوچا کہ چلو ہم ہم میاں بیوی اور تین بچے تو پیاس برداشت کر ہی لیں گے مگر مسئلہ فاطمہ اور بکری کا تھا۔ فاطمہ سخت بخار میں مبتلا تھی اور لاغر، ڈھانچہ بنی بکری کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی خستہ حال عمارت کی طرح کسی بھی وقت ڈھے سکتی تھی۔

شام سے رات ہوگئی تھی۔ مسرت بچوں کو بہلا پھسلا کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ فاطمہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ فاطمہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو تیزی سے واپس کھینچ لیا اس کا وجود تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ اکرم زمین پر بچھی کھجور کی چٹائی پر چت لیٹا گہری سوچ میں گم تھا۔

بکری کے حلق سے نکلنے والی عجیب و غریب آوازوں نے اس کے ارتکاز کو توڑا۔ اس نے اٹھ کر بکری کی طرف بغور دیکھا اور دوبارہ گہری سوچ میں گم ہوگیا۔

''اکرم...... اگر بب...... بکری کو کچھ ہوگیا...... تت...... تو ہم'' مسرت نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ لفظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ اکرم کوئی جواب دیتا اونگھتی بکری کے حلق سے دوبارہ وہی عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ اکرم نے پیاس سے نڈھال بکری کو دیکھا جس کے تھن صحرا کی طرح بنجر تھے۔

''پانی دو۔'' وہ اُٹھ کر مسرت کے پاس آیا۔

''وہ پڑا ہے پیالہ۔'' مسرت نے بتایا پھر اکرم کو پیالہ اٹھاتا دیکھ کر تڑپ کر بولی۔

''وہ میری فاطمہ کے لیے ہے۔''

''فاطمہ کی حالت بہت خراب ہے۔ بخار اس کی جان لینے کے درپہ ہے۔ یہ پانی فاطمہ کے لیے......'' اس کے لہجے میں دلدوز چیخوں کی گونج سنائی دیتی تھی۔

اکرم نے گہری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ کر سہم گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد اس نے سوچا کہ اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بے تاثر ہوگیا۔ اکرم نے پیالہ اٹھایا، ایک لمحے کے لیے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر وہ دونوں ایک فیصلے پر پہنچ کر ایک دوسرے سے نظریں چرا گئے۔ اُدھر بکری پانی پی کر شانت ہوئی تو اِدھر پیاسی تپتی فاطمہ نے دم توڑ دیا۔

''غم نہ کر مسرت۔'' ہم کون سا بے اولاد ہیں۔ اللہ کے کرم سے ہماری دو بیٹیاں اور ہیں اور ایک بیٹا بھی تو ہے اور ان سب کے زندہ رہنے کے لیے بکری کا زندہ رہنا زیادہ ضروری تھا۔''

اس وقت اس کا لہجہ بالکل بے تاثر تھا۔ مسرت آنسوؤں بھری آنکھوں سے ٹکر ٹکر اسے دیکھتی گئی۔

☆☆☆

تھر کے صحرا میں بے نور صبح معمول کے مطابق اُتری تھی، فاطمہ کو رات ہی دفنا دیا گیا تھا۔

اکرم اور مسرت نے دیکھا، بکری کے تھن بھرے بھرے سے لگ رہے تھے اب کے بے تاثر چہرے پر اطمینان کے سائے لہرانے لگے۔

مسرت اندر سے دودھ کا برتن اٹھا لائی اور بکری کے تھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی سوکھی زرد مٹیالی کلائی میں موجود سفید چوڑیاں جو کہنیوں تک بازو میں بھری ہوئی تھیں چھن چھن کرنے لگیں۔

اس نے ہاتھ روک کر گم صم کھڑے اکرم کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا کر باہر نکل گیا۔ مسرت نظریں جھکائے دودھ دوہنے لگی۔ اس کی چوڑیوں کی آواز نے بہت دور تک اکرم کی سماعتوں کا تعاقب کیا تھا۔ اور اُسے لگا تھا کہ جیسے اُس کی فاطمہ آوازِ جرس کی طرح اُس کی چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ بڑی دیر سے مسکرا رہی ہے۔ مسرت کے آنسو پیالے میں مل کر دودھ کی کچھ بوندیں بڑھا گئے تھے۔

☆☆☆

ایک تصویر، ایک کہانی

ظالمو! کچھ تو فرق رہنے دو



٭ ارے ارے ..... ساتھیو!

گھبرائیں نہیں! یہ واقعی ٹرک ہے۔ جانور کے اوپر بوجھ لاد دیا جائے تو اس غریب کی بھی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ مشین کتنی ہی مضبوط ہو مگر صاحب! وہ بھی کلیجہ منہ کو لے آتی ہے۔ کسی پر اس کی برداشت سے زیادہ ظلم نہ کرو۔ ورنہ زیرِ نظر تصویر کی طرح حال ہو جاتا ہے۔

دیکھو دیکھو! دیکھو تو ذرا! اس غریب ٹرک کا بھی کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔

ظالمو! کچھ تو فرق رہنے دو۔

گوشت اور پوست اور لوہے میں

اب سنبھالو اسے! ارے سنبھالو سنبھالو۔ کہیں اس ٹرک کے پنجر ہی نہ نکل آئیں اور یہ ٹرک رسیاں تڑا کر ہاتھ سے ہی نہ نکل جائے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



زرد لومڑی

قسط:05

انتقام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔

برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکتہ الآرا سلسلہ

میں اپنے کام خود کرنے کی عادی ہوں اور اس سے مجھے ہمیشہ فائدہ ہی ہوا ہے۔ شائریکا کے شہر ایک سٹی آ کر میں نے کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔ مسٹر پیلنس کے جو ایک نفیس انسان تھے اور میرے بارے میں جان



کر بہت خوش ہوئے تھے۔
''ہمارے خاص محکمے میں آپ کے نام کا ریڈ اسٹار فائل ہے۔ مسٹر پیلنس نے مجھے بتایا۔
''ریڈ اسٹار سے کیا مراد ہے؟''
''انتہائی خاص بہت اہم شخصیت۔''
''اوہ...... شکریہ!''
''تم اس قابل ہو بے بی، تمہاری عمر دیکھ کر مجھے اور حیرت ہوئی ہے۔ میں تمہیں کوئی عمر رسیدہ عورت سمجھا تھا۔ خرانٹ اور بے حد تجربہ کار۔
میں ہنس کر خاموش ہو گئی۔ پھر انہوں نے مجھے لیونسکی کی سیکریٹری ایلسی سے ملایا۔ ''یہ انٹرنیشنل لیجل نامی اخبار کی نمائندہ ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی تھیں۔
''اوہ میں صحافیوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میری بڑی بہن نامور صحافی تھیں۔ وہ ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئیں۔
ایلسی نے بڑے اخلاق سے میرے تمام سوالات کے جواب دیے۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز اس کی ایک ایک ادا نوٹ کر رہی تھی۔ ویسے وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ بے حد سلجھی ہوئی، سنجیدہ اور پروقار، مجھے وہ کافی اچھی لگی تھی۔ مجھے اس کا کردار ادا کرنا تھا اور اس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔
غرض یہ کہ میں اس کا سارا خاکہ ذہن میں محفوظ کر کے وہاں سے اٹھی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی میں نے اس سے مسٹر ہیمر کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ اس کے انداز میں ہیمر لیونسکی کے لیے بڑا احترام پایا جاتا تھا۔ اس ہم میں مجھے جو دو شخصیتیں ملی تھیں انہوں نے میرے ذہن پر بہت اچھا تاثر چھوڑا تھا۔
''مجھے بتایئے مس اینی پارک، میں اور کیا خدمت کروں۔''
''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ مجھے ہیمر لیونسکی کی تازہ تصاویر درکار ہیں جس شکل میں وہ یہاں سے لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے نام کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی۔
''ہاں بالکل ساتھ اس میں آپ کے تمام کاغذات بھی آپ کو فراہم کر دوں گا۔'' پیلنس نے کہا۔
''او کے تھینکس۔'' میں نے جواب دیا۔ پیلنس نے میری مطلوبہ اشیاء مجھے فراہم کر دیں اور اس کا شکریہ ادا کر کے میں نے اس سے کہا کہ اب میں اسے دوبارہ فون اس وقت کروں گی جب مجھے اس کی ضرورت ہوگی۔
میرا کام تسلی بخش تھا۔ اپنی قیام گاہ میں آرام کرتے ہوئے میں نے اپنے اس نئے مشن کے بارے میں سوچا اور کچھ لمحوں کے لیے مجھے خود پر غصہ آ گیا۔ میں ایک پراعتماد شخصیت کی مالک تھی لیکن رہ رہ کر نہ جانے کیوں وہ منحوس وجود یاد آ جاتا تھا جس کا نام الہ دین تھا۔ شدید غصہ یوں بھی آتا تھا کہ کمینے نے نہ تو مجھے اپنا اصل نام بتایا تھا نہ اصل صورت دکھائی تھی۔
اس وقت بھی وہ ذہن کے دریچوں میں گھس آیا اور میں نے اسے مار مار کر بھگایا پھر سو گئی لیکن بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ اتنی بے عزتی کے باوجود میرے خوابوں میں آیا اور مجھ پر گھس کر سو گیا۔ دوسری صبح طبیعت بوجھل تھی لیکن ایک عمدہ غسل کے بعد کیفیت بحال ہو گئی۔ مجھے اپنا آخری کام سرانجام دے کر واپس جانا تھا۔ چنانچہ تیار ہو کر میں روانہ ہو گئی۔ مطلوبہ پتے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل تھی چنانچہ میں وہاں پہنچ گئی۔
ڈاکٹر ہیمر لیونسکی کا مکان زیادہ بڑا نہیں لیکن بہت خوب صورت تھا۔ لان خوب سرسبز تھا اس کے درمیان سے ایک پختہ روش پورٹیکو تک جاتی تھی۔

ٹیکسی سے اترتے ہی میری چھٹی حس بتانے لگی کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں آگے بڑھ کر داخلی دروازے سے پاس پہنچی اور گھنٹی بجادی۔ دروازہ کھلتے ہی بالکل دیر نہیں لگی جیسے وہ دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ میرے چہرے کو دیکھ کر اس کے انداز میں خشکی پھیل گئی۔

"جی فرمایئے۔" اس نے کھردرے لہجے مین کہا۔

"میرا نام ایلیسی گومنر ہے اور میں سر ڈاکٹر ہیمر لیونسکی کی سیکریٹری ہوں۔"

"جی آگے فرمایئے۔" اس نے بدتہذیبی سے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ بتانیں کرنی ہیں۔"

"کیسی باتیں۔" اس نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ پوچھا۔

"دراصل سر لیونسکی بے حد مہربان انسان تھے۔ انہوں نے شاید ہی زندگی میں کسی کا دل دکھایا ہو۔ میرے ساتھ ان کا سلوک بے حد مہربانی کا تھا۔ مجھے حیرت ہے وہ اس طرح کیسے چلے گئے۔

"میں اتنے لوگوں کو ان فضول سوالات کے جواب دے چکی ہوں کہ اب ان سے بری طرح اکتا گئی ہوں۔ آپ براہ کرم......"

یوں لگا جیسے وہ دروازہ بند کر کے چلی جائے گی۔ میں نے پھرتی سے اپنا پاؤں دروازے میں اڑادیا اور بولی۔ "میں ذاتی طور پر ان کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہوں کیونکہ میں ان کا بے حد احترام کرتی ہوں۔ آپ پلیز مجھے اندر آنے دیں۔

اسے کسی قدر شرمندگی کا احساس ہوا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔" میں جلدی سے اندر داخل ہوگئی۔ اس نے پلٹ کر دروازہ بند کردیا۔ اس دوران میں نے عقب سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ کسی قدر پستہ قامت تھی۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی جسم سڈول اور دلکش تھا۔ آنکھیں بے پناہ خوب صورت تھیں۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹی اور پھر مجھے ڈائننگ روم میں لے گئی جو جدید فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

"اس بارے میں میرے اتنے کان کھائے گئے ہیں کہ میں بری طرح بیزار ہوگئی ہوں۔ میرے پاس بتانے کے لیے اب کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"یقیناً ایسا ہوگا لیکن پتا نہیں کیوں میرے دل میں ایک خلش ہے۔"

"خلش ...... مگر کیسی؟" وہ بولی۔

"بس مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی سے سخت ناراض ہوگئے ہوں۔ اتنے ناراض کہ انہوں نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس ناراضگی کے بارے مین وہ کسی اور کو بتاتے یا نہ بتاتے لیکن اپنی چہیتی بیوی رور بتاتے کیونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔

"ارے واہ، یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔ میری اس چالاکی نے اس کے موڈ میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کردی تھی۔

"میں ان کی سیکریٹری تھی میڈم۔"

"تو پھر؟"

"معاف کیجیے گا۔ اتنی حسین بیوی سے جدا ہونے کا تصور بھی موت جیسا ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی کچھ تلخیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ گزشتہ دنوں میں کسی بنیاد پر آپ کے درمیان کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔"

''مطلب یہ کہ جس طرح کبھی کبھی میاں بیوی کے درمیان......''
''کیا تمہارے خیال میں تمہارا یہ سوال اپنی اوقات سے بڑھ کر نہیں ہے؟''
''میں ان کی سیکریٹری ہوں۔ حکومت نے آپ سے بھی ان کے بارے میں سوالات کیے ہوں گے۔ مجھ سے بھی کیے جارہے ہیں۔ صرف اس بنیاد پر مین یہ سوالات کررہی ہوں۔''
''نہیں، میرا ایسا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔''
''اگر ڈاکٹر ہیمر نے واپس نہ آنے کا فیصلہ کیا تو کیا آپ اور بچہ ان کے پاس چلے جائیں گے۔''
میرا یہ سوال شاید مسز ہیمر کے لیے زیادہ سنگین تھا اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ مجھے اس سے سرد لہجے میں کہا۔
''نہیں میں اپنے وطن کی وفادار ہوں اور اس بارے میں قطعی ہیمر کا ساتھ نہیں دوں گی۔''
''پھر آپ کیا کریں گی؟''
''سیدھی سی بات ہے۔''
''کیا؟''
''میں ان سے طلاق لے لوں گی۔''
''اس طرح آپ کی زندگی آسانی سے گزر جائے گی؟''
''مشکلات پڑتی ہیں تو ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔''
''اوکے، بے حد شکریہ۔ اگر میرے کسی سوال سے آپ کی دل شکنی ہوئی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ مین اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دس گیارہ سال کا لڑکا اندر گھس آیا۔
''مم......اس نے اتنا کہا اور مجھے دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔ ''یہ کون ہیں؟''
''یہ......وہ......مس ایلسی ہیں۔'' میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرا سی گئی ہے۔
''مس ایلسی۔'' لڑکا بولا۔
''تمہارے ڈیڈی کی سیکریٹری اور ان کے بارے مین کچھ معلومات کرنے آئی ہیں۔ مجھے یہ تمہارے ڈیڈی کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔'' ......؟......دوبارہ کہنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کرئے اس کے کہ وہ لڑکے کو کچھ سمجھانا چاہتی ہے۔ نہ جانے کیا۔
''سمجھ گیا۔'' لڑکے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی رینگ آئی تھیں۔
''ہیلو مائی سن، تم تو بہت پیارے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا۔''
''روجر لیونسکی۔'' اس نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔
''سوری سروجر، میں بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئی تھی تم اور تمہاری ممی میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے، کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہارے ڈیڈی اچانک کیوں چلے گئے؟''
''میرے ڈیڈی کسی کام سے گئے ہیں۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے کہا جیسے وہ کوئی سبق دہرا رہا ہو۔
''وہ تم سے بہت پیار کرتے تھے۔''
''ہاں۔''
''اوکے سروجر، تم جاؤ۔ پریسلا لیونسکی نے کہا۔ لیکن میں نے اس کا راستہ روک لیا۔
''ایک بات بتاؤ بیٹے، اپنے ڈیڈی کے لیے تم کوئی پیغام تو نہیں دینا چاہتے۔ میں ان کے پاس ہانگ کانگ جارہی ہوں۔''

میرا اندازہ خاطر خواہ نکلا۔ دونوں کچھ لمحوں کے لیے ہونق ہو گئے تھے۔ لڑکے کے بجائے اس کی ماں نے کہا۔ ''نہیں کوئی پیغام نہیں ہے۔ او کے خدا حافظ۔ چلو روجر تم چینج کر لو۔'' پریسلا نے کہا۔ بعد میں واپسی کے لیے مڑ گئی۔ ٹیکسی میں واپسی کا سفر کرتے ہوئے میں اس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی جو ان دونوں ماں بیٹوں کے رویے سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

☆......☆

ہانگ کانگ میرا دیکھا بھالا شہر تھا۔ ایئر پورٹ سے نکل کر میں نے سیدھا بندرگاہ کا رخ کیا۔ سڑکوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لوگوں کا انداز بھی وہی تھا۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے سڑکیں گیلی تھیں شاید بارش کچھ دیر پہلے ہی ہوئی تھی۔ جہازوں پر کام کرنے والے گروہوں میں گھوم رہے تھے ان میں زیادہ غیر ملکی تھی۔ یورپین ہی نہیں بلکہ مشرق کے دوسرے ملکوں کے لوگ۔ ان کی آنکھوں مین جنس کی بھوک صاف نظر آتی تھی اور وہ کسی بھی لڑکی کو ایسے گھورتے تھے جیسے آنکھوں میں کھا جائیں گے۔ یہ لوگ بڑی بڑی امیدیں لے کر آتے تھے اور ان کی طلب صرف عورت اور شراب ہوتی تھی۔

بندرگاہ کے علاقے میں ہوٹلوں کی مارکیٹ تھی اور یہاں آرام سے ہوٹل مل جاتے تھے۔ بندرگاہ پر کئی جہاز لنگر انداز تھے جن کے عملے کے لوگ گھوم پھر رہے تھے اور خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

اس نے ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے رکوائی اور کرایہ ادا کر کے اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئی۔ کاؤنٹر کلرک سے ساحل کے رخ والا کمرہ طلب کیا جو مجھے حاصل ہو گیا۔ میں ہوٹل مین داخل ہوئی تو مجھے ایک شخص نظر آیا۔ صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا گلے میں ایک جدید قسم کا کیمرہ پڑا ہوا تھا۔ اس کیمرے کو میں نے غور سے دیکھا تھا کیونکہ اس کی مسافت کچھ مختلف سی تھی اور اس وقت بھی اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کیمرے نے مجھے چونکایا تھا اور میں نے اس کی شکل دیکھی تھی۔ میرے قدم ایک لمحے کے لیے رکے تو وہ لفٹ کی طرف بڑھ گیا لیکن یہ غلط تھا۔ وہ جس انداز میں نظر آیا تھا اس سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ نیچے جا رہا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے اپنا سامان ایک طرف رکھا اور اپنی یادداشت کے خانوں میں اسے تلاش کرنے لگی۔ دوبارہ میرے دماغ میں بجلی چمکی تھی۔ اس کی شکل تو مجھے یاد نہیں تھی لیکن لباس، قد و قامت اور خاص طور سے وہ کیمرے، میں نے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔

اوہ میرے خدا، اس وقت جب مین ڈاکٹر ہیمر کی سیکریٹری ایلس سے ملنے گئی تھی۔ میں نے اسے ایلس کی رہائش گاہ کے پاس دیکھا تھا اور دوسری بار شاید ایئر پورٹ پر اس وقت جب میں بورڈنگ کارڈ لے رہی تھی۔ میرے دماغ کی گھڑی ٹک ٹک کرنے لگی۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے اور میرے آس پاس موجود ہے۔

میں نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ وغیرہ دھویا۔ ایک اچھا لباس پہنا اپنے سامان کو احتیاط سے رکھا اور اسے اس طرح نشان زد کر دیا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی میرے کمرے کی تلاشی لینے کی کوشش کرے تو مجھے معلوم ہو جائے لیکن وہ کون ہے؟ کیا یہ صرف اتفاق ہے اور میری متجسس طبیعت نے مجھے بلاوجہ الجھا دیا ہے۔ میں نیچے آ گئی۔ ڈائننگ ہال میں بھی خوب رونق تھی۔ اپنی میز پر بیٹھ کر میں نے مینیو کو دیکھا اور ویٹر کو آرڈر نوٹ کرا دیا۔ کھانے کے دوران میری نظریں بھٹکتی رہی تھیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس شخص کی صورت ابھی تک میں نے ٹھیک سے نہیں دیکھی تھی اس کا کیمرہ اور لباس میں اس کی شناخت تھی۔

وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد میں باہر نکل آئی۔ مسٹر ساترلے نے مجھے ہیمر لیونسکی کے بارے میں اچھی طرح بریف کر دیا تھا اور مجھے علم تھا کہ میں اس سے کسی طرح ملاقات کر سکتی ہوں۔ لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ مزید یہ کہ میں جلد بازی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بندرگاہ کا یہ علاقہ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے کافی پسند تھا۔ اس میں ایک نیا پن تھا۔ ویسے تو پورے ہانگ کانگ کا ایک ہی انداز تھا لیکن بندرگاہ کا یہ علاقہ مخصوص ثقافت کا حامل تھا۔ میں نے ایک سائیکل رکشہ میں اور اس میں بیٹھ کر چل پڑی۔ سڑکیں چونکہ بارش کی وجہ سے گیلی تھیں اس لیے رکشہ سست رفتاری سے چل رہا تھا جو اور مزہ دے رہا تھا۔

میں کافی دن پہلے یہاں آئی تھی تو بندرگاہ کے علاقے کے ایک بہت پیارے لیکن چھوٹے سے ریستوران میں نے پودینے کی کافی پی تھی اور اس پر عاشق ہوگئی تھی۔ میں نے رکشہ وہیں رکوالیا اور اشارے سے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اگر چاہے تو میرا انتظار کرے۔ پھر جب میں نے اسے چھ ہانگ ڈالر دیئے تو اسے میری پوری زبان سمجھ میں آگئی اور اس نے زور سے گردن ہلادی۔

ریستوران اتنا ہی حسین تھا بلکہ اس میں کچھ اور خوب صورت اضافے کر لیے گئے تھے۔ شیشے کا دروازہ کھلنے پر خوب صورت پتھر سے بنے ہوئے زینے تھے، جن کے اختتام پر انتہائی وسیع ہال تھا۔ سامنے شراب کا کاؤنٹر اور دائیں بائیں میز کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں گول اسٹیج بنا ہوا تھا۔ جس پر ایک نیم عریاں لڑکی گانا گا رہی تھی۔ چھت میں رنگین روشنیاں رقص کر رہی تھیں جن کی وجہ سے ماحول کافی خوب صورت لگ رہا تھا۔

ہال کافی حد تک بھرا ہوا تھا۔ لاتعداد لڑکیاں اور مرد جو تہذیب کے دور سے کہیں دور کے لوگ لگتے تھے آس پاس کے ماحول سے بے نیاز اپنے آپ میں گم۔ پرائیویٹ کیبنوں کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے اور اندر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں نے ایک جگہ سنبھال لی اور اس بگڑے ہوئے ماحول کا جائزہ لیتی رہی۔

دفعتاً میرے بائیں جانب کے کیبن کا پردہ ہٹا اور ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا یہ وہی کیمرے والا تھا۔ اس وقت بھی کیمرہ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا لیکن اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے سنبھلنا پڑا جب میں نے اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں سنبھل گئی اور خود کو ہر کیفیت کے لئے تیار کرلیا۔

''مداخلت کی معافی چاہتی ہوں، کیا میں آپ سے چند باتیں کرسکتا ہوں۔''

''بیٹھیے۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ انہی علاقوں کا باشندہ معلوم ہوتا تھا، چھوٹی آنکھیں چپٹی ناک دو درخت ضرورت سے زیادہ بڑے اور نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے، جن کی وجہ سے اس کے جملوں کی ادائیگی میں فرق پڑتا تھا لیکن وہ بری شفاف انگلش بول رہا تھا۔

''اگر برا نہ مانیں تو کیبن بہتر رہے گا۔'' وہ اسی انداز میں بولا۔

یہ ایک قابل اعتراض پیشکش تھی جس میں اس کے گال پر تھپڑ بھی مار سکتی تھی لیکن ایک لمحے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ ایک تھپڑ سے کیا فائدہ، ذرا چند لمحوں کے بعد ایک دلچسپ پروگرام پیش کردوں گی کیونکہ بہت دن سے کوئی ورزش نہیں ہوئی تھی۔

''ہم اطمینان سے باتیں کرسکیں گے۔'' وہ دوبارہ بولا۔

''چلیے۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم اس کیبن میں داخل ہوگئے جہاں سے وہ نکلا تھا۔ اس میں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور میرے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔ ''میں آپ سے اپنا تفصیلی تعارف نہیں کراسکتا ہاں چند ضروری باتیں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔''

''میں تمہیں بہت وقت سے دیکھ رہی ہوں اور تمہیں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔''

''لیکن یہ نہیں جانتیں میں کون ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے اونیو کے نام سے پکار سکتی ہیں۔''

''بات کیا کرنا چاہتے ہیں آپ مسٹر اونیو؟''

''ہاں، میں بھی بتانے میں دیر نہیں کرنا چاہتا، کون جانے کون سا لمحہ وقت بدل جانے کا ہو، اس لیے ضروری بات فوری کیے لیتا ہوں۔''

''یہی بہتر ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اصل میں مجھے آپ سے خاص انسیت ہے۔ آپ بے حد ذہن اور اعلیٰ کارکردگی کی مالک ہیں اور میں اس طرح کے لوگوں سے خاص عقیدت رکھتا ہوں جس مشن پر آپ آئی ہیں میں اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میرے رونگھٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ کون ہے یہ بدنما انسان اور کیا جانتا ہے میرے بارے میں۔ اس کے الفاظ تو بڑے مشکوک ہیں۔ یہ میری کون سی اعلیٰ کارکردگی کی بات کر رہا ہے۔ اس طرح بات کر رہا ہے جیسے مجھے بہت پہلے سے جانتا ہے لیکن فوراً میں بے تاب ہو جانے کا مطلب ہے کہ اگر اس نے میرے بارے میں تکا مارا ہے تو کامیاب ہو جائے۔

میں نے اسے سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر تم میری اعلیٰ کارکردگی کے بارے میں جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ میرا ایک گھونسا جبڑا توڑ دیتا ہے۔''

''اوہ مجھے نہیں معلوم تھا لیکن خیر بھی اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔''

''ضرور کیجیے۔ آپ کے یہ دو دانت ویسے بھی آگے نکلے ہوئے برے لگتے ہیں۔ میں انہیں بلا معاوضہ ٹھیک کر دوں گی۔''

''آہ کاش! یہ دو منحوس دانت میری زندگی میں شامل نہ ہوتے تو......'' اس نے افسردگی سے کہا اور مجھے ہنسی آگئی۔

''تو کیا ہوتا؟'' میں نے کہا۔ ''لیکن درحقیقت میں اندر سے بڑی مضطرب تھی اور یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ میرے بارے مین کیا جانتا ہے۔

''میں آج تک کسی ......؟...... کے ہونٹوں کی حلاوت سے محروم ہوں۔ چلیے چھوڑیے، ہم غلط بحث میں پڑ گئے۔ میں آپ سے جو اہم بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ غلط جگہ آئی ہیں۔ ڈاکٹر لیوسکی ہانگ کانگ میں نہیں ہے۔ وہ اب آپ کے ہاتھ آ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے اب اس کے حصول کی کوشش آپ کے لیے بے مقصد ہو گی اور جو لوگ اس کے دوبارہ حصول کے لیے سرگرداں ہیں انہیں ناکامی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

نہ جانے کتنی اعصابی قوت کو بروئے کار لا کر میں نے اپنے بدن کی تھرتھری کو روکا تھا اور اس کے بعد سنبھل کر کہا تھا۔

''تو کیا واقعی ڈاکٹر ہیمر یہاں نہیں ہے۔''

''نہیں، کل رات میں اس لیے کانگ کانگ چھوڑ دیا ہے اور اس وقت وہ کسی نامعلوم جگہ محفوظ ہے۔''

''ایسٹرن کلاسکس میں ایک نام سامری جادوگر کا آتا ہے۔ مجھے آپ کے اندر اس کی جھلک نظر آتی ہے مسٹر اونیو، اپ بڑی جادوئی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میں نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑی مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے نفرت سے ناک سکوڑ کر رخ بدل لیا۔ اپنی جمالیاتی حس سے میں سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی۔

''تاہم آپ کوشش کر سکتی ہیں لیکن اس میں آپ کو بہت سے خطرات بھی پیش آسکتے ہیں۔آپ کو یہ اطلاع دینا بھی ضروری ہے۔''

''بے حد شکریہ۔'' گویا آپ کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر اس وقت ہانگ کانگ میں موجود نہیں ہیں۔

''جی اور میرا بہترین مشورہ ہے کہ آپ جس قدر جلد ہو واپس چلی جائیں مس ایلسی۔ یہ آپ کے لیے ضروری ہے۔'' اس نے کہا اور اچانک میرا خون سیروں بڑھ گیا۔اس سے مجھے ایلسی کہہ کر پکارا ہے۔اس لیے وہ جو کوئی بھی ہے، جتنا بھی خطرناک ہے لیکن مجھے ہیمر کی سیکریٹری ایلسی کی حیثیت سے ہی جانتا ہے اسے اس سے زیادہ میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے میں مسکرادی اور میں نے کہا۔

''مفت مشورے کے لیے شکریہ۔ میں یہ بھی نہیں پوچھوں گی کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے آپ کو ہر اس جگہ دیکھا ہے جہاں سے آپ نے میرا پیچھا کیا ہے لیکن میں کسی فضول بات پر کبھی اس وقت تک غور نہیں کرتی جب تک وہ میرے لیے کوئی مشکل نہ بن جائے اور میرے پیارے محسن، میں اکیلی ہانگ کانگ میں رہوں گی اور اپنے طور پر ساری باتیں معلوم کروں گی۔''

وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بھیانک مسکرادیا اور میں نے رخ بدل لیا۔اس کی آواز ابھری۔

''ہاں ہانگ کانگ کی سیر کرنا آپ کا حق ہے لیکن اپنے مقصد میں آپ کو کوئی کامیابی نہیں ہوگی۔البتہ میں اپ کو ایک پیشکش کر سکتا ہوں۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''پیشکش؟''

''ہاں۔''

''وہ کیا؟''

''کیا آپ ڈاکٹر ہیمر کے ساتھ رہنا پسند کریں گی؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ ان کی سیکریٹری رہی ہیں اور یقیناً اپ کو ان سے انسیت ہوگئی ہوگی اور یہی انسیت آپ کو یہاں خطرات سے دوچار ہونے کے لیے کھینچ لائی ہے۔اس لیے آپ چاہیں تو ہمیشہ ان کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔''

''آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری کروں۔''

''نہیں۔ بلکہ انسانیت کی خدمت کے عظیم مقصد کے لیے۔'' اس نے کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔''اس کی سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر لیونسکی شائریکا کے انسانیت دشمن یہودی سرمایہ کاروں کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔اس کا ضمیر جاگ گیا اور اس نے انہیں چھوڑ دیا۔اب وہ مظلوم فلاکت زدہ انسانوں کے لیے کام کرنا چاہتی ہے۔اس مشکل میں آپ چاہیں تو اس کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھتی رہی۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔'' آپ کے پاس سیل ہے؟ میرا مطلب ہے مقامی طور پر اس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔''

''ہاں کیوں؟''

''مناسب سمجھیں تو مجھے نمبر دے دیں۔ میں آپ سے دوبارہ گفتگو کر کے آپ سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ بھی ابھی کرلیں مسٹر اونبہ۔ ممکن ہے میں دوبارہ آپ سے بات کرنا پسند نہ کروں۔'' میں نے کہا۔
''کچھ باتیں وقت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ویسے آپ کی مرضی اگر مجھے آپ سے ملاقات کی ضرورت پڑی تو میں آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔''
''بیکار ہوگا۔'' میں نے کہا۔
''کیوں؟''
''اس لیے کہ میں نے آپ کی فضول بکواس پر توجہ نہیں دی ہے۔'' نہ ہی میں یہاں سے اس طرح واپس جانے کے لیے تیار ہوں لیکن پھر بھی میں اپنا نمبر تمہیں دیئے دیتی ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے میرا نمبر فیڈ کرلیا۔ ''اور کچھ۔'' میں نے کہا۔
''ہاں بہت کچھ، لیکن وقت آنے پر۔ آیئے اٹھیں۔ اس نے کہا اور میں کرسی سے اٹھ گئی۔ ہم دونوں کیبن سے باہر نکل آئے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر ایک طرف چل دیا۔ ایک بھی الوداعی لفظ نہیں کہا تھا اس نے۔''
''کرائے کا ٹٹو۔'' میں نے زیر لب کہا اور اپنی میز پر آگئی۔
میز پر بیٹھ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وہ کہیں نہیں نظر آیا تھا۔ میں اس پر غور کرنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کون تھا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ وہ کوئی عام بندہ نہیں ہے۔ البتہ اس بات سے مطمئن تھی کہ وہ مجھے ایلسی کی حیثیت سے جانتا ہے اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں معلوم''۔
تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر میں اٹھ گئی۔ اب یہاں دل نہیں لگ رہا تھا اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو یہ بات بڑی مایوس کن تھی کہ ڈاکٹر ہیمر اس وقت ہانگ کانگ میں نہیں ہے۔ پھر وہ کہاں ہے اور میں اسے کیسے تلاش کروں گی لیکن خیر یہ مشکل کا حل نکل ہی آتا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ میں اس کے بارے میں معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔''
پھر میں وہاں سے اٹھ گئی۔ اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ باہر میرا رکشہ کھڑا ہوا تھا۔ رکشہ والے کو میں نے اتنے پیسے دے دیئے تھے کہ وہ ساری رات میرا انتظار کرسکتا تھا۔ اس وقت وہ رکشہ چھوڑ کر کہیں آس پاس گیا ہوا تھا۔ کسی سے گپیں ہانک رہا ہوگا۔ میں رکشہ میں بیٹھ گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ کہیں سے نمودار ہوا اور رکشہ کی سیٹ پر جا بیٹھا۔'' میں نے اس سے کہا۔
''میرے ہوٹل چلو، جہاں سے میں نے تمہیں ہائر کیا تھا۔''
اس نے کوئی جواب دیئے بغیر رکشہ آگے بڑھا دیا۔ میں سوچوں میں گم ہوگئی۔ بہت سے خیالات دل میں تھے۔ یہ شخص ممکن ہے لائی چن انتظامیہ کا کوئی اہم رکن ہو اور اس کی ذمہ داری ہے کہ مجھے ڈاکٹر ہیمر سے ملنے سے روکے یا پھر مجھے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ یہ میری کامیابی تھی، باقی رہی ہیمر کی بات تو اس سے مل تو لوں۔ اس کے بعد فیصلہ کروں گی۔
رکشہ ڈریگن کلب کی طرف جارہا تھا لیکن اچانک وہ سیدھی سڑک پر چلتے چلتے ایک گلی میں مڑ گیا اور رکشہ والے نے گلی میں داخل ہوتے ہی ایک خاص ٹیکنیک سے رکشا کا اگلا پہیہ اوپر اٹھالیا۔ میرے لیے یہ بالکل غیر متوقع تھا۔ میں بے اختیار رکشا سے باہر سڑک پر آگری۔ رکشا چلانے والا کود کر میری طرف جھپٹا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ یہ رکشا ڈرائیور وہ نہیں تھا جس کے ساتھ میں آئی تھی۔ رکشا ممکن ہے وہی ہو، جگہ بھی وہی تھی جہاں میں نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا لیکن بندہ بدل گیا تھا۔ پتا نہیں اس بے چارے پہلے رکشا والے کے ساتھ کیا کیا۔
رکشا سے کود کر نیچے اترنے والا میری طرف جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے خنجر کو میں نے صاف دیکھ

لیا۔ میں زمین پر گری تھی جونہی وہ خنجر سنبھالے مجھ پر جھکا میں نے دونوں لاتیں جوڑ کر اس کے سینے پر ماریں۔ وہ میری طرح لڑکھڑایا تو میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پوری مہارت کے ساتھ گھوم کر ایک لات اس کی ناف کے نچلے حصے پر ماری اور وہ چیخ مار کر گر گیا۔

لیکن یہ ساری سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ وہاں اس کا دوسرا ساتھی بھی موجود تھا جس کی لات پوری قوت سے میری کمر پر پڑی اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ دوسرے لمحے دوسرے خنجر کی دھار چمکی۔ جونہی خنجر میری طرف لپکا میں نے جھکائی لے کر اس کا وار خالی کر دیا۔ دوسرا حملہ آور کسی قدر بھاری جسم کا مالک تھا۔ اس کا توازن خراب ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے پوری مہارت سے خنجر کا دوسرا وار کیا۔ مجھے رکشہ ڈرائیور کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ نیچے گرے گرے میری ٹانگیں پکڑ کر گرانے کی کوشش نہ کرتا۔ اصولی طور پر اسے اس وقت یہی کرنا چاہیے تھا۔ ادھر دوسرا حملہ آور اس وقت اپنی لڑائی بھڑائی کی مہارت کے ساتھ مناسب پینترہ بدل رہا تھا تاکہ اس کا دوسرا وار خالی نہ جائے اور اس نے کیا بھی یہی۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کے خنجر کے وار سے بچنے کی کوشش میں تھی لیکن اس نے مجھ پر فلائنگ کک لگا دی۔

مجھے بس اتنا کرنا پڑا تھا کہ اس کا نشانہ خالی دے دوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ زمین پر گرا تو میں نے گھوم کر ایک لات اس کے ماری جو اس کی پسلیوں پر پڑی اور اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

لیکن رکشا ڈرائیور نے وہی کیا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ اس نے گرم گرم میرا پاؤں پکڑا اور پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ اس بار میں بری طرح گری تھی لیکن دونوں بے وقوفوں کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ سب تو میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ نیچے گر کر ہی میں نے اپنی چوٹ بھول کر لوٹ لگائی اور رکشا والے کی زد سے بچ گئی جس نے چھلانگ لگائی اور بڑے آرام سے اپنے ساتھی پر جا گرا لیکن اس بار اسے شدید نقصان پہنچا تھا کیونکہ نیچے گرے ہوئے شخص کا خنجر اس کی ران میں پیوست ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گالی نکلی تھی۔

پتا نہیں اس وقت ان دونوں کے دلوں میں کیا خیال ہو گا۔ ایک مست شباب دوشیزہ سے تو پیار کیا جاتا ہے۔ اس کی دلکشی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے لیکن یہاں ہڈیوں کی مزاج پرسی ہو گئی تھی سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ اور پھر ان کے بھاگنے کا منظر بڑا دلچسپ تھا۔ ان میں سے ایک ران کا زخم پکڑے بھاگ رہا تھا اور دوسرا کمر پر ہاتھ رکھ کر لنگڑا لنگڑا کر بھاگ رہا تھا۔ ابھی میں ان کے بھاگنے کا منظر دیکھ رہی تھی کہ مجھے گلی کے دوسرے سرے پر قدموں کی آواز سنائی دی اور میں اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ یہ صورت حال خراب تھی۔ ہو سکتا ہے ان کے دوسرے ساتھی ہوں جو اس صورت حال کے نتائج دیکھتے آ رہے ہوں لیکن آواز دوبارہ نہ آئی۔

دونوں بھاگنے والے گلی کے دوسرے سرے سے باہر نکل گئے۔ گو میں بھی اسی طرف چل پڑی۔ گلی کے دوسرے سرے پر نکل کر میں نے اپنا حلیہ تبدیل کیا اور پھر ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی جسے میں نے اشارے سے روکا اور اپنے ہوٹل چل پڑی۔

☆☆☆

اگر میں آپ سے کہوں کہ یہی سب میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ ہے اور میں اس میں خوش رہتی ہوں تو آپ اسے شیخی خوری کہیں گے۔ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ اپنے آپ کو منفرد ظاہر کرنے کی کوشش ہے۔ جو انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ آپ کہتے رہیں آپ کا حق ہے جو بھی سمجھیں۔ میں یہ سب کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میں واقعی صنف نازک کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہوں۔ مجھے مار پیٹ، دنگوں اور قتل و غارت گری میں جو مزہ آتا ہے کسی اور چیز میں نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے خطرناک ترین حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ ایسے کہ میری جان کے لالے پڑ جائیں اور میں اپنی جان بچانے کی کوشش کروں۔ اس میں سب کچھ ہو سکتا ہے کیونکہ ہوں میں انسان۔ مکمل انسان، مکمل نوجوان۔ اب آپ کو لفظی چاشنی فراہم کرنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ بس یوں سمجھ

لیس کہ......ڈش......ڈش۔

تو جناب میں ہوٹل پہنچ گئی۔ اس کم بخت رکشہ والے کے ساتھی نے کمر پر جولات ماری تھی اس نے کمر کی کچھ ہڈیوں کی مزاج پرسی کی تھی۔ ہوٹل کے کوریڈور میں چل کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دل چاہ رہا تھا کہ تھوڑی سی لنگڑا کر چلوں۔ لیکن شرم آتی تھی۔

البتہ کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا۔ اور پھر ایک خاص قسم کی ورزش کی جس کی تفصیل آپ کو نہیں بتاؤں گی۔ سوری۔ خیر۔ اس کے بعد سوچوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہانگ کانگ میں دلچسپ استقبال ہوا تھا اور امید تھی کہ بہت سے دل والوں سے واسطہ پڑے گا۔ اور ٹھیک ٹھاک ورزش کرنی پڑے گی۔ اب صحت سونا چاہتی تھی۔

دوسری صبح پر سکون تھی۔ بلکہ خوش گوار تھی۔ اور اس وقت مزید خوش گوار ہو گئی جب ہوٹل کے ریسپشن سے فون موصول ہوا۔ ''میڈم آپ جاگ رہی ہیں۔''

''ہاں۔ کیوں؟''

''آپ کی کال ہے۔'' ریسپشنسٹ نے کہا اور میرے فون پر کال ملا دی۔

''ہیلو!'' دوسری طرف ایک کھر کھراتی آواز سنائی دی۔ اور میں غور کرنے لگی۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی آواز بدل کر بول رہا ہو۔ میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اور میرے ذہن کی گہرائیوں سے ایک نام ابھرا۔ اوینو مکروہ صورت اوینو۔ ہاں بولنے کے انداز میں تھوڑی سی مماثلت پائی جاتی تھی۔ ''ہیلو'' آواز دوبارہ سنائی دی۔

''ہیلو۔ کون؟''

''نہ دوست نہ دشمن۔'' دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

''فون کیوں کیا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں کیا۔

''تھوڑی سی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سلسلے میں۔''

''تمھیں ڈاکٹر لیونسکی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت لائی چن میں نہیں ہے۔ میں تمھیں اطلاع دیتا ہوں کہ وہ اس وقت ہانگ کانگ میں ہے۔

''میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟''

''فضول بکواس مت کرو، پتا نوٹ کرو۔ وینو نے کرخت لہجے میں کہا۔ بڑا توہین آمیز انداز تھا۔ میرے سامنے ہوتا تو بتاتی۔ غصے کی وجہ سے میری آواز نہ نکل سکی۔ لیکن دوسرے لمحے میرے اندر کی اپنی پارک جاگ اٹھی جو چالاک اور مصلحت ساز تھی۔ اگر اس شخص پر توجہ نہ دی تو گم ہو جائے گا اور میں اس سے اپنی توہین کا بدلہ نہ لے سکوں گی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے پتا لگاؤ۔''

''نوٹ کرو۔''

''بتاؤ'' میں نے کہا اور وہ ایک ایڈریس مجھے سمجھانے لگا۔ میں نے ایڈریس اچھی طرح سمجھ لیا اور پھر تھکاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے ٹھیک پتا بتایا ہے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ اپنے باس سے ملنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ ممکن ہے میں ان کے ساتھ یہیں رہ پڑوں۔ لیکن میں تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے۔ تم سمجھدار ہو۔''

میں نے اس پر بھرپور وار کیا لیکن نتیجہ بڑا مایوس کن تھا۔ ایک مکروہ قہقہہ میرے کانوں میں ابھرا اور فون بند

گیا۔ میری آنکھوں میں اوتیو کی کراہت بھری شکل گھوم گئی خاص طور سے وہ دونوں دانت جو اس کے نچلے ہونٹ پر رکھے تھے۔ ذوقِ حسن کا میری فطرت میں اچھا خاصا دخل تھا اور جب بھی اپنے اندر جھانکتی تو یہ سوال ضرور میرے دل میں ابھرتا کہ میری نسوانیت کی کائنات پر چھا جانے والا کیسا ہوگا۔

اوتیو کا تصور ذہن میں آیا تو ایک عجیب سی توہین کا احساس ہوا۔ بے شک میں اس وقت اینی پارک نہیں بلکہ لیونسکی کی سیکریٹری، ایلسی کے روپ میں تھی اور میرے چہرے پر ایلسی کا میک اَپ تھا لیکن ایلسی بھی کیا بُری تھی۔ اس منحوس خرگوش جیسے دانتوں والے کو تو قریب سے دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہے گا۔

پھر خود پر ہنسی آ گئی۔ بلاوجہ سلگ رہی ہوں بھاڑ میں جائے۔ لیکن۔ ارے اوہ یہ تو سوچا بھی نہیں اس نے مجھے لیونسکی کا پتا کیوں بتایا ہے۔ آخر کیوں...... تب بہت سی احتیاطیں میرے ذہن میں ابھریں۔ کیا کوئی کسی خاص وجہ سے مجھے ایڈریس پر بلانا چاہتا ہے۔ اوہ۔ گڈ۔ میں آؤں گی۔ میری جان ضرور آؤں گی۔ اینی پارک تو جان ہتھیلی پر لیے ہوتی ہے۔ اس کا محبوب مشغلہ موت سے پنجہ کشی ہے۔ وہاں ایلسی نہیں اینی پارک آئے گی۔

☆☆☆

جس علاقے کا مجھے پتہ بتایا گیا تھا میں وہاں پہنچ گئی۔ بہت عجیب جگہ تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ مکان تھے مگر قبروں کی طرح خاموش، ویران ویران۔ بالکل مقبرے معلوم ہو رہے تھے۔ روشنی کی ایک جھلک کہیں نہیں تھی۔ لوگ شاید جلد سو جانے کے عادی تھے یا پھر یہ مکان ہی غیر آباد تھے۔

ویسے ڈاکٹر لیونسکی جس پائے کا شخص تھا اس کا مجھے اندازہ تھا کہ اس کی سخت نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ وہ لوگ اس کے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جس مکان کا مجھے پتہ دیا گیا تھا وہ بھی دوسرے مکانوں کی طرح ویران نظر آ رہا تھا۔ میں نے چند لمحوں اس کے جائے وقوع کا اندازہ لگایا۔ اس شخص کو تو بہت سخت پہرے میں رکھنا چاہیے تھا اس کے ارد گرد زبردست سیکورٹی ہونی چاہیے تھی۔ پتہ نہیں اسے اس جگہ کیوں رکھا گیا ہے۔ یا پھر مجھے یہاں دھوکے سے بلایا گیا ہے۔ لیکن میں محتاط تھی۔

میں نے اس مکان کی کال بیل پر انگلی رکھی اور دوسری گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بھیانک وجود دروازے میں نظر آیا۔

میرے خدا، انسان تھا یا روایتی کہانیوں کا دیو، اس کے دونوں شانے چوکھٹ کی چوڑائی کے برابر تھے۔ بالوں سے بھرے ہوئے بازو آدھی آستین کی قمیض کے باہر موٹی موٹی شاخوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ چہرہ فٹ بال کے سائز کا گول اور ناک کئی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی یہ غالباً بار بار ضرب لگنے سے خراب ہوئی تھی۔ آنکھیں برق کی طرح تیز اور چمکدار تھیں۔ بال چھوٹے چھوٹے تھے اور گردن جیسے تھی ہی نہیں۔ تھوڑی گویا سینے پر ٹکی ہوئی تھی۔ قد سات فٹ سے بھی کچھ اونچا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر کے زمانے کا آدمی اس دور میں نکل آیا ہو۔ میں نے عجوبوں میں بھی اتنا بھیانک آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس کی غراہٹ ابھری۔

''کیا بات ہے؟''

''مجھے ڈاکٹر ہیمر لیونسکی سے ملنا ہے۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ۔'' اس نے پھر بھیڑیوں جیسے انداز میں غرا کر کہا اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔

میں خاموش کھڑی رہ گئی۔ میرے اندر غصہ جاگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ ویسے میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ دروازے کے پاس سے گیا نہیں ہے اس کے علاوہ دوسری طرف سے بھاری سانسوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی بھینسا کھڑا کر کر رہا ہو۔ میں وہ آواز سنتی رہی۔ اس

وقت میری ناک پر پانی کی ایک بوند پڑی اور میں نے چونک کر آسمان کی طرف۔ بادل بہت گھرے ہو رہے تھے اور شاید بارش تیار تھی۔

اس موٹے بھینسے کی ایسی تیسی، آج بلڈوزر سے زور آزمائی سہی، میں نے دل میں سوچا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میں وہاں سے ہٹی اور مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس کے عقب میں چلی گئی۔ یہاں ٹین کے چھوٹے بڑے ڈبوں اور بوتلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جیسے بیکار چیزیں پھینکنے کی جگہ ہو۔ اس احاطے میں مکان کا عقبی پھاٹک بھی موجود تھا۔ میں آرام سے آگے بڑھی اور پھاٹک پر چڑھ کر اندر کود گئی۔ دوسری طرف اچھا خاصا لان تھا چاروں طرف گھاس تھی اور درمیان میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ مکان سے کوئی چھ فٹ دور ایک گھنا درخت نظر آ رہا تھا جس کی بلندی مکان کے جتنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی۔

میں نے گردن ہلائی اور پھر درخت کی طرف بڑھ گئی۔ اس قسم کے کاموں میں مجھے زبردست مہارت حاصل تھی چنانچہ میں درخت پر چڑھ گئی۔ اوپر جا کر شاخیں پتلی اور کمزور ہو گئی تھیں یہ شاید میرا بوجھ نہ سہار سکیں لیکن یہی پتلی کھڑکی تک پہنچا سکتی تھیں۔ یہ میرے لیے لحہ فکریہ تھا۔ اب کیا کروں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان پتلی شاخوں کو آزماؤں اگر گر گئی تو کتنی چوٹ لگے گی اس کا اندازہ بھی کیا تھا۔ درخت کافی اونچا تھا اور نیچے زمین سخت تھی۔

اور پھر جمناسٹک کا کھیل شروع ہو گیا۔ کافی خطرناک کھیل تھا۔ میں ایک شاخ نازک پر جھولا جھول رہی تھی۔ اور میری نظریں بھوکی بلی کی طرح کھڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ میں اس پر کک لگاؤں گی اور اندر جا پڑوں گی۔ کھڑکی ٹوٹنے کی آواز ضرور ہو گی۔ اور پھر میں ہوں گی اور وہ افریقہ کا بھینسا۔ کیونکہ کھڑکی ٹوٹنے کی آواز پر وہ ضرور آئے گا اور میری اس سے مڈبھیڑ ہو گی۔

تین چار جھولے لے کر میں نے شاخ چھوڑ دی اور دونوں پاؤں بند کھڑکی پر مارے۔ ویسے میری بہت سی کامیابیوں میں میری خوش قسمتی کا بھی دخل رہا ہے۔ بات چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، وہ ہوتی ہے جس میں کامیابی حاصل ہو، میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔ خیر میں بتا رہی تھی کہ اس وقت بھی وہ ہوا جس کی مجھے توقع نہیں

تھی، یعنی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس کے دونوں پاٹ بس بھڑے ہوئے تھے اور چٹخنی نہیں لگی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں کھل گئے اور میں اندر جا پڑی۔ اور اندر بھی فرش پر موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ گویا قدرت نے یہ دونوں آسانیاں مجھے فراہم کر دی تھیں۔

ہوش وحواس درست ہوئے تو میں بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے کا ماحول تاریک نہیں تھا اس میں بہت ہی نفیس قسم کا نائٹ بلب جل رہا تھا جس کی مدھم روشنی کمرے کے ماحول کو اجاگر کرتے ہوئے بتا رہی تھی کہ وہ بیڈروم ہے۔ مزید غور کیا تو بیڈروم کے بیڈ پر ایک انسانی جسم نظر آیا جس نے کروٹ بدلی ہوئی تھی اور اس کے گہرے سانسوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

میں نے پھرتی سے پستول نکال لیا اور دبے قدموں چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ترین ہوگئی۔ کیا یہ ممکن ہے یا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ کیا دنیا کے ذہین ترین سائنس دان، ایک مایہ ناز موجد تک رسائی اتنی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ یہ شخص تو حکومت لاٹی چن کے لیے ہیرے کی کان ہے اس سے تو اسے بڑے زبردست فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کسی بیرونی شخص کی رسائی اتنی آسانی سے اس تک ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ ہیمر لیونسکی ہی تھا۔

میں نے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پایا اور بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر آہستہ سے اسے آواز دی۔

''ڈاکٹر لیونسکی۔''

میری اس ہلکی سی آواز پر ہی انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔

''یہ میں ہوں ڈاکٹر۔ ایلسی براؤن۔'' میں نے کہا اور میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کے منہ سے ہلکی سی بڑبڑاہٹ نکلی۔

''ایلسی براؤن؟''

''آپ کی سیکریٹری ایلسی۔'' میں نے کہا اور اچانک ڈاکٹر زور سے اچھلا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف۔ میرے حساس کانوں نے بھی دروازے سے دوسری طرف بھاری قدموں کی آوازیں سن لی تھیں۔

میں نے پھرتی سے پستول لباس میں چھپا لیا۔ اس وقت دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور وہی دیو قامت بھینسا اندر داخل ہو گیا۔ لیکن وہ تنہا نہیں تھا اس کے پیچھے ایک اور شخص بھی تھا جو شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھا۔ بڑی پروقار شخصیت کا مالک تھا اور مقامی باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ دیو قیامت جانور نما شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور غراتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ کہا...... نووارد نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اسے پیچھے ہٹا کر آگے بڑھا۔ اس نے میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے نرم اور پراحترام لہجے میں ہیمر لیونسکی سے کہا۔

''یہ کون ہیں ڈاکٹر؟''

''میرا نام ایلسی براؤن ہے۔ شائر یکا میں، میں ان کی سیکریٹری تھی۔'' ڈاکٹر کے بولنے سے پہلے میں بول پڑی۔

ڈاکٹر لیونسکی کو جیسے ہوش آ گیا۔ آنے والا شخص اب بھی میرے بجائے ڈاکٹر ہی کی طرف متوجہ تھا۔ ڈاکٹر نے سنبھل کر کہا۔ ''ہاں یہ ایلسی ہے۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

دیو قیامت شخص نے پھر میری طرف دیکھ کر بدستور خونخوار لہجے میں کچھ کہنا چاہا لیکن نووارد نے اسے روک دیا اور تعظیمی انداز میں گردن جھکا کر بولا۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر آپ ضرور باتیں کیجیے۔'' ساتھ ہی اُس نے پھر دیو قامت کے بازو کو چھوا اور اسے

ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر ہیمر کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس کے چہرے کا تجزیہ کر رہی تھی۔ میں خود کو اس معاملے میں بہت ذہین نہیں کہتی لیکن مجھے صاف اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر اپنی مرضی سے یہاں محصور نہیں ہے۔

میں نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے آنکھوں کا تاثر سخت کیا جیسے مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ پھر بولا۔

''میں جانتا تھا کہ تمہاری محبت تمھیں مجھ سے دور نہیں رہنے دے گی۔ لیکن بے بی، بعض معاملات ویسے ہی ہوتے ہیں جن میں محبت سے کام نہیں چلتا، البتہ تم نے واقعی بڑی ہمت کی۔ لیکن تم یہاں تک آئیں کیسے؟''

''درخت پر چڑھ کر۔'' میں نے ہنس کر کہا اور کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے میری ہنسی میں میرا ساتھ دیا اور بولا۔

''تم نے بے چارے درخت سے زندگی چھین لی۔ کل وہ ضرور کٹ جائے گا۔''

میں غور سے ڈاکٹر کا جائزہ لے رہی تھی۔ ڈاکٹر کو ان حالات میں جو باتیں کرنی چاہیے تھیں، وہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں خفیہ مائیکروفون نصب تھے جن پر یہاں ہونے والی گفتگو نہیں اور سنی جاسکتی تھی۔ اس کے امکانات بھی تھے کہ کیمرے بھی چھپے ہوئے ہوں کیونکہ کسی طرح کے اشارے بھی نہیں کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے میں بے آرام بیٹھی ہوں۔ کیا میں وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاؤں گا۔''

''ہاں ضرور...... مگر کرسی اس طرف لے آؤ۔'' اس نے ٹیبل لیمپ کی طرف اشارہ کر کے کہا اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ ٹیبل لیمپ ہی خطرناک ہے۔

''ہم سب آپ کے لیے پریشان تھے۔ آپ نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ آپ شاریکا چھوڑ رہے ہیں۔''

''میں نے تمہارے ملک سے تعلقات ختم کر لیے ہیں اور اب میں مستقل طور پر یہیں رہوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ۔ آپ کو وہاں کوئی تکلیف پہنچی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس کچھ عوامل تھے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سرمایہ دار، انسانیت کے بدترین دشمن بن چکے ہیں وہ ہر طرح سے سکوں کی سیاست کو اپنی مٹھی میں لے کر دنیا کو تباہ کر رہے ہیں۔ کون سے شعبے کو انھوں نے چھوڑا ہے۔ صنعت، زراعت اور انسانی زندگی سے متعلق جو کچھ بھی ہو سکتا ہے انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ سائنسی تجربات سے مخلوق کو ختم کر رہے ہیں۔ میں اس سازش میں ان کا ساتھ نہیں دینا چاہتا۔''

''کیا آپ لائی چن میں قیام کریں گے۔''

''ہاں۔ یہی ارادہ ہے۔''

''وجہ۔''

''تم بھی جانتی ہو۔ وہ ایک انسان دوست ملک ہے۔ وہاں خوفناک ایٹمی ہتھیار نہیں بنائے جا رہے ہاں اگر انھوں نے اس طرح کی کچھ چیزیں بنائی بھی ہیں تو صرف اپنی بقا کے لیے تاکہ ایٹمی ممالک اسے تر نوالہ نہ سمجھیں۔ اس کے علاوہ لائی چن جو کچھ کر رہا ہے انسانیت کی بقا اور مخلوق کی فلاح کے لیے کر رہا ہے۔''

''آپ کے آخری فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کس بات کا۔''

''یہ کہ آپ شاریکا واپس نہیں جائیں گے۔''

ڈاکٹر چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے پر تشویش نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک کاغذ

کا پیڈ اور پنسل اٹھالی اور اس پر کچھ لکھتے ہوئے بولا۔

''ظاہر ہے اتنا بڑا قدم میں نے سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے۔''

''آپ کے فیصلے میں کوئی گنجائش ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' ڈاکٹر لیونسکی نے کہا۔

''میرا خیال تھا میں آپ کو واپسی کے لیے آمادہ کرلوں گی۔ میں نے طویل عرصہ تک آپ کے ساتھ کام کیا ہے اس لیے بڑے اعتماد کے ساتھ یہاں آئی تھی۔''

''میں تمہارے خلوص کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میں واپس نہیں جاسکتا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کی تحریر پڑھی۔ لکھا تھا۔'' میری بیوی اور بیٹا کچھ انتہائی خطرناک لوگوں کی قید میں ہیں۔ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ ان دونوں کو ہلاک کردیں گے۔ یہ ان کا انتباہ ہے۔ اس کاغذ کو کسی طرح تلف کردو۔''

میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ ایک شدید اہم انکشاف تھا جس کے بارے میں میرے سوا کسی کو نہیں معلوم تھا۔ اور اس کے پیچھے بہت سے سوالات تھے جو میں نے کسی طور پر اس سے نہیں کرسکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ لاتی چنز ہیں؟''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کاغذ کے پرزے کی گولی بنائی اور اسے مٹھی میں چھپالیا۔

''میں تمہاری اس کوشش کا شکر گزار ہوں۔ لیکن تم واپس جاکر حکومت شائریکا کو یہ بتادو کہ وہ میری جستجو نہ کرے۔ اور میرے بیوی بچے کو بھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ میری بیوی اس فیصلے میں میری شریک نہیں ہے۔ وہ جب چاہے مجھ سے طلاق لے سکتی ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے اشارے سے کاغذ کی گولی نگلنے کے لیے کہا۔

''یہاں واش روم ہے ڈاکٹر۔''

''ہاں۔ وہ واش روم کا دروازہ ہے۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

''پلیز......ایک منٹ۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کر واش روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں آ کر میں نے کاغذ کی گولی تلف کی۔ پھر واپس آ کر کہا۔ ''گویا آپ کی طرف سے کوئی لچک نہیں ہے۔''

''ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔''

''او کے سر۔ میں چلتی ہوں۔ کل فلائٹ سے واپس چلی جاؤں گی۔ اس لیے خدا حافظ۔''

''خدا حافظ ایلسی......'' ڈاکٹر نے کہا اور انگلی سے میز کے نیچے لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور وہی شخص اندر داخل ہوگیا۔ جو دیو قامت کے ساتھ آیا تھا۔

''یہ جارہی ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''بہت بہتر جناب۔'' اس شخص نے گردن جھکا کر بڑے احترام سے کہا۔

میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کردیا اور ایک طرف اشارہ کرکے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''ادھر اس طرف میڈم۔ اس کا اشارہ ایک طویل کوریڈور کی طرف تھا جس کے دونوں طرف کمروں کے دروازے سے نظر آرہے تھے۔ میں اس طرف بڑھ گئی۔ وہ میری رہنمائی کے طور پر مجھ سے چند قدم ہٹ کر چل رہا تھا۔ کوریڈور میں کوئی دس گز کے آگے چلنے کے بعد اچانک وہ پلٹا اور اس نے ایک کولٹ کا نیو میرے سینے سے لگا دیا جس کی نال بہت لمبی تھی۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک لمحے کے اندر میرے ذہن میں بجلی سی چمک گئی۔ میں جس طرح یہاں آئی تھی اور جس طرح انھیں میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ کافی حد تک غیر فطری تھا۔ لیکن مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب صورت حال کھل کر سامنے آئی تھی۔ ان لوگوں نے اتنی شرافت سے مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔

''کیا مطلب۔'' میں نے وحشت کا مظاہرہ کیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ نہ ہی تم اتنی فرشتہ صفت ہو کہ خاموشی سے چلی جاؤ گی۔ کیونکہ جس طرح تم عمارت میں داخل ہوئی تھیں وہ عام بات نہیں ہے۔''

''کیا چاہتے ہو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔ صرف اتنا کہ اب خاموشی سے چلی جاؤ۔ تم نے اپنا فرض پورا کر لیا ہے۔ ہمیں ہمارے فرض کی ادائیگی کے لیے مجبور نہ کرو۔''

اس شخص کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ اب وہ ایک سفاک شخص نظر آرہا تھا اور میری چھٹی حس دیکھ رہی تھی کہ وہ مجھے اتنی شرافت سے نہیں جانے دے گا۔ چنانچہ میں بھی تیار ہو گئی۔

''جاؤں۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا اور واقعی اس نے مجھ سے گھر سے باہر نکلنے تک کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن میرے اعصاب اب بھی کشیدہ تھے۔ ناممکن ہے یہ۔ جو ہو رہا ہے وہ ناممکن ہے۔ تاہم میں گھر کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ باہر اب باقاعدہ بوندا باندی ہو رہی تھی اور سڑک گیلی ہو رہی تھی۔ راستہ دھندلایا ہوا تھا۔ ٹیکسی کا بھی پتا نہ تھا۔

وہی ہوا جو میری چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ میں تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اچانک ایک کال بوتھ کے پیچھے سے وہی دیو قامت نکل آیا جس سے میرا عمارت کے اندر واسطہ پڑ گیا تھا۔

میرے قدم رک گئے۔ وہ مجھ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے پھرتی سے جگہ تبدیل کی اور نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن اپنی جسامت کے خلاف وہ بڑا پھرتیلا نکلا۔ اس نے جھپٹ کر میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے زور سے دھکا دیا۔ میرا سر ایک مکان کی دیوار سے ٹکرایا اور سارے جسم میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بچے کی طرح اٹھا لیا اور پھر پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔

جان لیوا کوشش تھی۔ میری ہڈیاں چور چور ہو جاتیں لیکن میں نے جوڈو کے پینترے کو استعمال کیا اور پیروں کے بل زمین پر آئی۔ مجھے پٹخ کر وہ پیچھے ہٹا اور میں پیروں کے بل کھڑی ہو گئی۔ لیکن وہ بھی لڑائی کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے حلق سے غراہٹ نکال کر میری گردن پکڑ لی۔ خدا کی پناہ انگلیاں لوہے کی بنی لگتی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے بڑی مہارت کے اس کی ناک پر گھونسے لگائے۔ پھر سینے اور پیٹ پر کئی چاپ مارے۔ یہ چاپ اچھے اچھوں کو لمبا کر سکتے تھے۔ لیکن اس شخص کو تو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔ اس نے میری گردن نہ چھوڑی اور میری ذہنی قوتیں ساتھ چھوڑے دے رہی تھیں۔ آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ایک ایسی آواز ہوئی تھی جیسے کسی بوتل کا کارک کھلا ہو۔ دوسری آواز ہوئی اور میرا گلا چھوٹ گیا۔ لیکن ساتھ ہی میں نے ایک کریہہ منظر دیکھا۔ اس کا بھیجہ اڑ گیا تھا۔

(اینی پارک...... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔

اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

کھڑکی



ارم ناز

عورت کے انتقام کی ایک منفرد داستان' جسے ارم ناز کے قلم نے پیراہن دیا



میں زمین کی طرح اپنے مدار میں گھوم گھوم کے تنگ آ گئی تھی۔ میرے آقا نے میرے قدموں کے آگے لکیر کھینچ دی تھی اور میں اس کی زر خرید لونڈی اس لکیر سے آگے جانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ بغاوت کی سوچ بھی میرے بدن سے کھال اتروا سکتی تھی۔ وہ مرد تھا اسے سب کچھ معاف تھا۔ عیاشی تو اس کا حق تھا۔ میں پہلے جس گھر میں رہتی تھی وہاں کے مرد اپنا مزاج دکھاتے تھے پھر انہوں نے مجھے ایک دوسرے مرد کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اب میں اس کا مزاج دیکھ رہی ہوں۔

میں کہاں ہوں؟ میری پسند، ناپسند، میرا غصہ میرا پیار۔ میرا اوڑھنا یہ سب تو مر چکا تھا یا شاید بھی تھا ہی نہیں۔ میری ماں نے سمجھایا تیرا شوہر تیرا مالک ہے۔ اس کے قدموں میں فرش کی طرح بچھ جا اور میں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بچھ گئی۔

وہ روز مجھے اپنے قدموں تلے کچلتا اور اُف کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ آٹھ سال گزرنے کے باوجود بھی خدا نے مجھے اولاد کی دولت سے نہ نوازا تھا۔ بغیر جانچے پرکھے مجھے با آسانی قصوروار ٹھہرا دیا گیا۔ بانجھ ہونے کا میڈل بھی میرے ماتھے پر چسپاں کر دیا گیا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ میری بھوری آنکھیں میری خوب صورتی نہیں بلکہ بے وفائی کی علامت تھیں۔ بقول میرے مجازی خدا کے بھوری آنکھوں والی عورتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ بے وفا اور دھوکے باز ہوتی ہیں۔ خدا بہتر جانے مجھ سے پہلے وہ کتنے تجربوں سے گزر چکا تھا مگر میرے لیے شک کا کیڑا اس کی کھوپڑی میں کلبلاتا رہتا تھا۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتا میں حالت امتحان میں رہتی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں ایسے چبھتی جیسے دیوار پر ناخن رگڑ کر کوئی چونا کھرچ رہا ہے۔ خدا کی مہربانی تھی کہ ساس نندوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھی مگر چھٹی کے روز میرا شوہر میری ساس اور نند بن جاتا تھا۔ باورچی خانے کی صفائی پر دیر تک سناتا، روٹی کے موٹے کونے دکھا دکھا کر سیکڑوں طعنے دیتا۔ وہ ایک کپڑے کی مل میں کام کرتا تھا۔ خدا کو میری آزادی منظور تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ میرا شوہر سلیم جس کپڑے کی مل میں کام کرتا تھا اس مل کا مالک دیوالیہ ہو گیا، مل بند کرنی پڑ گئی۔ سلیم بیس روز تک تلاش روزگار میں مارا مارا پھرتا رہا مگر نہیں کوئی کام نہ ملا۔ سلیم کے مل کے ہی پانچ دوست کام کے سلسلے میں فیصل آباد جا رہے تھے کیونکہ فیصل آباد میں کپڑے کی بہت بڑی صنعت ہے لہٰذا وہاں کام ملنا مشکل نہ تھا۔ سلیم بھی دوستوں کے ساتھ فیصل آباد جانے کے لیے راضی ہو گیا۔ اب میرا مسئلہ تھا۔ ماں باپ مجھے رکھنے کو راضی نہ تھے اور میں خود بھی وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ سلیم نے آج تک

مجھے قید میں رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اپنی مٹھی سے آزاد کرے۔ مالک کے لیے پٹے سے بندھے وفادار کتے کو آزاد کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور وفادار بھی ایسا جو ہر حکم پر دم ہلائے...... طے یہ پایا کہ مجھے اسی گھر میں رہنا ہوگا۔ بلا ضرورت گھر سے نکلنا سختی سے منع بھی تھا۔ مہینے کے آخر میں سلیم ایک چکر کراچی کا لگا جائے گا۔ پیسے اور ضرورت کی اشیاء مہینے کے آخر میں وہ گھر میں ہی فراہم کرے گا، مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوگی۔ بہت مجبوری میں صرف ڈاکٹر کے کلینک جانے تک کی اجازت ملی۔

تمام شرائط لاگو کر کے سلیم فیصل آباد کے لیے نکل کھڑا ہوا اور میں گھر میں اکیلی رہ گئی۔

یہ ایک نئی آبادی تھی اس لیے، بہت کم گھر آباد تھے، زیادہ تر خالی پلاٹ اور تالا لگے مکانات تھے۔ یہ گھر بھی دو کمروں صحن باتھ روم اور کچن پر مشتمل تھا۔ سلیم سامنے کے مکان والی بڑی بی کو میری جاسوسی پر لگا گیا تھا۔ چند دن تو میں خالی گھر میں بوکھلائی بوکھلائی پھری، پھر میں نے بھی مصروفیت ڈھونڈھ لی۔

کمرے کی پچھلی کھڑکی روڈ کی طرف کھلتی تھی مگر سلیم نے یہ کھڑکی کبھی نہ کھولی تھی۔ کھڑکی کھولنا تو دور کی بات میں تو ارادہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سلیم کے ہاتھ کی مار سے زیادہ تکلیف دہ اس کی زبان کی مار تھی۔ خیر میں نے کھڑکی کھول لی۔

تازہ ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا، عرصے بعد تازہ ہوا نے میری روح کو طمانیت بخشی۔ اس قید میں رہتے ہوئے میں کسی دوسرے شخص کا چہرہ دیکھنے اور آواز سننے کو ترس گئی تھی۔ روڈ زیادہ چلتا ہوا تو نہ تھا مگر پھر بھی اکا دکا گاڑیاں اور لوگ گزرتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی لڑکا لڑکی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے گزرتے، کبھی کوئی میاں بیوی اپنے بچوں کی فوج کو گھسیٹتے ہوئے نظر آتے، کبھی کوئی برقع والی پسینے میں شرابور سودا سلف اٹھائے دوڑی جا رہی ہوتی۔ میرا بھی دل کرتا کہ روڈ پر بلا مقصد گھوموں مگر بڑی بی تو اپنے دروازے پر میری جاسوس بن کر بیٹھی رہتی۔ چند دن گزرے بڑھیا اپنی ڈیوٹی سے اکتا گئی اسے کوئی ایسی بات نظر نہ آئی کہ مرچ مسالا لگا کر سلیم کو بتاتی۔ اب بڑی بی



صرف صبح کے وقت دروازے پر بیٹھتی۔ دھوپ تیز ہوتے ہی گھر کے اندر چلی جاتی۔ جاسوسہ کا خوف بھی مر چکا تھا۔

کمر میں بہت درد تھا، سوچا ڈاکٹر کے پاس چلی جاتی ہوں دوا بھی لے لوں گی، سیر بھی ہو جائے گی۔ اگر بڑھی نے دیکھ لیا تو بتا دوں گی کہ بیمار ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی کیونکہ وہاں کا اجازت نامہ تو حاصل تھا۔

میں نے منہ دھویا، چادر لپیٹی آنکھوں میں سرمہ ڈالا سرمے سے بھوری آنکھیں اور نمایاں ہو گئیں۔

کلینک میں زیادہ رش نہ تھا۔ بہت کم لوگ تھے اس سے پہلے میں سلیم کے ساتھ ایک مرتبہ بخار کی دوا لینے آ چکی تھی۔ کمپوڈر بہانے بہانے سے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جب دیکھتا میں مسکرا دیتی۔ اپنی باری پر میں ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ دوا کی پرچی باہر آ کر کمپوڈر کو پکڑا دی۔ دوا دیتے ہوئے ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں اس میں ہم نے اگلی ملاقات طے کر لی۔

اس کا نام اشرف تھا۔ اشرف دوپہر کے وقت کھڑکی میں آ جاتا اور ہم پہروں باتیں کرتے۔ دوپہر سنسان ہوتی‘ بڑھیا بھی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گھر کے اندر چلی جاتی۔ کئی دن گزر گئے۔ اس دوران سلیم بھی آیا اور دو دن رہ کر واپس فیصل آباد چلا گیا۔

یہ دو دن بڑے بھاری گزرے۔ یہی خوف رہا کہ سلیم، اشرف کے بارے میں نہ جان جائے۔ اشرف کو میں بتا چکی تھی کہ جتنے دن کھڑکی بند دیکھے، واپس چلے جانا۔ سلیم کے آنے سے ایک دن پہلے ہی میں نے کھڑکی اچھی طرح بند کر دی تھی۔ میری پلاننگ بہت عمدہ تھی۔ سلیم کو ذرا شک نہ ہوا، سلیم بڑی بی سے مل کر بھی مطمئن ہو چکا تھا۔ اسی لیے شرافت سے دو دن گزار کر واپس چلا گیا مگر کہہ گیا کہ سامان باندھ کر رکھنا، اگلے مہینے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ سلیم کے جاتے ہی میں نے کھڑکی کھول لی۔

☆......☆......☆

اشرف سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اب اشرف کے تقاضے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ اب گھر کے اندر آنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے بار بار کہنے پر میں نے اسے موقع دیکھ کر ایک روز گھر میں بلا لیا۔ پھر کیا تھا اکیلے جوان مرد اور عورت کے بیچ شیطان کو آتے دیر کتنی لگتی ہے۔ اشرف اب روز گھر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

شیر کے منہ خون لگ چکا تھا۔ اسے روکنا اب مشکل تھا۔

اپنی دانست میں میری طرف سے یہ سب سلیم کے لیے سزا تھی۔ میں سلیم سے انتقام لے رہی تھی۔ اشرف سے روز روز کی ملاقاتیں رنگ لائیں، میں حاملہ ہو گئی۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کھوٹ مجھ میں نہیں سلیم میں ہے۔ آٹھ سال بنجر ہونے کا طعنہ برداشت کرتی آئی۔ دل میں تیزی سے یہ خواہش ابھری کہ سلیم کا گریبان پکڑ کر اسے بانجھ ہونے کا طعنہ دوں مگر اس کا انجام سوچ کر جھرجھری آ گئی۔ میں نے اشرف کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی کہ میں اگلے مہینے سلیم کے ساتھ فیصل آباد جا رہی ہوں، رہی سامان باندھنے کی بات تو سامان ہی کیا تھا...... چند جوڑے میں بیگ میں ٹھونس چکی تھی۔

☆......☆......☆

مہینے کا آخر قریب آیا تو میں نے کھڑکی بند کر دی۔ دو دن ہی گزرے تھے کہ سلیم کی آمد ہو گئی۔ میں نے سلیم کو یہ نہ بتایا کہ میں حاملہ ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے اتنی دور کا سفر کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ میں اگر یہاں رکتی تو اشرف بھی باخبر ہو جاتا۔ میں یہ بچہ کسی طور کھونا نہیں چاہتی تھی۔ سلیم دو روز رکا‘ تیسرے دن ہم مکان میں تالا ڈال کر فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہاں سلیم نے کرائے کا گھر لیا ہوا تھا۔ میں نے یہاں آ کر سلیم کو اپنی خرابی طبیعت کا بتایا۔ سلیم مجھے قریبی ڈاکٹر کے لے گیا۔ ڈاکٹر نے میرے حاملہ ہونے کی تصدیق کر دی۔

اس خبر نے سلیم کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھنے لگا۔ ہر شام کام سے آ کر مجھے کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاتا۔

وقت پورا ہوا اور میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بچے کی شکل وصورت اشرف اور مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ سلیم بچہ پا کر بہت خوش تھا۔ وہ پرائی اولاد کو دل وجان سے چاہتا تھا۔ وہ جب بھی بچے کو گود میں لے کر پیار کرتا، سینے سے لگاتا تو میرے دل میں طمانیت سی اتر جاتی۔ میں دل میں سوچتی سلیم صاحب یہ ہے عورت کا انتقام، جس سے آپ بے خبر ہو کر ساری زندگی خود کو آزاد نہ کرا سکیں گے۔ اب اس نئی کھڑکی کو میں قطعی بند نہ کر سکتی تھی۔

☆☆......☆☆......☆☆

کارنامہ



شعبان کھوسہ



مغرب سے بھڑکتا ایک شعلہ، جس کی آنچ مشرق کے ہر گھر میں محسوس کی جائے گی

نااہلیت کے بھی درجات ہوتے ہیں کچھ لوگ نا اہل ہوتے ہیں مگر انہیں اپنے آپ...... کو اہل ثابت کرنے پر ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ کچھ باصلاحیت افراد زمانے کی ناقدر شناسی کے باعث نااہل قرار پاتے ہیں۔ مگر جہاں تک میری اہلیت کا تعلق ہے تو درحقیقت میرا تعلق نہ پہلی قسم سے تھا اور نہ دوسری قسم سے۔ میں ذہنی طور پر قلاش ایک ایسی احمق لڑکی تھی جسے بنے بنائے کام کو بگاڑنا ہی آتا تھا۔ اگر میں اچھے

بھلے خوشگوار دن کا آغاز ناشتے میں توس جلا کر کرتی تو شام اس طرح ہوتی کہ ٹائم پیس میں ضرورت سے زیادہ چابی بھر دینے کے باعث اس کی کمانی جھٹ سے ٹوٹ جاتی اور میں اس کی مرمت کرنے کے خیال سے چھوٹے بڑے سارے پرزے نکال کر باہر ڈال دیتی۔

یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ میں اپنی اہلیت سے نالاں اور پریشان تھی۔ نالاں اور پریشان کہنے سے اس خراب حالات کی ترجمانی نہیں کر سکتی جو مجھ پر طاری تھی۔ صبح سے شام تک میں کام بگاڑتی اور اس تصور سے کانپا کرتی کہ ہاورڈ مجھ جیسی لڑکی کو کہاں تک برداشت کرے گا۔ یہ بات بھی ناقابلِ فہم تھی کہ وہ اپنی اس ناکارہ اور فضول بیوی سے محبت کیوں کرتا ہے جس کے ہر کام میں بھونڈا پن ہے۔ پھوہڑ پنا ہے۔ ہر یہ بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ یقیناً ایک نہ ایک دن قوتِ برداشت جواب دے جائے گی اور تب اس کی ساری محبت، اتنی شدید ترین نفرت میں تبدیل ہو جائے گی اور اسے میرا نام تک ناگوار گزرنے لگے گا۔

ایک بار جب وہ کسی کاروباری کام سے شہر کے باہر گیا ہوا تھا۔ میں دو دن اور ایک رات تک سردی سے ٹھٹھرتی اور تاریکی سے لرزتی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے بجلی کا فیوز لگانا نہیں آتا تھا۔ ہاورڈ واپس آیا تو میں ہسٹریائی انداز میں روتی چیختی ہوئی اس کے بازوؤں سے لپٹ گئی۔

"بس بس ایملی! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں گھر آ گیا ہوں۔"

اس نے بڑے پیار سے مجھے تھپکتے ہوئے کہا اور اس وقت تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھا۔ جب تک میری طبیعت بحال نہیں ہو گی۔ لیکن جب کپڑے خشک کرنے والی مشین میں آگ لگی کیونکہ میں اس کے لنٹ اسکرین کو صاف کرنا بھول گئی تھی۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ میں محض احمق ہی نہیں بلکہ خطرناک طور پر پاگل ہوں۔ ضروری تھا کہ میں فائر ڈیپارٹمنٹ کو فون کرتی لیکن مجھے وہاں کا نمبر معلوم نہیں تھا اور ٹیلی فون نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی تھی۔ میں نے یہ بھی فراموش کر دیا کہ ایسی صورت میں آپریٹر کو فون کیا جا سکتا ہے چنانچہ میں نے ہاورڈ کے دفتر میں فون کیا اور جب وہ فون پر آیا تو میں نے رو رو کر اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔ فائر مین اور خود ہاورڈ کے آنے سے پہلے پہلے پوری دیوار سیاہ پڑ چکی تھی۔ خوش قسمتی سے آگ پر بہت جلد ہی قابو پا لیا گیا اور جو کچھ نقصان ہوا۔ وہ میری توقع سے بہت کم تھا۔

"اگر تمہاری بیوی" فائر مین نے ہاورڈ سے کہا۔ "صرف پلگ نکال لیتی تو نہ مشین بیکار ہوتی اور نہ دیوار جلتی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تو سبھی کو معلوم ہوتی ہیں۔"

"ہاں"

ہاورڈ نے جواب دیا۔ "مگر ہو سکتا ہے کہ دھواں دیکھ کر اس کا دھیان پلگ کی طرف نہ گیا ہو۔ اگر عورتوں سے ایسی بدحواسیاں نہ ہوں تو ان میں اور ہم میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔"

فائر مین نے سنجیدگی سے سر ہلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتیں واقعی بدحواس ہوتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی یاد نہیں رکھ سکتیں۔ وہ دونوں میرے بارے میں اس طرح گفتگو کر رہے تھے جیسے میری موجودگی سے بے خبر ہوں مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں ہمیشہ سے تو ایسی کبھی نہیں تھی۔ میرا لڑکپن اچھی بھلی حالت میں گزرا۔ ہائی سکول میں، میں نے ہمیشہ لڑکوں سے زیادہ نمبر لیے۔ مقابلوں میں کسی لڑکے کی مجال نہ تھی کہ وہ مجھ سے بازی لے جاتا پھر یہ اچانک شادی کے بعد مجھے کیا ہو گیا تھا۔ روز بروز میری حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر مجھ پر مزید گھبراہٹ سوار ہو جاتی تھی کہ اگر کسی روز کوئی حرکت ہاورڈ کو ناگوار نہ گزری تو؟

تو اسی روز وہ مجھے گھر سے نکال باہر کرے گا۔ لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے' اسے مجھ سے بہتر بیوی مل جائے گی مگر میں کیا کروں؟ میں تو ہاورڈ پر اتنی منحصر ہو کر رہ گئی تھی کہ تھوڑا عرصہ بھی اس کی پناہ کے بغیر نہیں گزار سکتی تھی۔ مسئلہ غیر معمولی سنجیدگی کا حامل تھا اور میرے سامنے اس کا ایک ہی حل تھا کہ جب بھی موقع ملے اپنی حماقتوں پر جی بھر کے رو لیا کروں اور دعا کیا

کروں کہ ہاورڈ کی محبت کا سائبان ہمیشہ میرے اوپر سایہ کیے رہے۔ فائرمین کے جانے کے بعد ہاورڈ تقریباً نصف گھنٹے تک مجھے پیار کرتا رہا۔ اس نے میرے آنسو خشک کیے۔ کپڑے بدلنے میں میری مدد کی اور خصوصی برتاؤ کے طور پر مجھے ایک قیمتی ریستوران میں ڈنر کھلانے کے لیے لے گیا۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ مجھ سے بڑی نرمی اور بے حد محبت کا سلوک کیا کرتا تھا اور اس کے اسی طرزِ عمل نے مجھے مکمل طور پر مغلوب کر رکھا تھا۔ اس روز بھی ریستوران میں اس کی آنکھیں اس وقت تک چمکتی رہیں جب تک میں نے کھانے کے بعد بیئر کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے نصف سے زیادہ بیئر اس کے قیمتی سوٹ پر نہ چھلکا دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کی چمک غائب ہوئی اور چہرے سے ناگواری کا احساس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگا۔

''کوئی بات نہیں ہے ایملی ڈارلنگ۔''

اس نے پیار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

مجھ سے مسلسل حماقتیں سرزد ہوتی ہیں اور وہ مسلسل مسکرا مسکرا کر میری حماقتوں کو نہ صرف نظرانداز کرتا رہا بلکہ میرے اس احساس کو بھی پختہ کرتا رہا کہ اس کے بغیر میری زندگی نامرادی اور ناکامی کا مرقع بن کر رہ جائے گی۔ پھر ایک روز اس نے بتایا کہ اسے سالانہ کاروباری میٹنگ میں شرکت کے لیے نیویارک جانا ہے۔ تنہائی کے احساس نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزا دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے پیروں تلے کی زمین نکلنے والی ہے۔ میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ہاورڈ کے ساتھ گزارنے لگی۔ پچھلے چند دن سے ہاورڈ میرے کمرے کو گرم رکھنے کے لیے آتشدان بنا رہا تھا۔ میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی اور اسے اینٹوں اور سیمنٹ سے کھیلتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ ہاں اس کے لیے ایک قسم کا کھیل ہی تھا۔ مشکل سے مشکل کام بھی اس کے ہاتھوں میں پہنچ کر آسان ہو جاتا تھا میں دل کی گہرائیوں سے ہاورڈ کو پوجتی تھی۔ کتنا عظیم انسان تھا وہ۔ چند ہی دنوں بعد اس نے مجھے الوداعی پیار کیا۔ میرے کندھے کو تھپ تھپا کر کہا۔

''میں ایک ہفتے کے اندر اندر واپس آ جاؤں گا۔ ڈیئر!''

اور پیار سے میرے بالوں کو بکھیرتا ہوا چلا گیا۔

میں ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح کرسی پر گر گئی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہاورڈ کے تحفظ کے بغیر ساری دنیا میرے خلاف اُٹھ کھڑی ہو گی اور میرا جینا دوبھر کر دے گی۔ پہلے دو دن قدرے سکون سے گزرے غالباً اس وجہ سے کہ میں نے خوف و دہشت کے باعث گھر سے باہر جھانک کر دیکھنا بھی پسند نہیں کیا مگر تیسرے دن پوری الماری خالی ہو گئی۔ کھانے کو کچھ بھی نہ رہا۔ میں نے مجبوراً کار نکالی اور سپر مارکیٹ سے ضروری سودا سلف لانے کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں اچانک کار کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہونٹ کاٹتے ہوئے کار کو فٹ پاتھ کے ایک حصے پر کھڑا کیا اور سوچنے لگی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہاں ایک رہائشی علاقہ تھا اور میں جانتی تھی کہ قریبی سروس اسٹیشن وہاں سے تقریباً چھ بلاک کے فاصلے پر ہے۔ کیا مجھے پیدل چلنا چاہیے؟ میں نے سوچا مگر اس وقت کیا ہوگا جب میں وہاں اتنا طویل فاصلہ طے کر کے پہنچوں گی اور سروس اسٹیشن والے معذرت چاہتے ہوئے کہہ دیں گے کہ کوئی آدمی خالی نہیں ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ بہتر ہوگا کہ کسی کے ہاں سے سروس اسٹیشن پر فون کر دیا جائے لیکن کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ مجھ جیسی اجنبی لڑکی کو اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دے؟ اور اگر اجازت مل جائے تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سروس اسٹیشن سے کوئی شخص ٹائر بدلنے کے لیے دوڑا چلا آئے گا۔ ان لوگوں کو ہزار کام ہوتے ہیں۔

میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا اگر میں پڑوس کے کسی شخص کو معقول معاوضے کی پیش کش کروں تو شاید وہ ٹائر بدلنے پر آمادہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں معقول معاوضہ کتنا ہونا چاہیے۔ پانچ ڈالر یا دس ڈالر؟ شاید دس ڈالر سے کم پر کوئی شخص راضی نہ ہو لیکن دس ڈالر دینے کے بعد میرے پاس کل اتنی رقم بچے گی۔ جس میں بمشکل ایک وقت کھانا کھایا جا سکے گا۔

بیز اور کوئی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ کاش ہاورڈ نیویارک نہ گیا ہوتا۔ مجھے اس کی کتنی شدید حاجت تھی۔ معاً میری پشت سے کسی عورت کی آواز آئی؟

"شاید تم کسی پریشانی کا شکار ہو لڑکی؟"

میں نے جلدی سے گھوم کر کہا "بیشک بیشک کیا تمہارے شوہر گھر میں ہیں۔"

"نہیں۔" وہ بولی "تاہم ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ خدمت کر سکوں۔"

"شکریہ!" میں نے کہا۔ "مگر مجھے ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو میری کار کا ٹائر تبدیل کر سکے۔"

وہ مسکرائی "یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ذرا جیک تو نکالو۔" میں نے جیک نکالا۔ اب ان پہیوں کے نیچے کچھ پتھر رکھ دو۔ شاباش بس جیسے جیسے ہی ہدایات دوں تم ان پر عمل کرتی رہو۔ ڈرو نہیں ایسا کون سا کام ہے جو عورت نہیں کر سکتی۔ سب سے پہلے ہب کیپ ہٹاؤ۔ اب اس رینچ سے نٹ ڈھیلے کر دو۔" میں ایک مسحور شخص کی طرح اس کی ہدایات چون وچرا کے بغیر مانتی رہی۔ تھوڑی سی دیر محنت تو ضرور کرنا پڑی مگر ٹائر بدل گیا۔

"دیکھا تم نے کتنا آسان کام کیا ہے؟" اس عورت نے مسکرا کر کہا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں حیرت اور خوشی سے اتنی مبہوت ہو گئی تھی کہ اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک شکریہ ادا کرتی رہی۔ پھر خاک و دھول میں اٹی ہنستی ہوئی سپر مارکیٹ گئی اور ضروری اشیاء خرید لائی۔ دن کا باقی حصہ میں نے بڑے جوش وخروش سے گزارا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی نیا جنم لیا ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ سے کسی کام میں کبھی گڑبڑ نہیں ہوئی ہے۔ میں نے ویکیوم کلینر کو آپریٹ کیا۔ واشنگ مشین میں کپڑے دھوئے۔ ڈرائر میں کپڑوں کو خشک کیا۔ اپنے لیے کھانا تیار کیا اور کسی دوسرے چھوٹے موٹے کام انجام دیئے کوئی غلطی نہیں، کوئی بدحواسی نہیں۔ شام سرد تھی اور میں گٹھڑی بنی ہوئی بستر میں پڑی تھی مجھے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ کاش نیویارک جانے سے پہلے ہاورڈ آتشدان کا کام مکمل کر دیتا۔ میں نہیں جانتی وہ کون سی قوت تھی جس نے ایکا ایکی مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اتنا سا کام تو میں بھی انجام دے سکتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ٹائر بدلنے والے واقعہ نے مجھے اعتماد دیا تھا۔ میں میرے یقین کو بحال کر دیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں ہٹائی جارہی تھیں۔ صرف چند درجن نئی اینٹیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں خالی جگہ میں جما کر آتشدان مکمل کرنا تھا۔ میں ہاورڈ کو کام کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اینٹوں کو کس طرح جمایا جاتا ہے۔ بڑی احتیاط سے میں نے گارا تیار کیا۔ ایک حصہ سیمنٹ، تین حصے ریت اور چار حصے عزم اور آتشدان تیار کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ میں نے بہت ہچکچاتے ہوئے کام کا آغاز کیا تھا لیکن چند اینٹیں جمانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ آسان کام تو ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دس دن قبل ایک برف والے کیک کی تہیں چڑھاتے ہوئے مجھے جتنی پریشانی ہوئی تھی۔ اینٹیں جمانے کا کام اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا حالانکہ دونوں کا اصول ایک ہی تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو محض اتنا کہ اینٹیں مجھ سے تعاون کر رہی تھیں جبکہ برف والے کیک نے عدم تعاون پر کمر باندھ رکھی تھی۔ کام کی تکمیل کے بعد میں نے فخریہ طور پر تسلیم کر لیا کہ میرا کارنامہ دیکھنے میں برا نہیں ہے۔

پھول ہی پھول کھلے ہیں مرے گلزاروں میں۔

گنگناتے ہوئے میں اٹھی غسل کیا، گرم گرم کوفی تیار کی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی بستر پر چلی گئی۔ مجھے برسوں بعد اتنی روحانی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ہاورڈ مجھ پر فخر کیا کرے گا۔ اس کی محبت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گی۔

چند روز بعد جب ہاورڈ واپس آیا تو میں دروازے ہی پر انتہائی خوشی کے ساتھ اس سے

لپٹ گئی۔

''ارے ڈیئر! تم تو بڑی عظیم نظر آ رہی ہو۔'' اس نے مجھے اپنی بانہوں میں چھپالیا۔

''معلوم ہوتا ہے میری غیر موجودگی میں رات دن سوتی ہی رہی ہو۔''

''نہیں نہیں یہ بات نہیں۔''

میں نے پراسرار انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''حقیقت میں میں بہت ہی زیادہ مصروف رہی۔''

لیکن میں زیادہ عرصے تک سسپنس برقرار نہ رکھ سکی اور ایک چھوٹے سے بے چین بچے کی طرح اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ مکمل آتشدان کو دیکھ کر ہاورڈ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا،

''ایملی'' اس نے کہا۔

''خواہ مخواہ مزدوروں کو بلا کر رقم ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سارا کام میں نے انجام دیا ہے۔''

وہ ہنس پڑا۔

''بہانے بازی چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کتنی رقم خرچ ہوئی۔''

''سچ مچ ہاورڈ، کام میں نے ہی کیا ہے اور یہی نہیں میں نے کار کا ٹائر بھی بدلا ہے اور گیس کے سارے چولہوں کو کھول کر ان کی صفائی بھی کی ہے۔'' میں چڑیا کی طرح چہچہا کر بولی۔

''ناممکن ہے تم کبھی کوئی کام درست نہیں کر سکتیں۔'' اس نے کہا وہ اب بھی مضحکہ خیز انداز میں ہنس رہا تھا۔ معاً اس کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں میری آنکھوں میں خدا جانے اسے ایسی کیا چیز نظر آئی کہ اس کا منہ لٹک گیا۔ بادل ناخواستہ اس نے میری بات تسلیم کرلی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری محبت ساری ہمدردی کافور ہوگئی وہ نفرت بھرے انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

تم۔تم احمق۔ احمق اور بیوقوف لڑکی۔۔۔ تم کچھ نہیں کرسکتیں۔'' اس کی آواز میں حقارت چھپی تھی۔

چہرے سے یہ محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی کوئی بہت ہی قیمتی شے کھوگئی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اب سب کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کی حکومت کھوگئی تھی۔ برتری دم توڑ گئی تھی۔ وہ انا ضائع ہوگئی تھی جس کے بل بوتے پر اس نے مجھے بالکل بے قابو اور بالکل بے دست و پا کر رکھا تھا۔ میں اس دست نگر نہیں رہی تھی۔ یہ وہ ہاورڈ تھا جو اپنی جھوٹی محبت سے میری صلاحیتوں کو ہڑپ کر گیا تھا۔ جو دل سے چاہتا تھا کہ میں ہمیشہ اس کی باندی بنی رہوں اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مجھے انتہائی نااہل اور ناکارہ ثابت کرے۔ اس ظالم نے مجھے میری اپنی نظروں میں گرا دیا تھا۔ میری حماقتوں اور بدحواسیوں کی ساری ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھی اور وہ پیار کا اظہار کرتے ہوئے خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ میری کمزوری اسے طاقتور بناتی تھی۔ میری بیچارگی نے اسے عظمت عطا کی تھی۔ مجھے کچل کر اسے تسکین حاصل ہوتی تھی۔

وہ میرا خوبصورت کارنامہ دیکھنے کے لیے جھکا۔

''بدھو ہو ایملی تم بالکل بدھو ہو ہمیشہ بدھو ہی رہو گی۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ آتشدان کیسے......'' میں نے قریب پڑا ہوا پھاؤڑا اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کیا ''تم نے کبھی مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ فیوز کس طرح لگانا چاہیے۔'' اور اس روز رات گئے تک ''میں عورت سب سے برتر ہوں مجھے کیا نہیں آتا؟'' گنگناتے ہوئے میں نے اینٹوں اور گارے کا کام جاری رکھا میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب راتوں کو بیرونی مصروفیات کے باعث مجھے آتشدان کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چنانچہ میں بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اس میں اینٹیں چن کر اسے بند کرنے میں مصروف رہی۔ میں نے یہ کارنامہ بھی انتہائی خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا اور حقیقت میں اس طرح میرے اس کارنامے نے میری اور ہاورڈ کی رشتے داری پر خوب پکا اور کبھی نہ اکھڑنے والا سیمنٹ پھیر دیا۔

☆☆......☆☆

تیسرا شعلہ

ندامت

مریم مہربان ملک

حسن کے نشے میں چُور اُس حسینہ کا قصہ عبرت جو آج بھی اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے

میں فقط زندگی کو زندہ لاش کی طرح جی رہی ہوں۔ زندگی کے کورے کاغذ پر محبت کے رنگ بکھرے تھے۔ وہاں پر میں نے نفرتوں کی تصویر بنائی۔ میں نے خود ہی اپنی قسمت پر کالی سیاہی کے چھینٹے پھینک دیے، کسی مظلوم کی آہ اور بددعا نے مجھے آسمان سے زمین پر لا پھینکا اور میں بربادیوں کی پاتال میں گرتی چلی گئی۔ بے پناہ دولت، بے انتہا حسن، ماں باپ کے لاڈ پیار نے غرور وتکبر کی اعلیٰ صف میں لاکھڑا کیا۔ جہاں مجھے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہتے ہیں غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ ہاں میں غرور وتکبر کی سزا پا رہی ہوں۔ میں کبھی اپنے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔

آج میں ایک چھوٹے سے بدبودار کمرے میں اپنی پھیلائی گندگی پر بیٹھی سڑ رہی ہوں۔ مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں کہ دو گھونٹ پانی ہی پی لوں کہ گلا خشک ہونے کی وجہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی، آواز جیسے گلے میں چپک سی گئی ہو۔

اور نہ جانے کب تک اپنی بنائی جنہم میں جلتی رہوں گی۔

ثریا او ثریا! بیٹا جلدی کر ٹائم دیکھ وہاں مہندی کی ڈھولک بھی بج کے رک گئی۔ ادھر تیری تیاری ہی ختم نہیں ہوئی۔'' امی مجھے مسلسل آوازیں دے رہی تھیں۔ اور میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا حسن سنوار رہی تھی۔ امی کی آوازوں سے تنگ آ کر میں بولی۔

'' ارے اماں تیری بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔ ٹکڑا تیاری نہ بھی کرے تب بھی بے بہا خوب صورت ہے۔'' اُف میرا یہ حسن میں انگڑائی لیتی ہوئی بولی۔ بڑی شان وار اداؤں سے بال لہراتی ہوئی میں اماں کے ساتھ چلنے لگی۔ اماں نے بڑی تیزی سے رک کر کہا۔'' ایسے ننگے سر کہاں چلی۔ پگلی جا جا کر چادر لے کر آ۔'' اماں ڈانٹتی ہوئی بولی مگر اس کے برعکس میں کسی کی سنتی کب تھی۔

خدا نے حسن تو دیا ہی تھا ساتھ مجھ میں نزاکت کی بھی فراوانی تھی۔ اور میں مست ہرنی کی طرح لہرا لہرا کے چل رہی تھی۔ ادھر شادی والے گھر میں خوب رونق تھی اور میں شادی والے گھر میں اترا اترا کے چل رہی تھی۔ شادی میں عام سی نین نقوش والی لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے اپنے حسن پر ناز ہو رہا تھا۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر میں خوب ہنسنے لگی اور بلند آواز میں اماں کو آواز دینے لگی۔



اس نے سرسری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور ناک سکیڑ کر بولی۔ "اے لو... میں کہاں آ گئی۔ دلہن ایسے سوٹ میں؟ ..."

اوماں۔ چل مجھے گھر چھوڑ آ یہ کہاں لے آئی ہے تُو مجھے۔ کالی کلوٹی لنگڑی لولی عورتوں کے درمیان میرا کیا کام۔"

پاس ہی چارپائی پر ایک معذور جواں لڑکی بیٹھی تھی۔ نہایت ہی ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"نالڑکی خدا کا خوف کر۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ یہ مصیبت تجھ پر بھی آ سکتی ہے۔"

اور میں گاؤں کی اس معذور لڑکی کا مذاق اڑاتی ہوئی بولی۔ "چل جا بھلا رب خدا میرا کچھ بگاڑے گا۔ دیکھ ذرا میں کتنی سوہنی ہوں۔" ڈھولک کی تھاپ پر دلہن کے ہاتھوں میں مہندی رچنے لگی میں آذر کی یادوں میں گم ہوگئی۔

آذر اور میں دونوں خالہ زاد کزن تھے اور بچپن سے ہی ہم ایک دوسرے کے نام سے منسوب تھے۔ اگر مجھے کسی سے محبت تھی تو صرف آذر سے ہی تھی۔

ہم بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے ایک ساتھ ہی پڑھے میں آذر کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ فردوس میری اماں اور آفرین آذر کی ماں دونوں بہنوں میں بھی بے انتہا پیار تھا۔ میری اور آذر کی محبت نے اس چاہت کو اور بھی گہرا بنا دیا۔

بارات والے دن میں نے اپنی چوائس پر گرین رنگ کا سوٹ پہنا، سوٹ میں بڑی نفاست سے میں آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی۔ بارات آ چکی تھی۔ تمام مہمانوں کی نظر مجھ پر اور آذر پر تھی۔ ہم دونوں کی جوڑی دیکھ کر ہماری محبت کو داد دے رہے تھے۔ لوگوں کی تعریفیں سن کر میرے غرور کو اور ہوا ملی۔

میں باراتیوں کو ویلکم کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں ایک معذور عورت جو سانولے رنگ کی تھی۔ اس کا نام چاندنی تھا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میں نے حقارت بھری نظر اس پر ڈالی اور بولی۔

"او باجی چل پرے ہٹ۔ تیرا نام تو کسی نے غلطی سے چاندنی رکھ دیا ہے پر تو کالی اندھیری لگ رہی ہے۔" پاس ہی نازک سے بچی اماں، اماں کہتی ہوئی اس عورت کے گلے لگ گئی۔ میں زور سے ہنسنے لگی۔اور زور سے بولی۔

ارے واہ۔ اولاد بھی کالی۔" چاندنی نے قدرے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"لڑکی یہ تو خدا کے کام ہیں ۔ خدا کے کاموں میں دخل اندازی نہ کر، خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہی کسی دن چل گئی تو، تو کہیں کی نہیں رہے گی۔"

شادی کے جھنجھٹ ختم ہو چکے تھے۔ اور میں واپس گھر آ گئی۔ گھر واپس آ کر اپنی روٹین میں آ گئی۔

سارا دن آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا حسن سنوارتی رہتی۔ اور آئینے کے سامنے بیٹھی بہت سی باتیں کرتی۔ خود ہی اپنی تعریف کرتی اور خود کو داد دیتی۔ میں صبح کو ناشتا کر رہی تھی۔ دروازے پر ایک فقیر نے صدا لگائی۔

"اللہ کے واسطے روٹی دے بابا بھوکا ہوں کئی دنوں سے۔"

میں غصے سے ناشتے سے اٹھی۔ اور دروازے پر کھڑے فقیر کو اچھی خاصی سنادی۔

"اوہ تم۔" فقیر نے یہ سن کر بلند آواز میں بددعا۔ "جا تو بھی اس کاروبار کا حصہ بنے۔" فقیر مجھے بددعا دیتے جانے لگا تو میں فقیر پر چیختے ہوئے کہنے لگی۔

مجھے کچھ نہیں ہو سکتا تم جیسوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔ ایک چھوڑ کے دس بددعائیں دے میری جوتی کو۔" یہ کہتی ہوئی میں شیرنی کی طرح غراتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔

20 فروری کا شام میں بھری اداؤں کے ساتھ حسن برساتی آذر کے گھر آ گئی۔ دلہن بنی کمرے میں بن سنور کر بیٹھی تھی آسمان کے ستارے جیسے زمین پر آ گئے تھے۔ آذر نے دروازہ کھولا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے میری دھڑکنیں بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

آذر نے میری ٹھوڑی پکڑ کر میرا سر اوپر کیا میں شرما گئی۔

"ثریا آج تو تم دلہن بنی چودھویں کا چاند لگ رہی ہو۔ جیسے سارے حوروں کا حسن تم پر آ گیا۔" آذر کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ آذر نے مجھے بانہوں میں بھر لیا۔ مجازی خدا کی بانہوں میں آ کر میں خود بیگانہ سی ہو گئی۔

آذر فروٹ کا کاروبار کرتا تھا اور ساتھ ہی ان کے ذاتی ڈیری فارم بھی تھے۔ کافی خوشحال گھرانہ تھا۔ آذر کے گھر میں، میں ملکہ بنی پھرتی تھی۔ نوکروں پر خوب رعب جماتی، گھر کا کام صحیح نہ کرنے پر خوب انھیں بے عزت کرتی، ہماری شادی کو پانچ سال ہونے کو تھے۔ مگر میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی کوئی امید بر نہیں آئی۔ آذر کاروبار کی وجہ سے کم ہی ٹائم نکال پاتے تھے۔ گھر کے نوکر میرے پاس آنے سے کتراتے تھے۔ آہستہ آہستہ میں تنہائی اور مایوسی کا شکار ہونے لگی۔ آذر کو کئی دفعہ کہا میرے لیے وقت نکالو میں گھر میں اکیلی بیٹھی بور ہوتی ہوں۔" آذر نے بیزاری سے ڈانٹ کر کہا۔

کیا تمھیں اپنے سر پر بٹھا کر گھماتا پھروں، لاکھوں کام کرنے ہوتے ہیں۔ تمھیں سنبھالوں یا کہ کاروبار کو۔"

آذر کی باتیں تیر کی طرح دل میں پیوستہ ہو گئی اور دیر تک اپنی قسمت پر روتی رہی۔

میں پچھلے کئی گھنٹوں سے آذر کا انتظار کر رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آذر دیر سے سہی پر ضرور آ جاتا تھا۔ پر آج اتنا لیٹ...... اللہ خیر کرے میرے دل میں وسوسے اٹھنے لگے کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

"آپ مسز آذر ہیں۔"

"جی میں مسز آذر بول رہی ہوں۔" میں نیشنل ہسپتال سے ڈاکٹر خرم بول رہا ہوں۔ آپ کے شوہر کو گولیاں لگی ہیں اور ان کی لاش ہسپتال میں ہے۔ آپ ضروری کارروائی کے بعد لاش لے جاسکتی ہیں۔" فون ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں گرتی پڑتی ہسپتال پہنچی تو آذر آنکھیں بند کیے ہوئے سوئے تھے۔ ڈاکو آذر کو گھر آتے ہوئے گولی مار کر ہلاک کر کے، گاڑی اور نقدی چھین کر لے گئے اور میری دنیا ہی اجاڑ دی۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش میرے حوالے کی۔ آذر تو شہر خموشاں چلے گئے مگر مجھے دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ آذر کے جاتے ہی ان کے بھائیوں نے اپنی اصلیت دکھانا شروع کر دی۔

سب سے پہلے دیوروں نے مجھے گھر سے بے دخل کیا۔ ماں باپ پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا اور میں سڑک پر آ گئی۔ کئی دنوں تک فاقوں میں رہنے کے بعد جب سخت بھوک لگی تو بھیک مانگنے پر مجبور ہوئی۔ پیٹ کے دوزخ کی آگ بجھانے کے لیے کئی سالوں تک بھیک مانگتی رہی۔ بھوک پیاس، سارا دن سڑک پر پڑا رہنے کی وجہ سے چہرے پر گرد مٹی کی ایک تہہ سی جم گئی۔ کبھی جو مجھے اپنے حسن پر ناز ہوا کرتا تھا۔ وہ حسن باقی نہیں رہا۔ ایک سرد شام میں سردی اور بھوک سے تنگ آ کر میں نے ایک گھر کی چوکھٹ پر دستک دی۔ ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا اور مجھے دروازے پر ہاتھ پھیلائے دیکھا تو مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا شرم نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئی۔ منہ اٹھا کر بھیک مانگنے چلی آتی ہو۔ اچھا کاروبار کھولا ہوا۔ بھیک مانگنے کے بہانے گھر میں تاک جھانک کرتی ہو اور بعد میں اپنے عاشقوں کو بلا کر گھر کا صفایا کرتی ہو۔ چلو نکلو یہاں سے کوئی خیرات نہیں ہے۔ داتا دربار سمجھ رکھا ہے۔" لڑکی سے یہ سن کر مجھے اپنا ماضی یاد آ گیا۔

اسی طرح میں نے ایک فقیر کو اپنے گھر سے بے عزت کر کے دھتکارا تھا آج وہی سب کچھ میرے سامنے آ رہا تھا۔ آج اُسی فقیر بابا کی بددعا سے میں اِسی کاروبار کا حصہ بن گئی تھی۔

ان کی بددعاؤں سے دردر کی ٹھوکریں میرے نصیب میں لکھ دی گئی ہیں۔ کبھی بھی کسی کو حقیر یا کم تر نہ جانو کہ بادشاہ کو فقیر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ جب خدا ۔۔۔ پڑتا ہے تو دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

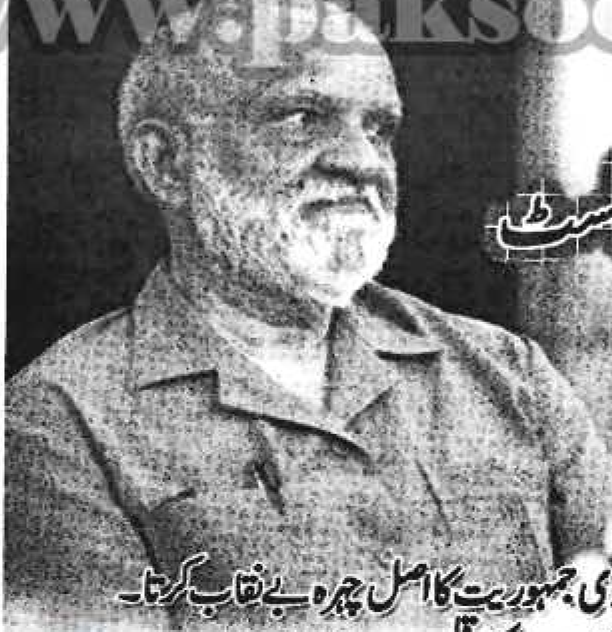
☆☆☆

ایک دن فٹ پاتھ پر بیٹھی بھیگ مانگ رہی تھی کہ کچھ آوارہ لڑکوں نے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے مجھے ٹکر ماردی گاڑی کی زوردار ٹکر سے میں دور جا گری میں شدید زخمی حالت میں سڑک پر پڑی رہی۔ کسی خدا ترس رکشے والا خدا کا خوف کرتے ہوئے خیراتی ہسپتال کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ کئی دنوں تک خیراتی ہسپتال میں پڑی رہی تو ٹھیک ہونے کے بعد دوبارہ سڑک پر آ گئی۔ کئی دنوں فاقہ کشی کے بعد میں کافی کمزور ہو گئی تھی چلنے پھرنے سے رہ گئی تھی کہ قریبی رشتے داروں نے سڑک پر بھیگ مانگتے ہوئے دیکھ لیا، تو وہ سڑک سے اٹھا کر اپنے گھر لے آئے اور مجھے اپنے گھر کے ایک سائیڈ روم میں ایک چھوٹا سا کمرہ دے دیا۔

کچھ دن تک تو وہ روٹی کھلاتے رہے لیکن آخر کب تک۔ آہستہ آہستہ آخر وہ بھی مجھے بھول گئے اور میں اب ایک بے یار و مددگار زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔

اپنے کیے پر نادم ہوں کہ میں غرور و تکبر میں آ کر یہ بھول گئی تھی کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ اللہ سے رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں کہ یا اللہ مجھے جلد اپنے پاس بلا لے مجھ میں زیادہ دکھ سہنے کی طاقت نہیں اور میں اپنے کیے کی سزا پا رہی ہوں۔

☆☆☆



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامۂ بھارت

نواں حصہ

بلراج ساہنی آج کل فلموں میں اداکاری بہت کم کر رہے ہیں۔ کتابیں لکھ رہے ہیں۔ ایک کتاب ہندی میں "یادیں" مجھے پیش کی ہے۔ وہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے رومن رسم الخط کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس طرح ان کے خیال میں زبانوں کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اسٹیج ڈراموں میں بھی کام کرتے ہیں۔ بمبئی میں اسٹیج ڈرامے بہت مقبول ہیں۔ مہاراشٹر زبان میں ڈرامے نے بہت ترقی کی ہے۔ ایک اسٹیج آرٹسٹ کا نام کچھ مشکل سا ہے۔ وہ اکیلا تین تین گھنٹے تک اسٹیج پر اداکاری کرتا ہے اور لوگوں کو مسلسل محظوظ کرتا ہے۔ ڈرامے کا اسکرپٹ بھی خود ہی لکھتا ہے۔ ہدایت کاری بھی خود کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہے بلکہ ڈرامیٹک سوسائٹی ہے۔ شہر میں اس ڈرامے کے بینر بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس ایک آدمی کے ڈرامے کے لوگ اتنے شیدائی ہیں کہ روزانہ ہال فل رہتا ہے اور ڈرامہ کئی کئی مہینے چلتا رہتا ہے۔ میرے میزبان یہ کہتے ہوئے کہ مہاراشٹر زبان میری سمجھ میں نہیں آئے گی، اس لیے وہ مجھے ڈرامے میں نہیں

لے جاتے ہیں۔ مسز توش بھی مجھے اپنی نظموں کی کتاب پیش کرتی ہیں۔ وہ پنجابی میں خوب صورت آزاد نظمیں لکھتی ہیں۔

دو نظمیں ذرا ملاحظہ ہوں:

گلاس بر چھاں دا جوڑا
بھریا، لدیا، سجیا،
گلابی، لال، عنابی گلاساں نال
ترکاں دی، دھپ وچ لشکدے
گوہڑے، ہرے، پتیاں نال ڈھکیا
جیویں کوئی، اچالماں گھبرو، کوئی لاہڑا
مکٹ، سنہری جھالراں، پھل سہرا، پکا پائی
مشالاں والی، واجیاں والی، پہاڑی جنج لے
جھم جھم کردی لاڑی نوں ڈولی چ پائی
گھوڑی چڑھ
اپنے گراں نوں چلیاں ہووے

☆☆

اُج پر بھاتے
بدلاں وچوں
لکدیاں چھپدیاں

برف نہاتیاں
ریشماں آئیاں
تن نال لکیاں
جیوں پہلاں اُتے سدیوں
سچا سچا پیار
شگوفے دے نکے گلابی پھل
اجے جھڑے دی نئیں سن
کہ
بنجھو بھر نیلیے بدل
آسماناں وچ ڈول پے

یہ پنجابی لوگ جو محبت کے بھوکے ہیں کاش ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسائل سلجھانے کے لیے کچھ زوردار کوششیں کریں کیونکہ جنگ چھڑتی ہے تو خون دونوں طرف پنجاب میں ہی بہتا ہے اور آگ بھی پنجاب میں ہی لگتی ہے۔ جذباتی محبت چھوڑ کر اپنی سیاسی بصیرت کو استعمال کریں۔

میں بلراج کے خاندان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ کون جانتا ہے کہ پھر ملاقات ہو یا نہیں، کرشن چندر بھی قریب ہی رہتے ہیں انہیں گھر چھوڑتے ہوئے ہم واپس ہوٹل آ رہے ہیں۔ آج کل بمبئی میں بھی شادیوں کا موسم ہے۔ اس ہوٹل کے ہال بھی شادیوں کے لیے بک ہیں۔

صبح مجھے ان لوگوں نے ''ایلی فینٹس کیو''، ''ہاتھیوں کی غار'' دکھانے کا پروگرام بنایا ہے۔ صبح پھر کافی فاصلے طے کر کے ہم گیٹ وے ٹو انڈیا پہنچتے ہیں۔ سامنے تاج محل انٹر کانٹی نینٹل ہے۔ پرانا حصہ بھی اور نیا حصہ بھی۔ کیماڑی کی یاد آ رہی ہے۔ لانچیں مسافروں کو لے کر جا رہی ہیں۔ گیٹ وے ٹو انڈیا تاریخی دروازہ ہے۔ برطانوی بادشاہ پہلی مرتبہ ہندوستان آیا تو اس کا جہاز یہیں لنگر انداز ہوا تھا۔ بحیرۂ عرب، کراچی کو بھی یہی سمندر چھوتا ہے۔ یہی لہریں میرے وطن تک بھی پہنچتی ہوں گی۔ یہ اٹیمی ری ایکٹر نظر آ رہا ہے۔ ایک گھنٹے کا سفر ہے۔

ہمارے ساتھ پھر ایک گائیڈ لیکچرر ہے۔ یہ لانچیں ایک مسلمان کی ہیں۔ محمدی لانچ سروس، گائیڈ لیکچرر بھی لانچ کمپنی فراہم کرتی ہے۔ دو لانچیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں جو اس گائیڈ لیکچرر کی ذمے داری میں ہیں۔ دونوں لانچوں میں غیر ملکی زیادہ ہیں۔ وہ بھی سفید فام، کچھ ٹورسٹ ہیں، ٹورسٹ لڑکیاں نوٹ بک میں تیزی سے لکھے جا رہی ہیں گائیڈ لیکچرر کچھ دور دو لانچوں کو رکوا کر ان غاروں کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ یہاں آپ کو نہ ہاتھی ملیں گے اور نہ غار۔ یہ ایک جزیرہ ہے۔ انسانوں نے خود یہاں پہاڑ کاٹ کر یہ مندر بنایا تھا۔ بہت اونچائی پر چڑھنا ہے۔ بوڑھے لوگوں کے لیے کہار کھڑے ہیں بانسوں سے بندھی کرسیوں پر بٹھا کر اوپر لے جانے کا انتظام ہے۔ چار کہار انہیں اٹھاتے ہیں۔ پانچ روپے ایک مرتبہ کے ہیں۔ انسان انسان کو اوپر اٹھا لے کر جاتا ہے اور پیٹ پالتا ہے۔ غار میں دیوی دیوتاؤں کے بڑے بڑے بت بنے ہوئے ہیں فن کے لحاظ سے یہ بہت عمدہ ہیں۔ چھینی اور ہتھوڑی سے پہاڑ کو کاٹ کاٹ کر یہ فن پارے ابھارے گئے ہیں۔ گائیڈ لیکچرر ہندو دیو مالا کے حوالے سے اپنے ان بھگوانوں کی تشریح کر رہا ہے۔ کہانیاں سنا رہا ہے۔ اندر گرمی بہت ہے۔ غیر ملکی سیاح بڑی دلچسپی سے یہ حکایات سن رہے ہیں۔ اس روشن خیالی کی صدی میں دیو مالائی کی کہانیوں میں اتنی دلچسپی۔ یہ بھی زندگی سے ایک فرار ہی تو ہے۔ کئی کئی ہاتھوں والے دیوتا اور دیویاں آگ، پانی، بارش، غلے، بجلی کے دیوتا۔ ان غاروں کے بارے میں سرکاری طور پر چھپی ہوئی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ وقت کم ہے۔ ورنہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اجنتا اور فلورا غاروں کی طرف بھی مجھے جانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں میرے لیے اتنی ہی سیر کافی ہے۔ آج اتوار ہے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سات بجے مجھے دہلی روانہ ہونا ہے۔ سو اپنے ہوٹل لوٹتے ہیں۔ ٹھنڈے کمرے میں

اطمینان سے سوتا ہوں۔ میں بمبئی سے روانہ ہو رہا ہوں۔ جس میں کافی گرا چیت مل رہی ہے۔ روشنی، ٹھنڈی ہوا، سڑکوں پر چڑھتی سڑکیں، ساتھ ساتھ سمندر، سمندر کے کنارے کھڑی فلک بوس بلڈنگیں، جیسے خودکشی کے لیے سوچ رہی ہوں۔ سانتا کروز ایئرپورٹ، انڈین ایئر لائنز، مرکز کے ایک ڈپٹی منسٹر بھی اس جہاز سے جا رہے ہیں اس لیے مجھے بھی وی آئی پی الوداع مل جاتا ہے۔ سرکاری افسران کے ساتھ ساتھ مجھے بھی الوداع کہہ رہے ہیں۔ انڈین ایئر لائنز میں اب کے کھانا بھی مل رہا ہے مگر ایئر ہوسٹس ویسی ہی بور ہیں۔ پالم ایئرپورٹ، اشوکا ہوٹل، کمرہ میں دو کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب 265 ملا ہے۔

بنگلہ دیش ہائی کمیشن میں

صبح مجھے وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری سے ملنا ہے...... کیول سنگھ...... وہ پاکستان میں بھارت کے ہائی کمشنر بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے میری ملاقات دہلی میں متعین غیر ملکی اخباری نمائندوں کی طرف سے دیے گئے لنچ میں بھی ہو چکی ہے۔ ان سے معرکہ رہے گا۔

میں اس سے پہلے بنگلہ دیش ہائی کمیشن سے فون پر بات کر چکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنے مشرقی پاکستان بھی ہو آؤں، جسے لوگ اب بنگلہ دیش کہتے ہیں۔ دیکھوں کہ ڈھاکے پر کیا گزری۔ موتی جھیل کو کیا ہوا، رمنا پارک میں اب کیا رونقیں ہیں۔ کے جی بھائی کیا کرتے ہیں۔ موسیٰ صاحب کیسے ہیں۔ بنگلہ دیش ہائی کمیشن کا نمبر ان فون ڈائریکٹریوں میں تو نہیں ملتا، جو ہوٹل میں دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری اور ٹیلی فون کے سلسلے میں بھارت پاکستان سے بہت پیچھے ہے۔ ہمارے ہاں سال میں دو مرتبہ ڈائریکٹری تیار کی جاتی ہے ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ نمبر انکوائری سے حاصل کر کے فون کرتا ہوں۔ وہ لوگ اگلے روز فون کے لیے کہتے ہیں۔ میں انہیں اپنا مدعا بیان کر دیتا ہوں۔ آج کچھ وقت بھی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ آج بنگلہ دیش ہائی کمیشن ہو آؤں۔ دیکھوں کیسا ہے؟ ایک پاکستانی سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ دشمن ملک میں اپنے ایک تازہ دشمن (جو کل تک ہمارے بھائی تھے) کے سفارت خانے میں جانا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ جاؤں۔ ذہن کہتا ہے کہ نہیں جانا چاہیے۔ پھر سوچتا ہوں کہ آخر ہمارے بھائی ہی ہیں۔ روٹھ گئے تو کیا ہوا۔ بہر حال میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں کہ بنگلہ دیش ہائی کمیشن کی طرف چلو۔ اسے معلوم ہے کہ ہائی کمیشن کدھر ہے۔ کراچی کے سوسائٹی جیسے علاقے ایلسینیشن ایریا میں میں روڈ پر ہی بنگلہ دیش ہائی کمیشن ہے۔ پرچم لہرا رہا ہے۔ میں گاڑی باہر رکواتا ہوں، عمارت کا جائزہ لیتا ہوں۔ مختصر سی عمارت، پھاٹک پر چوکیدار سے پوچھتا ہوں۔ استقبالیہ کدھر ہے؟ وہ اندر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہوں۔ الٹے ہاتھ صوفے پڑے ہیں۔ ان پر ایک غیر ملکی تشریف فرما ہیں۔ سامنے استقبالیہ پر ایک اور صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے الٹے ہاتھ دیوار پر دروازے کے عین اوپر شیخ مجیب الرحمٰن کی تصویر لگی ہے۔ میں بنگلہ دیش کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں۔ استقبالیہ پر مامور ''بنگالی بابو'' سے انگریزی میں کہتا ہوں۔ مجھے پریس اٹیچی مسٹر امیر الاسلام سے ملنا ہے۔'' اس نے پوچھا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں''۔ ''میں بلاتامل کہہ رہا ہوں۔ ''پاکستان سے۔'' بنگالی بابو ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے۔ ''اسلام علیکم۔'' میں بھی اسی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ وعلیکم السلام۔ یہ میز ہمارے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ یہ حائل نہ ہوتی تو اب تک مشرقی اور مغربی پاکستان بغل گیر ہو چکے ہوتے۔ یہ میز نہ جانے کب سے حائل ہے اور کب تک حائل رہے۔ میں سوچ کیا رہا تھا اور ہو کیا رہا ہے۔ وہ اسی محبت گرمجوشی سے مجھے ایک کمرے کی

طرف لے جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ہے۔ جسے میں محسوس کر سکتا ہوں۔ نام نہیں دے سکتا وہ دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے ایک بنگالی نوجوان افسر بڑی بڑی قلموں اور بالوں والا بیٹھا ہے۔ ان صاحب سے وہ بنگالی میں بتاتا ہے کہ یہ پاکستانی صحافی ہیں۔ مسٹر امیر الاسلام سے میں فون پر بات کر چکا ہوں۔ اس لیے انہیں یاد آجاتا ہے، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے ہاتھ ملاتا ہے۔ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر الٹے ہاتھ پڑے کالے صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں بھی قریب بیٹھ جاتا ہوں۔ کیا حال ہے۔ آپ کراچی میں ہوتے ہیں، پنڈی میں، کراچی کیسا ہے۔ میں کراچی میں ہی ہوتا تھا۔ فارن افیئرز میں۔''

ہم باتیں کر رہے ہیں۔ ایک ڈپلومیسی، ایک ذہنی تحفظ، درمیان میں حائل ہے۔ نہ میں پوچھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا تھا کیوں ہمارے خلاف ہو گئے۔ نہ وہ پوچھتے ہیں کہ آپ اب ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ہائی کمیشن کے ایک اور نوجوان افسر بھی آجاتے ہیں۔ وہ شاید کمرشل شعبہ سے منسلک ہیں۔ انہیں بھی کراچی یاد آ رہا ہے۔ ''اخبار جہاں'' یاد آ رہا ہے۔ اس کے سرورق یاد آ رہے ہیں۔ اپنے کچھ ساتھی صحافیوں کا پوچھتے ہیں کچھ دوستوں کا۔ اسی اثناء میں روزنامہ ''سن'' کے ڈھاکہ میں سابق نمائندے عطاء الصمد اور آج کل بنگلہ دیش کی سرکاری نیوز ایجنسی کے دہلی میں نمائندے آجاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مارننگ نیوز کے مسٹر خطیب بھی ہیں۔ ان سے میں ڈھاکہ میں ملا تھا۔ فوجی کارروائی کے بعد بھی یہ مورننگ نیوز ڈھاکہ میں کام کر رہے تھے۔ صحافیوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ عطاء الصمد پی ایف یو جے کے سرگرم رکن ہوتے تھے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اب کے انتخابات کیسے رہے۔ کون کون منتخب ہوا ہے۔ بتایا کہ کے جی بھائی وغیرہ کچھ روز پہلے ایشیا اسمبلی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ میں بنگلہ دیش کے ہائی کمیشن میں بیٹھا ہوں۔ بنگلہ دیش جو کل تک ہمارا ہی حصہ تھا۔ ہمارا بھائی تھا مگر اب ہمارا تازہ ترین دشمن ہے یہ سفارت خارجہ ہمارے مستقل دشمن کی سرزمین میں ہے اور میں واحد پاکستانی ہوں۔ یہ لوگ کیسے گھل مل رہے ہیں۔ پاکستان کی یادیں کیسے ستا رہی ہیں۔ تاریخ کتنی ظالم ہے۔ وقت کتنا ستمگر ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا ہے۔ سیاسی حد بندیوں نے کتنے انسانوں کا خون پی لیا ہے۔ آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا۔ چائے ٹھیک ہے، چائے آ رہی ہے۔ یہاں دنیا کا جو نقشہ لٹک رہا ہے اس میں بھی مشرقی پاکستان ہی چھپا ہوا ہے۔ اپنے ہاتھ سے اسے کاٹ کر بنگلہ دیش لکھا ہوا ہے۔ یہ نوجوان آفیسر، شاید اتنی جلدی اتنے بڑے عہدے پر نہ پہنچتے اگر بنگلہ دیش نہ بنتا۔ بنگلہ دیش کے قیام کی جدوجہد ان ہی لوگوں کی تو تھی۔ متوسط طبقے کی۔ ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کی۔ غریب پرولتاریوں کو ملک بنانے کی فکر کہاں ہوتی ہے۔ انہیں تو روٹی چاہیے، پاکستان تھا تب بھی انہیں مشکل سے روٹی ملتی تھی اور اب تو ان کے لیے روٹی اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔ ملک بنتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، یہ ہمیشہ ٹوٹے رہتے ہیں۔ ملک بنتے ہیں تب ان کی بنیادوں میں پرولتاریوں کا خون دیا جاتا ہے۔ ٹوٹتے ہیں، تب ان کا خون بہتا ہے۔ چائے آگئی ہے۔ مشرقی پاکستان کے جانے کے ساتھ ساتھ چائے بھی چلی گئی۔ ''میں پان نہیں کھاتا۔'' وہ پان کا پوچھ رہے ہیں۔ پان بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں نے باقاعدہ طریقے سے مشرقی پاکستان جانے کے لیے درخواست دے دی ہے۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لیے بھی ویزا درکار ہو گا۔ پاکستانی پاسپورٹ لے کر وہاں جانا پڑے گا۔ تاریخ ہمارا مذاق اڑاتی ہے، کمزور قوموں کے ساتھ تاریخ بھی تو ستم ظریفیاں کرتی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آج ہم ڈھاکے ٹیلیکس بھیج دیں گے کل یا پرسوں تک

اس کا جواب مل جانا چاہیے۔ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔ میں اجازت لے رہا ہوں۔ اپنے روٹھے ہوئے بھائیوں سے مل کر ایک عجیب سی طمانیت ہورہی ہے۔

سیکریٹری وزارتِ خارجہ کیا کہتے ہیں؟

ہوٹل سے ہوتا ہوا شاستری بھون جاتا ہوں۔ یہاں ایکسٹرنل پبلسٹی کی لائبریری میں گزشتہ ہفتے کے پاکستانی اخبارات مل جاتے ہیں۔ یہاں یہ نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ راولپنڈی کا ''جنگ'' ہے۔ باقی اخبارات لاہور اور پشاور کے ہیں۔ کراچی کے اخبارات بہت کم آتے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کے سفارت خانے والے ہفتے کے ہفتے یہ اخبارات پہنچاتے ہیں۔ دہلی سے اخبارات لے کر وہ راولپنڈی پہنچاتے ہیں۔ جنگ کے بعد سوئٹزر لینڈ کا سفارت خانہ ہی پاکستان اور ہندوستان میں ایک دوسرے ملک کے مفادات کی نگرانی کررہا ہے۔ اس کے توسط سے یہ دوریاں کبھی کبھار ختم ہوجاتی ہیں۔

میں مسٹر جے این بھٹ کے ساتھ وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کیول سنگھ سے ملنے جارہا ہوں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو کیول سنگھ صاحب (جو داڑھی مونچھ منڈواتے ہیں، سر کے بال بھی کٹواتے ہیں) اپنی نشست سے اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ کونے میں پڑے صوفوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ان کے الٹے ہاتھ بیٹھنے لگتا ہوں۔ تو وہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ یہ پروٹوکول ہے کہ آپ الٹے ہاتھ نہیں میرے سیدھے ہاتھ بیٹھیں۔ میں نے پروٹوکول پورا کرتے ہوئے کاغذ قلم نکال کر میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''اگر یہ آپ کے پروٹوکول کے خلاف نہ ہو تو کیا میں پنجابی میں بات کرسکتا ہوں۔'' اس پر کیول سنگھ صاحب کے چہرے سے پروٹوکول ہوا ہوگیا اور وہ کہنے لگے۔ ''آہو جی۔ کیوں نہیں۔''

میں پنجابی میں شروع ہوگیا۔ کیول سنگھ صاحب بظاہر بڑے ''پیبے'' آدمی ہیں۔ دھیما لہجہ، ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کرتے ہیں جیسے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بات سمجھاتا ہے۔ بات جنگی قیدیوں کے مسئلے سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اپنا وہی موقف دہرارہے ہیں کہ پاکستانی فوجیوں نے بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس لیے ان کی رہائی کے لیے بھی بنگلہ دیش کی منظوری ضروری ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو چاہتے ہیں کہ انہیں جلد چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس سے بہرحال کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوجائے تو اس سے بدنامی بھی ہماری ہوتی ہے۔ ہماری فوجیں بیرکوں سے باہر خیموں میں بیٹھی ہیں کیونکہ بیرکیں جنگی قیدیوں کے پاس ہیں آپ خود بتائیں کہ ہم کیوں نہ انہیں رہا کرنا چاہیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر آپ رہا کیوں نہیں کردیتے۔ کیوں بدنامی مول لے رہے ہیں۔''

کہہ رہے ہیں بنگلہ دیش کی منظوری کے بغیر کیسے کرسکتے ہیں۔'' میں نے انہیں کہا۔ ''بنگلہ دیش تو آپ ہی کی تخلیق ہے۔ آپ اگر چاہیں تو وہ کیسے تیار نہیں ہوگا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی اگر کسی بھی صورت میں بات ہوسکے تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔''

''میں نے کہا۔'' آپ ان کی ملاقات کے لیے کوئی کردار ادا کرسکتے ہیں۔''

''نہیں ہم تو اس میں دخل نہیں دیں گے۔ ملاقات کے لیے حال ہی میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل مسٹر والڈ ہائیم نے بھی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکے۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''آپ پاکستان سے بہتر تعلقات اور اچھی خواہشات کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن عملی طور پر آپ کا جو رویہ بنگلہ دیش کے لیے

ہے وہ پاکستان کے لیے نہیں ہے۔ پاکستان کے
لیے کبھی بھی آپ کا رویہ دوستانہ نہیں رہا ہے۔''
وہ کہہ رہے تھے۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ حالیہ
تاریخ کی وجہ سے بنگلہ دیش سے ہمدردی بڑھ گئی۔
ہم تو چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی رنجشیں
دور ہوں۔ صدر بھٹو کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش میں
انتخابات کے بعد غور کریں گے کہ اسے تسلیم کیا
جائے یا نہیں۔ آج کل ہم انتظار میں ہیں۔''

میں نے شہری جنگی قیدیوں کے بارے میں
پوچھا۔ ''آپ نے کئی ہزار پاکستانی شہریوں کو بھی
کیمپوں میں بند کر رکھا ہے۔ ان میں بوڑھی عورتیں
بھی ہیں، بچے بھی، شیر خوار بچے بھی اور ایسے بچے
بھی جو ان کیمپوں میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا
قصور کیا ہے؟ انہیں تو آپ چھوڑ دیجیے۔''

اس پر انہوں نے کہا۔ ''ہم نے تو پیشکش کی تھی
کہ 6000 عورتیں بچے چلے جائیں۔ ان کے
بدلے میں اتنے ہی بنگالی عورتیں بچے پاکستان چھوڑ
دے۔ پاکستان نے اس کے بدلے میں پندرہ ہزار
بنگالی بنگلہ دیش پہنچانے کی پیشکش کی۔ ان کی
فہرست سنا ہے کہ بنگلہ دیش کے پاس آئی ہے۔''

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جہاں
تک مجھے علم ہے پاکستان نے یہ پیشکش کی ہے کہ وہ
ان بنگالیوں کو واہگہ کی سرحد تک پہنچا دے گا۔ بنگلہ
دیش کے حکام اور بھارت کی حکومت انہیں وہاں
سے بنگلہ دیش لے جانے کا انتظام کرلے لیکن
بھارتی حکومت نے انکار کیا کہ وہ اپنے علاقے سے
انہیں گزرنے نہیں دیں گے۔''

اس بات پر فارن سیکریٹری نے کچھ پہلو بدلا
اور کہا۔ ''ہاں ہم اس میں نہیں پڑنا چاہتے تھے کیونکہ
یہ مسئلہ بہرحال بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان
ہے۔ اس لیے ہم بیچ میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اور
اسی لیے ہم نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔''

مجھے یاد آرہا تھا کہ یہی بات میں نے وزارتِ
دفاع کے سینئر افسر سے پوچھی تھی تو اس نے کہا تھا
کہ یہ غلط ہے ہم نے ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔
وزارتِ دفاع اور وزارت خارجہ کے درمیان کتنا
تفاوت۔ کتنا فاصلہ ہے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ''اگر یہ بنیادی
مسائل طے ہو جائیں اس کے بعد بھارت اور
پاکستان میں تعاون کی کیا صورتیں آپ کے خیال
میں ہو سکتی ہیں۔''

انہوں نے بتایا۔ ''جتنا تعاون بھارت اور
پاکستان آپس میں کر سکتے ہیں۔ شاید ہی کوئی اور دو
ملک آپس میں کر سکیں۔ میں ہندوستان کی طرف
سے کئی ملکوں میں سفیر رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ
ہر جگہ پڑوسی ممالک آپس میں اقتصادی روابط
بڑھاتے ہیں۔ مشترکہ فارمولے تیار کرتے ہیں۔
آپ کی بہت سی چیزیں ہم استعمال کر سکتے ہیں۔
بہت سی چیزیں آپ ہمارے ہاں سے لے سکتے
ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کی سوئی گیس ہے۔ آپ
کو پائپ ہی تو ڈالنا ہے اور کیا خرچہ ہوگا۔ ہم عمر بھر
کے لیے آپ کے محتاج ہو جائیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی
مرکز ان دنوں پاکستان کے گرد حصار قائم کرنا ہے۔
حال ہی میں آپ نے اور وزیر خارجہ نے بحرین کویت
وغیرہ کے دورے کیے ہیں۔ یہ پاکستان کے دوست
ممالک ہیں۔ آپ کی کوششوں سے لگتا ہے کہ آپ
پاکستان کو تنہا (Isolate) کرنا چاہتے ہیں۔''

اس پر وہ انہوں نے کہا۔ ''نہیں نہیں ہمارا ایسا
کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بحرین کویت وغیرہ کے وفد
ہمارے ہاں آئے تھے۔ انہوں نے ہماری
مصنوعات دیکھیں۔ ہمارے وفد ان کے ہاں گئے۔
وہ ہمارے قریبی ہمسائے ہیں۔ ہمارے پاس کافی
ہیں۔ ان سے تجارتی لین دین کر سکتے ہیں۔ ہم تو
سب کے ساتھ اچھے تعلقات کے خواہاں ہیں۔ خلیج
فارس کی ریاستوں کے دورے کی ایسے سیاسی مقصد

کے لیے ہرگز نہیں کیے گئے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ افغانستان، بنگلہ دیش، پاکستان، ہندوستان سب کے آپس میں اچھے تعلقات ہوں۔ ایک دوسرے کے خلاف سیاسی کوششیں کرنے سے کسی کو بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر ہم آپس میں لڑتے رہیں گے تو فائدہ ہمیشہ تیسرا اٹھائے گا۔ انہی جھگڑوں کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان تک پہنچنے میں کافی دیر لگے گی لیکن یہ فاصلے ہمیں طے کرنے ہیں۔ ورنہ دوسرے ہم پر ہنستے رہیں گے۔"

مرنجان مرنج۔ کیول سنگھ دھیمے دھیمے لہجے میں یہ باتیں کررہے ہیں۔ یہ باتیں اپنی جگہ مگر پرنالہ وہیں گر رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں الیکشن اور اس کو تسلیم کرنا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ اچھے تعلقات ہوں مگر۔

میں نے ان سے اجازت لی تو انہوں نے کہا۔ "آپ گھومیں پھریں، لوگوں سے ملیں دیکھیں ان کے کیا نظریات ہیں کیا چاہتے ہیں۔"

دہلی میں شام کافی گمبھیر ہوتی ہے، پرانے سیکریٹریٹ کی سرخ عمارتوں میں یہ شام کچھ اور بھی گمبھیر ہو جاتی ہے۔ آج دیوان بریندر ناتھ کے ہاں کھانا ہے۔ کافی لوگ وہاں آرہے ہیں۔ سب سے ملاقات رہے گی۔

یہ نظام الدین ایسٹ ہے۔ قدیم علاقے میں جدید مکانات، جے این بھٹ، ان کی بیگم اور میں دیوان بریندر ناتھ کا مکان تلاش کررہے ہیں۔ دہلی کی ویران رات شہر کو اور سنسان کررہی ہے۔ دھیمی دھیمی روشنیاں، دیوان بریندر ناتھ اور ان کی بیگم منتظر ہیں اور لوگ بھی ہیں۔ یونیورسٹی کے لیکچرار ایک دانشور، بزرگ صحافی جمنا داس اختر، امرتا پریتم کو آنا تھا مگر وہ کسی کام کی وجہ سے نہیں آسکی ہیں۔ بھارتی وزارتِ خارجہ کے بخشی صاحب بھی اپنی بیگم کے ہمراہ آگئے ہیں۔ اب یہ اچھی خاصی کاک ٹیل بن گئی ہے۔ مختصر سا مکان ہے۔ اس میں بھی لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ میں اکیلا پاکستانی ہوں۔ پاکستان کے بارے میں مجھ سے بار بار سوال ہورہے ہیں۔ یہاں مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر کتنا فخر محسوس ہورہا ہے۔ شری بخشی اور شری بھٹ پاکستان میں رہ چکے ہیں۔ وہ کراچی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ کھانے سب دیسی ہیں۔ گوشت بھی چل رہا ہے۔ اس حد تک تو اب ہندو ترقی پسند بلکہ گوشت پسند ہوگئے ہیں۔

رات کافی ڈھل چکی ہے۔ میں اپنے ہوٹل واپس جارہا ہوں۔

آج مجھے ہندوستان میں آئے پورے دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ آج 27 فروری ہے۔ دشمن ملک میں 14 روز۔ ایک طویل عرصہ ہے۔ اپنے وطن سے بالکل کٹے ہوئے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ گھر پر کیا گزر رہی ہوگی۔ دوستوں کا کیا حال ہوگا۔ پاکستان ریڈیو سن لیتا ہوں۔ ہندوستانی اخبارات میں کچھ خبریں پڑھ لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ کیا رابطہ ہے۔ آج وزیر خارجہ سے انٹرویو ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب سرکاری مہمانداری ختم کردی جائے۔ کچھ روز اپنے خرچ پر بھی رہا جائے۔ ویسے بھی ہندوستان کا بجٹ پاکستانی صحافی کے لیے دو ہفتے سے زیدہ میزبانی کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ ویزے میں بھی توسیع کی ضرورت ہے۔ ویزا تو میں ایکسٹرنل پبلسٹی والوں کے حوالے کرتا ہوں اور خود پران سبروال سے ملنے جاتا ہوں انہیں ملے کافی دن ہوگئے ہیں۔ سبروال اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ بالٹی مورسن کا پورا بیورو چلا رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، سیلون اور نیپال۔ ان کے ذمے ہے۔ ایک مرتبہ پاکستان بھی آچکے ہیں سبروال انگریزی اخبار کے لیے کام کرتے ہوئے بھی اپنی پنجابیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ گھر میں بھی یہ ماحول کچھ کچھ چلتا ہے۔

ہندوستان کی سیاحتی کارپوریشن

آج مجھے ہندوستان کی ٹورزم ڈویلپمنٹ

کارپوریشن کی طرف بھی جانا ہے۔ اپنے اس 14 روزہ قیام میں جہاں جہاں بھی مجھے سیاحتی کارپوریشن سے واسطہ پڑا ہے۔ اس کی کارکردگی نے متاثر کیا ہے۔ آئی ٹی ڈی سی انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن۔ ان کا نشان صرف t ہے۔ آسان، سیدھا سادا۔ ہمارے سیاحتی کارپوریشن کی طرح تجریدی، آرٹسٹک اور گنجلک نہیں ہے۔ ہر قابل دید عمارت، تاریخی نوادرات کے آس پاس یہ نشان ضروری نظر آتا ہے۔ لوگوں کو ان کے ملکوں میں نفسیاتی طور پر مجبور کرنا کہ وہ ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئیں انہیں وہاں بیٹھے ہوئے ہی پورے پروگرام بنانے کی سہولت دینا۔ اپنے ملک سے چلنے سے پہلے ہی وہ کسی ہندوستانی سفارت خانے سے لٹریچر لے کر اپنا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ انہیں وہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے آسان اور بچت والا راستہ کون سا ہو گا۔ ہوٹل ان کی استطاعت کے مطابق کون سا بہتر رہے گا۔ ان کی اپنے جو پسندیدہ موضوعات ہیں ان کے مطابق کون سے مقامات موزوں ہوں گے۔ جب وہ پروگرام بنا کر ہندوستان پہنچ جاتے ہیں، تو ان کے مقام آمد سے لے کر ان کی منزلوں تک جانے کے لیے ہر قسم کی ٹرانسپورٹ موجود ہوتی ہے۔ امیرانہ، درمیانہ، غریبانہ، سیاح کو تاخیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے نہ تکلیف کا۔ سیاحوں کو ان مقامات تک پہنچانا اور ان کے قیام کی سہولتیں فراہم کرنا انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا کام ہے۔ اس کے بعد ان سیاحوں کو ذہنی طور پر متاثر کرنا اور تاریخ کو مسخ کرنا محکمہ آثار قدیمہ کے گائیڈ لیکچراروں کا کام ہے۔ ان سارے مراحل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ افسر، چھوٹے بڑے، کلرک، چپڑاسی سب اپنے ملک سے محبت رکھتے ہیں اور اس سے وابستگی پر فخر بھی کرتے ہیں اور ان مقامات اور اپنے وطن کی دوسری باتوں کے بارے میں بڑے فخر سے باتیں کرتے ہیں۔

ان سب چیزوں کو دیکھ کر میں چاہتا تھا کہ ٹورزم کارپوریشن کے بارے میں کچھ جانا جائے۔ اس کے لائحہ عمل، طریق کار سے آگاہی حاصل کروں، اس کے بارے میں وطن لوٹ کر کچھ لکھوں، پاکستان ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن سے پاکستان کے لیے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ جواب تک یتیم و لاوارث ادارہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں عہدوں اور تنخواہوں میں اضافے کی فکر ہی رہتی ہے۔ پاکستان اور سیاحت کے فروغ کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ میں انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کی عملی کامیابیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور اب پی این سیٹھ صاحب سے اس کارپوریشن کے بارے میں مزید تفصیلات جان رہا ہوں تو مجھے بار بار خفت محسوس ہو رہی ہے کہ ہم اس میدان میں بھی ان سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کارپوریشن ایک خود مختار عوامی سیکٹر کارپوریشن کے طور پر 1966ء میں شروع ہوئی جس میں تین سرکاری ادارے ضم ہوئے۔ ہوٹل کارپوریشن آف انڈیا، انڈیا ٹورزم ٹرانسپورٹ، انڈیا ٹورزم کارپوریشن، سیٹھ صاحب بتا رہے ہیں کہ اس کارپوریشن نے بڑے بڑے مقاصد سامنے رکھے تھے۔

☆ سیاحوں کے لیے آرام دہ قیام گاہیں۔

☆ منظر بینی کے لیے بہتر کاریں اور بسیں۔

☆ سیاحوں کے لیے خاص سہولتیں، تفریح کا سامان اور ڈیوٹی سے مستثنیٰ دکانیں۔

☆ پبلسٹی۔ جس کے ذریعے انڈیا میں سیاحوں کے لیے دلکشی کے مقامات اور نظاروں کی باہر تشہیر کی جائے اور خود ملک کے اندر ہندوستانیوں کو سیاحت کی قومی اہمیت سے روشناس کرنا۔

گزشتہ سال (72-1971ء) میں اس کارپوریشن کی آمدنی 6 کروڑ 70 لاکھ رہی۔ کارپوریشن کے سامنے 1980ء تک قیام کی سہولتوں کو 5000 کمروں اور 9000 بستروں

تک پہنچانے کا منصوبہ ہے۔ اس وقت صرف دہلی میں اس کارپوریشن کے زیر انتظام ہوٹلوں میں 1250 کمرے اور 1700 بستر ہیں۔ اشوکا، اکبر پانچ ستاروں والے ہوٹل ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ہوٹل ہیں۔ اے کلاس، بی کلاس، سی کلاس۔ جس قسم کا سیاح ہو ویسی سہولت، چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ہوسٹل اور موٹل ہیں لیکن صاف ستھرے، دور دراز تاریخی عمارات کے نزدیک بھی قیام کی پور سہولتیں ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد نے جو عمارتیں تعمیر کی تھیں وہ آج ہندوستانیوں کے لیے نام اور دولت کمانے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ کارپوریشن کے ٹرانسپورٹ فلیٹ میں ٹورسٹ کاریں ہیں، لگژری کوچ ہیں، منی بسیں ہیں، فورڈ لموزین ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ دہلی کے علاوہ آگرہ، اورنگ آباد، بنگلور، بدھ گیا، بمبئی، حسن، حیدرآباد، جے پور، کھاجوراہو، کوولام، مدراس، پٹنہ، سرینگر، اودے پور، بنارس میں بھی ٹرانسپورٹ یونٹ قائم ہیں۔ سیٹھ صاحب یہ تفصیلات بتا رہے ہیں۔ مجھے پاکستان ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے باہمی تنازعے یاد آ رہے ہیں۔ جہاں ڈائریکٹروں کی چپقلش چلتی رہتی ہے۔ جہاں تاریخی عمارتوں کے آس پاس کوئی موٹل یا ہوٹل نہیں ہے جہاں گائیڈ لیکچرر بھی مشکل ہے جہاں پاکستان میں اچھی خاصی پرنٹنگ ہونے کے باوجود لٹریچر جرمنی اور دوسری جگہوں سے چھپوایا جاتا ہے۔ جہاں صرف واہگہ سے گزر کر افغانستان جانے والوں یا کوئٹہ سے گزر کر بھارت جانے والے سیاحوں کے اندراج کو شمار کر کے ہی بعد میں فخریہ طور پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اب کے پاکستان میں اتنے سیاح آئے۔

پی این سیٹھ بتا رہے ہیں کہ چار بین الاقوامی ہوائی اڈوں بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دہلی پر ڈیوٹی سے مستثنیٰ دکانیں ہیں۔ ان سے درآمد شدہ سامان کی فروخت کے علاوہ خود ہندوستان کی مصنوعات کے شوکیس کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ سیاحوں کی تفریح کے لیے صورت و نور کے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ دہلی کے لال قلعے میں صورت و نور کا پروگرام مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہاں جا بھی چکا ہوں۔ اس پروگرام کو ہر سال کم از کم ایک لاکھ تیس ہزار افراد دیکھتے ہیں اس کے علاوہ احمد آباد، سری نگر میں بھی ایسے پروگرام ہیں۔

پبلسٹی کے لیے کارپوریشن، اندرون ملک اور بیرون ملک بھرپور مہم چلا رہی ہے۔ سیٹھ صاحب بتا رہے تھے بھارت کے بیرون ملک تعارف کے لیے اس سال کارپوریشن 75 لاکھ روپے کا لٹریچر تیار کرے گی۔ اندرون ملک 13 زبانوں میں سیاحت کی اہمیت پر اور اپنے ملک کو جاننے کے لیے کتابچے، پمفلٹ فوٹو پوسٹ کارڈ شائع کیے جاتے ہیں۔

لوگ کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں۔ ہم اپنے پاس سب کچھ رکھتے ہوئے بھی تہی دامن ہیں۔ شکست، مایوسی اور اداسی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ہندوستان میں موجود تاریخی عمارتیں، زیادہ تر مسلمان شہنشاہوں کی یادگار ہیں جس سے مسلم تہذیب کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ اور سیاحتی کارپوریشن نے مل جل کر ان کے تحفظ کی ذمے داری سنبھال رکھی ہے اور کیسے خوب صورتی سے انہیں محفوظ رکھا ہے۔ اپنی زمین، اپنے تاریخی سرمائے سے یہ محبت، خلوص کا نتیجہ ہے کہ سیاح یہاں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا کاروبار اس سے وابستہ ہے اور ہندوستان والے یوں اپنی ثقافت، تاریخی عظمت اور فن تعمیر کا رعب ڈالتے ہیں۔ اپنے ہاں یہ خلوص اور محبت تو کیا، ان کے کھنڈر بھی نہیں ملتے کس کا رونا روئیں۔

ہندوستان میں بیٹھے ہوئے اپنی محرومیوں کا

احساس کچھ زیادہ ہی ستاتا ہے کیونکہ یہ ہمارا دشمن نمبر ایک ہے جس سے ہمارا ہر میدان میں مقابلہ ہے۔ ہندوستان کی ساری منصوبہ بندیوں میں پاکستان کو زیر کرنا ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اسلحہ سازی میں نہیں۔ ہر جگہ برآمد میں، سیاحت میں، بیرونی تجارت میں لیکن اس کے مقابلے میں ہم کیا کرتے ہیں۔ مسابقت ایک اچھا جذبہ بھی ہے اگر اس میں اپنا استحکام بھی شامل رہے۔

سردار سورن سنگھ سے چند باتیں

اب مجھے وزیر خارجہ سے ملنے جانا ہے۔ سردار سورن سنگھ ایک عرصے سے بھارت کی کابینہ میں کسی نہ کسی حیثیت سے شامل چلے آرہے ہیں۔ کافی دلچسپ شخصیت ہیں۔ ان سے مختصر سی ملاقات شملے میں تو ہوئی تھی آج ذرا اچھی ملاقات رہے گی۔ میں مسٹر بھٹ کے ساتھ پارلیمنٹ کی عمارت میں پہنچا۔ قدم قدم پر پولیس والے روکتے ہیں۔ آج وزیراعظم بھی پارلیمنٹ میں صدر کی تقریر پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے آرہی ہیں۔ اس لیے کچھ زیادہ سخت انتظامات ہیں۔ پولیس والا ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا ایک سا ہوتا ہے۔ بے چارے بھٹ صاحب سپاہی سے کہہ بھی رہے ہیں کہ یہ پاکستانی مہمان ہیں ان کا سردار جی سے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اندر جا کر کسی سے پوچھ لو۔ ہم یہیں رکتے ہیں۔ مگر وہ سپاہی خالص پولیسی لہجے میں بولا۔ ''چپ کر کے کھڑے رہو، کوئی ادھر آئے گا تو اس سے کہوں گا کہ پوچھ کے بتائے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''بھائی وقت گزر جائے گا۔'' مگر وہ اس بات کو کوئی لفٹ نہیں دے رہا تھا۔ ایک اور سپاہی آیا۔ اسے ہمارے ساتھ بھیجا تب ہمیں اس کمرے میں باریابی ملی۔ سردار صاحب تنگ پائنچوں کے پائجامے شیروانی، پگڑی اور داڑھی میں ملبوس تھے۔
بیشتر اس کے کہ سردار جی انگریزی میں بات شروع کریں، میں نے پنجابی میں بات شروع کردی۔ سردار جی بھی پنجابی میں شروع ہو گئے۔
''کنے دن ہو گئے نیں کی خیال اے۔ کی محسوس کیتا۔''
''آپ کہاں کہاں گئے۔''
''میں اپنے شہر راجپور سے پٹیالے گیا ہوں۔ آگرے ہو کر آیا ہوں۔''
''سرہند شریف نہیں گئے۔ وہ تو پٹیالہ سے نزدیک ہی تھا۔ 18 میل دور ہی تو تھا۔ چندی گڑھ ہو آئے۔ کیوں بھئی چندی گڑھ لے جاتے انہیں (بھٹ سے مخاطب ہیں) ہمارے وزیراعلیٰ سے ملواتے۔ پٹیالہ یونیورسٹی دیکھی۔'' انٹرویو کی بات چلی۔ میں ٹیپ ریکارڈ کھولنے لگا۔ کہنے لگے اسے رہنے ہی دیں۔ میں اس کی وجہ سے تیز تیز بولوں گا۔ پھر آپ کو اسے کاغذ پر اتارنا مشکل ہوگا۔ میں بات سمجھ گیا۔ ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا۔ میں نے ان سے پوچھا اردو میں بات چیت کریں گے یا انگریزی۔ انہوں نے انگریزی کو ترجیح دی۔ میں نے کہا۔ درست ہے۔ سردار جی بڑے تحمل مزاج ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے ہیں۔ ناپ تول کرتا کہ کوئی بات ایسی ویسی نہ نکل جائے۔ مجھے ہندوستانی صحافی دوستوں نے بھی بتایا تھا کہ سردار جی سے کوئی خبر نکالنی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس مشکل کا سامنا مجھے بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ سردار جی ہر بات کو جنرل بات بنا کر پیش کیے جا رہے تھے۔ ادھر وزیراعظم اندرا گاندھی کی تقریر کا وقت بھی ہو رہا تھا اس لیے سردار جی بھی جلدی میں تھے۔ حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ سردار جی کھل کر کوئی بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔

ان سے پوچھا گیا کہ بھارتی حکومت اور پاکستانی حکومت کی طرف سے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں مختلف موقعوں پر دیے گئے بیانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر پاکستان بنگلہ دیش کو جلد تسلیم نہیں کرتا تو جنگی قیدیوں کی واپسی کے لیے متبادل انتظامات کیا ہیں؟''

وہ کہنے لگے۔ ''ہم نے بھارتی حکومت کی طرف سے شملہ میں پاکستانی وفد کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کردی تھی کہ جنگی قیدیوں کے مسئلے کے مکمل حل کے لیے بنگلہ دیش کی رضا مندی اور شمولیت ضروری ہے ہمیں واضح طور پر تاثر دیا گیا کہ پاکستان کے نزدیک یہ پوزیشن متنازعہ نہیں ہے ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان میں یہ احساس موجود ہے کہ بنگلہ دیش کو مسلسل تسلیم نہ کرنا پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے اور اس سمت میں قدم تیزی سے اٹھایا جانے کیونکہ پاکستان اس وقت آئین سازی میں مصروف ہے اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان کے کسی آئندہ آئین میں بنگلہ دیش کو شامل کرنا غیر حقیقت پسندانہ امر ہوگا کیونکہ آئین سازی میں بنگلہ دیش سے برائے نام نمائندگی بھی نہیں ہے۔ اس پس منظر میں جنگی قیدیوں کے مسئلے پر بات چیت کو کسی آئندہ وقت پر اٹھا رکھا تھا۔ بہت سی وجوہ کی بناء پر جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ واقعات رونما نہ ہوئے اب شاید پاکستان بنگلہ دیش کے انتخابات کے بعد اس سمت میں کوئی قدم اٹھائے۔ پاکستانی رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً جو بیانات دیئے ہیں ان سے یہی تاثر ملتا ہے اس سلسلے میں بنگلہ دیش یا پاکستان جس نے بھی کوئی قدم اٹھایا اس سے مجموعی طور پر مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔ پوچھا گیا کہ ''اس سلسلے میں بھارت کوئی کردار ادا کرسکتا ہے؟'' سردار سورن سنگھ نے بتایا۔ ''بھارت اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرنے سے اس لیے ہچکچاتا ہے کہ صدر پاکستان نے کئی مواقع پر بیانات دیئے ہیں کہ وہ بالکل پسند نہیں کریں گے کہ بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان کوئی کردار ادا کرے۔ ظاہر ہے کہ ہم بنگلہ دیش کے درمیان بنیادی طور پر یا کسی نوعیت کے مسائل میں مداخلت پسند نہیں کریں جب تک دونوں فریق ہمیں ایسا کرنے کے لیے نہ کہیں لیکن ہماری خواہش ہے کہ ہمارے دونوں ہمسایوں کے تعلقات بہتر ہوں۔ بھارت کے وزیر خارجہ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ جنگی قیدیوں کی نظر بندی بھارت کے لیے بدنامی کا باعث نہیں ہے اور اس سے یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں نوے ہزار انسانوں کو سیاسی سودے بازی کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ اگر ان نوے ہزار قیدیوں اور ان کے خاندانوں کی بے بسی پر کوئی سیاسی فیصلہ کیا بھی گیا، مثال کے طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کر بھی لیا گیا تو کیا مجبوری اور دباؤ کے تحت کیے گئے یہ فیصلے دیرپا امن کے قیام کا باعث بن سکتے ہیں۔

سردار سورن سنگھ نے کہا۔ ''بھارت جنگی قیدیوں کو سیاسی مفادات کے حصول کے لیے یرغمال کے طور پر استعمال نہیں کررہا ہے اس سلسلے میں کسی بھی قیاس آرائی کی میں پورے زور سے تردید کروں گا۔ ہم تو جنگی قیدیوں کے مسئلے کے حل کے خواہش مند ہیں۔ ہم انہیں ضرورت سے ایک دن بھی زائد قید رکھنا نہیں چاہتے ہمیں اس مسئلے کے انسانی پہلو کا شدت سے احساس ہے لیکن ہمارا ایک ناگوار احساس یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جارہا ہے۔'' سردار سورن سنگھ نے کہا کہ پاکستانی ترجمان دوسرے عالمی دارالحکومتوں میں اس مسئلے کو پورے زور شور سے اٹھا رہے ہیں تاکہ سیاسی مفادات حاصل کیے جاسکیں جب کہ دونوں فریق باہمی بات چیت پر رضا مند ہوئے تھے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اس مسئلے پر دوسرے مقامات پر احتجاجی رویہ اختیار کیا گیا ہے حالانکہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اس مسئلے کا حل متعلقہ پارٹیاں ہی تلاش کرسکتی ہیں بھارتی وزیر خارجہ الزام لگا رہے ہیں پاکستان نے مسلح افواج کے بنگالی ارکان کو نظر بند کر رکھا ہے۔ پاکستان نے ابھی تک کوئی وجہ نہیں بتائی کہ وہ ان افراد کو کیوں روکے ہوئے ہے اور بنگلہ دیش جانے

کی اجازت کیوں نہیں دے رہا۔ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر یہ ہوگا کہ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے اس سے بنگلہ دیش اور پاکستان کے رہنماؤں کے درمیان مفاہمت اور اعتماد پیدا ہوگا، معاہدہ شملہ جن اصولوں کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا پاکستان اور بھارت دونوں ان اصولوں کی پاسداری کریں گے۔ شملہ معاہدہ کے تحت فوجوں کی واپسی عمل میں آچکی ہے۔ جموں وکشمیر میں نئی کنٹرول لائن طے ہو چکی ہے۔ یہ دونوں میں طے پایا تھا کہ یہ کنٹرول لائن۔ امن کی لائن ہوگیا در جموں وکشمیر کے سلسلے میں بھارت اور پاکستان کے پہلے سے جو موقف ہیں ان پر اس لائن کا کوئی اثر نہ ہوگا یہ بھی طے پایا تھا کہ اس سلسلے میں مکمل حل دونوں فریقوں کی رضا مندی سے تلاش کیا جائے گا۔ سردار سورن سنگھ نے کہا اگرچہ معاہدہ شملہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ تمام تنازعات طے نہیں ہوئے لیکن اس سے مسائل کے حل کے لیے پرامن اور باہمی رضامندی کا راستہ ضرور نکل آیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھارت اور پاکستان میں شملہ معاہدہ پر نکتہ چینی کرنے والے حلقے بھی موجود ہیں لیکن پاکستان اور بھارت کے عوام کے سماجی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ پرامن تعلق اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں شکوک وشبہات کی جگہ اعتماد اور مفاہمت لے لے۔ چین اور بھارت کے تعلقات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں سردار سورن سنگھ اعتراف کرتے ہیں کہ 1971ء اور 1972ء کے دوران چین سے ہمارے تعلقات کو نقصان پہنچا تھا ہمارا اندازہ ہے کہ اگلے ایک یا دو برس میں تعلقات معمول کی طرف بڑھیں گے۔ بھارت اور چین دونوں کی طویل مشترکہ سرحدیں ہیں۔ اب سرحدوں پر صورت حال کشیدگی سے مبرا ہے۔ بھارت اور چین کے سفارت خانے بھی موجود ہیں۔ عالمی صورت حال میں کشیدگی میں جو کمی پیدا ہو رہی ہے اس کے مطابق بھارت اور چین کے تعلقات بھی یقیناً بہتر ہوں گے اور ہم بھارت کی طرف سے اس بات کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔

سردار جی پارلیمنٹ کی طرف چلے گئے۔

ہمیں بھی اس اجلاس میں جانا ہے۔ دیکھیں وزیراعظم اندرا گاندھی اپنے مخالفین کو کیسے جواب دیتی ہیں۔ صدر گری اپنی صدارتی تقریر کر چکے تھے۔ اس پر مخالف اور موافق تقریریں بھی ہو چکیں تھیں اب وزیراعظم اندرا گاندھی اس بحث کو سمیٹیں گی۔ آج پریس گیلری اور دوسری تمام گیلریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں ایک طرف آندھرا پردیش کانگریس کے رہنما بھی بیٹھے ہیں۔ وہ اس توقع میں ہیں کہ شاید وزیراعظم ان کے مسئلے پر بھی کچھ اظہار خیال کریں۔ وزیراعظم عینک لگائے کچھ کاغذات سنبھالے، سرخ رنگ کی ساڑھی پہنے، تقریر شروع کر چکی تھیں۔ عورت ہونے کے باوجود ان کی آواز میں گرج تھی۔ ان کی تقریر غور سے سنی جارہی تھی۔ پاکستان بھارت تعلقات، اسلحے کی دوڑ، بھارت میں خشک سالی، پیلو مودی اپنے ضخیم جثے سمیت اندرا گاندھی کی تقریر کے بیچ کوئی جملہ پھینک دیتے۔ اندرا گاندھی جھلا کر کاغذات سے نظریں ہٹاتیں۔ پیلو مودی کھلکھلا کر خاموش ہو جاتے لیکن صرف دوبارہ کسی مناسب موقع پر بولنے کے لیے۔ مغربی بنگال کے ممبر بھی کبھی کبھار نکتے اٹھا دیتے لیکن مجموعی طور پر اندرا گاندھی کی تقریر خاموشی سے سنی جارہی تھی آج لوک سبھا کے بھی تقریباً سارے ارکان موجود تھے۔ سرکاری بنچوں سے بار بار تالیاں بجتی رہیں۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد
اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

تین مرد
تین کہانیاں

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

مفاد پرست



اعجاز احمد نوکراَل

اُس شخص کا قصہ جسے دوسروں کے جذبات کے بجائے ہمیشہ اپنا مفاد عزیز تھا

شان ایک بائیس سالہ خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکتا رہتا تھا۔ اس کے نقوش خدوخال عام لوگوں سے بالکل الگ تھلگ تھے اور چہرے پر دو چمکدار مقناطیسی آنکھیں آویزاں تھیں جو اس کی شخصیت کو چار چاند لگائے رکھتی تھیں۔ تعلیم ایم اے تھی۔ اگر کسی نوجوان میں یہ تمام خوبیاں موجود ہوں تو نوجوان لڑکیاں کھچی چلی آتی ہیں۔

لیکن شان کے ساتھ ایک المیہ ہو چکا تھا۔ اس کے والدین حیات نہیں تھے۔ اس کا ایک بڑا بھائی امداد تھا۔ جسے نشے کی لت پڑ چکی تھی۔ وہ دن رات نشے میں ڈوبا رہتا۔ آخر کار نشے کی لعنت نے اس کو اس قدر لاغر کر دیا کہ وہ فوت ہو گیا۔ اب شان کی دو بڑی بہنیں تھیں۔ جو شادی شدہ تھیں۔ وہ اپنے گھروں میں ہنسی خوشی رہتی تھیں۔ شان کے گھر میں اس کے علاوہ اس کا ایک چھوٹا بھائی شاہد بھی رہتا تھا جو ابھی زیر تعلیم تھا۔

اب شان کا اس دنیا میں دو بہنوں اور چھوٹے بھائی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ایک روز چھٹی کا دن تھا۔ دونوں بہنیں اپنے شوہروں کے ہمراہ شان کے گھر پہنچ گئیں اور انھوں نے اصرار کیا کہ شان بھائی آپ اپنی تعلیم مکمل کر چکے ہیں تو کیوں نہ آپ کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔ شان تقریباً رضامندی کے انداز میں ہنسا۔

کچھ دن گزرے کہ شان کی بہنوں کے محلے میں ایک شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔ شان نے بھی اس شادی میں شریک ہونا تھا۔ شان کی بڑی بہن کے سسرالیوں میں ایک لڑکی سحر تھی۔ جس نے حال ہی میں ایم اے پاس کیا تھا۔

عجیب اتفاق ہوا کہ شان کی بڑی بہن نے سحر کا شان سے تعارف کروا دیا۔ سحر ایک خوبصورت اور مدبر لڑکی تھی۔ شان نے سحر کو دیکھا تو وہ پہلی ہی نظر میں سحر کو دل دے بیٹھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔

سحر کے ماں باپ بھی رضامند ہو گئے۔ لیکن ان کی ایک شرط تھی کہ فوری طور پر منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ فوری طور پر عزیز و اقارب کی موجودگی میں منگنی کی رسم ادا کر دی گئی اور یہ بھی طے ہوا کہ چھ ماہ یا سال کے اندر شادی بھی کر دی جائے گی۔ منگنی کی خوشی

میں سحر کا چہرہ کھلے گلاب کی شکل اختیار کرنے لگا اور اس کی شان سے حسین خیالوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔

شان ایک کھلنڈرا نوجوان تھا۔ شدت جذبات اس پر ہمیشہ غالب رہتے تھے۔ طبیعت میں لاابالی پن بھی بہت زیادہ تھا۔

ایک روز ایک کیفے ٹیریا میں اس کا ایک پرانا



دوست دیوان مل گیا۔ دونوں بغلگیر ہوئے اور خوب گپ شپ لگائی۔ دیوان نے شان کو گھر آنے کی دعوت دی۔ جو شان نے خوشی سے قبول کرلی۔

چنانچہ اتوار کو شان کو دیوان کے ہاں جانا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھانا تھا۔ شان مقررہ وقت پر دیوان کے ہاں پہنچا۔ دیوان گھر کے باہر شان کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ دیوان شان کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی زرق برق لباس پہنے ہوئے کھانا لے کر آگئی۔

''یہ میری کزن ارفع ہے۔'' دیوان نے ارفع کا شان سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''ہیلو! ارفع شان سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

شان نے جواب میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے ارفع کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' یہ جملہ شان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''شام کا کیا پروگرام ہے۔'' شان دیوان سے مخاطب ہوا۔

''کوئی پروگرام نہیں۔ ارفع دو روز پہلے ہی امریکہ سے آئی ہے۔ تقریباً ایک ماہ پاکستان رہ کر واپس چلی جائے گی۔'' دیوان نے جواب دیا۔

''تو آج شام میرے ہاں آجاؤ۔ گلبرگ ریسٹورنٹ کی چانپیں کھلاؤں گا۔ آئس کریم بھی چلے گی۔'' شان نے بے ساختہ کہا۔

''ضرور آئیں گے۔'' ارفع نے شان کی آنکھوں میں آنکھیں میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

شام کے ٹھیک سات بجے تھے۔ جب گلبرگ ریسٹورنٹ کے باہر ایک کار آکر رکی۔

شان پہلے ہی سے ریسٹورنٹ میں بیٹھا دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی وہ دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے شان نے کھڑے ہو کر، ''ویلکم۔'' کہا۔ آج ارفع نیلے لباس میں ملبوس آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ شان ارفع کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک کیبن میں چلا گیا۔ دیوان بھی ساتھ تھا۔

''سوری! دیوان اچانک بولا'' میرا موبائل اور سگریٹ کی ڈبیا تو کار میں ہی رہ گئے ہیں۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ آپ انجوائے کریں۔''

شان ارفع کا حسن دیکھ کر تقریباً مدہوش ہو چلا تھا۔ اس کی آنکھیں اس چکا چوند ماحول میں مُندی رہی تھیں۔ شان نے لاشعوری طور پر اپنا دایاں ہاتھ ارفع کی کمر میں ڈال دیا۔ ارفع شان کو دیکھ کر تقریباً بکھر چکی تھی۔ کیونکہ آج شان بھی شہزادہ لگ رہا تھا۔ ارفع کا سارا وجود شان کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور وہ اس گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہتی تھی۔ شان ارفع کی سانسوں کی مہک اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ دونوں محبت کے گہرے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

''رکیں۔'' ارفع نے گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بولی، ''دیوان آنے والے ہیں۔''

اسی اثناء میں دیوان کیبن میں آچکا تھا۔

''سوری! اس لیے تاخیر ہو گئی کہ باہر میرا ایک دیرینہ دوست مل گیا تھا۔''

کھانا شروع ہو گیا۔ شان انتہائی تذبذب کے عالم میں تھا۔ وہ دیوان سے ارفع کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب تینوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو شان سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔ اس نے ارفع کے بارے میں دیوان سے رازدارانہ لہجے میں ایک دو سوال کیے۔

دیوان نے کہا، ''تم کل گھر آنا پھر کھل کر بات ہوگی۔''

شان کا اگلا وقت تذبذب میں گزرا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ تو وہ فوراً دیوان کے گھر پہنچا۔ ارفع گھر میں نہیں تھی۔

''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آج کھل کر باتیں ہوں گی۔ ارفع کہاں ہے؟'' شان نے اپنی بے تابی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہے۔ بس آنے ہی والی ہے۔'' دیوان نے شان کو بتایا۔

ارفع کی وقتی طور پر غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے شان نے سوچا کہ وہ کیوں نہ اپنے دوست دیوان سے اپنے دل کا حال کہہ دے۔ آخر دیوان اس کا دیرینہ اور بے تکلف دوست ہے۔

''دیوان میرے دوست میں ارفع کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟'' شان نے جذباتی انداز میں کہا۔

''بولو، کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' دیوان نے کہا۔

''میں ارفع کو پسند کرنے لگا ہوں اور غالباً وہ بھی۔ میں اس کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔'' شان نے کہا۔

''دیکھو شان میں ایک بات کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔ ارفع ایک دکھی لڑکی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک شخص پہلے بھی آیا تھا جو تین ماہ رہا اور دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اب ارفع مایوسی کے گرداب میں گھری ہوئی ہے، اسے شادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب وہ ایک سماجی کارکن ہے اور فلاح و بہبود کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ اگر تم اسے راضی کر لو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، تم میرے دوست ہو۔'' دیوان نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''میں اسے راضی کر لوں گا۔'' شان نے جواب دیا۔

شان انتہائی پریشانی کے عالم میں تھا۔ اتنے میں ارفع گھر میں داخل ہوئی۔ شان تیزی کے ساتھ اٹھا اور انتہائی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ اپنے طرف کھینچتے ہوئے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

ارفع شان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور دیوان سے مخاطب ہوئی، ''دیوان صاحب شان آئے ہیں، ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کریں'' اور ساتھ ہی اس نے اپنے پرس میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ دیوان کی طرف بڑھایا۔

شان نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا رہنے دیجیے، ''یہ تو جعلی ہے'' اور فوراً اپنی پاکٹ سے ایک نوٹ نکال کر دیوان کو دیا۔

تینوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

دیوان کھانا لینے بازار چلا گیا۔ شان دیوان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارفع کو ڈرائنگ روم کے ساتھ والے سائیڈ روم میں لے گیا اور اپنے دل کا سارا حال کہہ ڈالا۔ ارفع نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''دیوان کو آنے دو، شادی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں۔ میں زمانے کی ستائی ہوئی لڑکی ہوں، تمہیں دیوان سے معلوم ہو گیا ہو گا۔''

دیوان آ چکا تھا۔ تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ خوب خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ دیوان کے علم میں ساری بات آ چکی تھی۔ اس نے شان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں دوست ہیں، ہم دونوں تنہائی میں بیٹھ کر اس سلسلے میں گفتگو کریں گے تاکہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔''

اگلی شام وہ دونوں ایک کیفے میں بیٹھے تھے اور دونوں کا موضوع ارفع تھی۔ دیوان نے شان کو یقین دلایا کہ ارفع مان جائے گی۔ لیکن دیوان کا ایک سوال شان کے لیے معمہ بن کر آن کھڑا ہوا۔ کہ تم نے اتنی تعلیم حاصل کی ہے اور ابھی تک تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی، آخر کیوں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں تو معلوم ہے میرے والدین انتقال کر چکے ہیں۔ میری بڑی بہنوں نے اپنے ایک عزیزوں کے ہاں میری بات ٹھہرائی ہے اور وہاں منگنی طے ہو چکی ہے۔ لیکن میں قطعی طور پر اس لڑکی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ میرا ارادہ امریکہ جانے کا ہے۔'' شان نے کہا۔

''تو پھر تم اس لڑکی کو کیا جواب دو گے۔'' دیوان نے کہا۔

''انکار کا جواب دوں گا۔'' شان نے کہا۔

''مگر ادھر ایک فائدہ ضرور ہے کہ ارفع تمہیں شادی کے بعد امریکہ ساتھ ضرور لے جائے گی۔ تم کل شام گھر آ جاؤ۔ ہم اس سلسلے میں کسی قطعی فیصلے پر ضرور پہنچ جائیں گے۔'' دیوان نے شاطرانہ انداز میں کہا۔

اگلے روز شان مٹھائی کے ڈبے لے کر دیوان کے ہاں پہنچ گیا۔ اس وقت ارفع باتھ روم میں تھی۔

دیوان نے انتہائی رازدارانہ انداز میں کہا، ''کان ادھر لاؤ۔ میں نے ارفع کو منا لیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ شادی کے لیے تیار ہے۔ لیکن اس بات کا قطعی راز نہ رکھو

کہ تمھاری کہیں اور منگنی ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، وہ منگنی تو تمھیں توڑنی ہی پڑے گی، اس میں تمھارا بہت بڑا فائدہ ہے کہ ارفع شادی کے بعد تمھیں اپنے ساتھ امریکہ لے جائے گی اور جو تمھارا ڈھیروں دولت کمانے کا خواب ہے وہ پورا ہو جائے گا۔"

ارفع جب باتھ روم سے باہر آئی تو وہ حیرت زدہ تھی کہ مٹھائی کس مقصد کے لیے آئی ہے۔ حیرت کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے سے ظاہر تھے اور وہ زیر لب مسکرا بھی رہی تھی۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔ بڑے غور و خوض اور لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ارفع شان سے شادی کرنے کے بعد شان کو امریکہ اپنے ساتھ لے جائے گی۔

اگلے روز دیوان شان کو ملنے کے لیے اس کے گھر گیا اور اس کو مشورہ دیا کہ "اس منگنی کو جتنی بھی جلدی ہو سکے توڑ دو۔" شان نے یقین دلایا کہ "وہ یہ کام بہت جلد کر دے گا۔ اسے اس کام میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

☆☆☆

آخر چند دنوں کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور طوفان کی صورت میں پھیل گیا کہ کوئی شریف آدمی کیسے چاہے گا کہ اس کی بیٹی کی منگنی ٹوٹ جائے۔ لیکن یہ تو افراتفری کا دور ہے اس معاشرے میں ہر وقت ہر قدم پر کوئی بھی سانحہ رونما ہو سکتا ہے اور آخر وہی ہوا شان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ منگنی ٹوٹ گئی۔ اور اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ارفع سے شادی کرے گا اور شادی کے بعد ارفع اسے امریکہ ساتھ لے جائے گی۔

چند دن بعد وومن کلچر تنظیم کے زیر اہتمام ایک میٹنگ ہونے والی تھی۔ جس کا ایجنڈا عورت کے حقوق اور اُس کو تحفظ دلانے کے بارے میں تھا۔ جس کی صدارت ارفع نے کرنا تھی۔ کیونکہ وہ ایک سماجی کارکن تھی۔ سنٹرل لائبریری میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ عورتوں کا یک جم غفیر تھا۔ اس ہجوم میں ہر طبقے کی عورت موجود تھی۔ تقریب کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ صدارت امریکہ سے آئی ہوئی ارفع نے کی۔ مہمان خصوصی کا جب اعلان ہوا تو سحر حیران رہ گئی کہ اس کی عزیز ترین سہیلی ارفع تھی۔ تقریب کے اختتام پر دونوں خوشی سے بغلگیر ہو گئیں۔

سحر نے بتایا کہ، حال ہی میں میری منگنی ٹوٹ چکی ہے۔"

ارفع نے بتایا کہ "میں تو مطلقہ ہو چکی ہوں۔ اس دنیا میں پریشان ہر کوئی ہے مگر ہر ایک کی پریشانی کا نام مختلف ہے۔" ساتھ ہی ارفع نے کہا، "میرے پاس میرے نئے منگیتر کی تصویر ہے۔"

سحر نے کہا، "دکھاؤ تو۔"

ارفع نے شان کی تصویر پرس سے نکال کر دکھا دی۔ تصویر دیکھتے ہی سحر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ارفع نے معاملے کو بھانپ لیا اور سحر سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، اس سنڈے کو میری شان کے ساتھ شادی ہے، تم ضرور آنا، یہ شخص مجھ سے شادی نہیں کر رہا بلکہ میرے ساتھ امریکہ جانا چاہتا ہے۔ یقیناً دولت اکٹھی کرنا چاہتا ہے اور میرے حقوق بھی غصب کرنا چاہتا ہے۔ ہم دونوں اس کی خبر لیں گی اور مزہ چکھائیں گی۔"

☆☆☆

پورے ہفتے کے دوران شان نے ارفع سے دو تین بار فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر ارفع نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "شان اب شادی کے دن قریب آ رہے ہیں، ہم دونوں میں دوری ضروری ہے۔"

شان نے سنڈے کو گھر اور محلے کو خوب سجایا اور شام کو دولہا بن کر باراتیوں کے ساتھ دیوان کے گھر پہنچا وہاں مکمل ویرانہ تھا۔ نہ کوئی خیمہ، نہ کرسی اور نہ روشنی۔ دروازے پر ارفع، سحر، دیوان اور چند دیگر لوگ کھڑے تھے۔

شان نے صورت حال دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہوئے ارفع سے کہا۔

"ارفع یہ کیا مذاق ہے اور تم دلہن کیوں نہیں بنیں۔"

ارفع نے جواب دیا۔

"تم خود غرض اور لالچی ہو۔ تم صرف امریکہ جانے کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس مفاد کے تحت تم نے سحر کو ٹھکرا دیا ہے۔ لہذا میں تم جیسے مفاد پرست شخص سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی۔"

☆☆......☆☆

دوسری مرد کہانی

امتحان



بابر نایاب

اُس مرد کی کہانی، جو دنیا میں خیر کا پیامبر تھا مگر......



سرد اور دُھند بھری رات اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی سحر اپنا جلوہ افروز ہونے کی نوید سنانے لگا۔

کالی اندھیری رات نے آخری ہچکی بھری اور مولوی چراغ دین وقت مقررہ پر جاگ اُٹھا۔ چارپائی سے اُٹھ کر مولوی چراغ دین نے نکلنے کے

پانی سے وضو کیا اور پھر مسجد میں جا کر اذان دی۔
مولوی چراغ دین نے دو رکعت سنت ادا کی اور پھر نمازیوں کے آنے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ آج بھی فجر کے وقت صرف دو نمازی ہی مسجد میں آئے تھے۔ ایک نمازی فضل دین تھا جو کہ انتہائی ضعیف آدمی تھا مگر پھر بھی نماز مسجد میں باجماعت ہی ادا کرتا تھا۔ دوسرا نمازی چودھری فلک شیر تھا جو کہ گاؤں کی پنچایت کا سربراہ تھا۔ مولوی چراغ دین نے جماعت کروائی اور پھر سلام پھیرنے کے بعد چودھری فلک شیر سے مخاطب ہوا۔

چودھری صاحب آپ کوشش کیا کریں دو چار نمازیوں کو ساتھ میں لانے کی۔ اتنے بڑے گاؤں میں صرف دو نمازی ہی فجر کی نماز پر آپاتے ہیں۔''

''مولوی صاحب کیا کروں میں تو لوگوں کو بہت کہتا ہوں مگر مجال ہے جو کوئی عمل کرتا ہو مگر اب جب پنچایت لگے گی نا تو سب کو شرم دلاؤں گا۔'' چودھری فلک شیر نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب بات شرم کی نہیں احساس کی ہے خیر یہ تو اللہ کی رضا ہے جسے چاہے توفیق دے، ہمارا کام تو محبت اور تحمل کے ساتھ تبلیغ کرنا ہے۔ اللہ پاک بہتر کرے گا۔'' مولوی چراغ دین نے یہ کہ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کر لیے اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کروائی۔

مولوی چراغ دین نے اسی گاؤں میں آنکھ کھولی تھی مولوی چراغ دین کا والد حاجی غلام دین اسی مسجد کا امام تھا۔ مولوی چراغ دین جب بچپن کی دہلیز پر پہنچا تو والدہ کے انتقال جیسا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ وہ وقت بہت کٹھن تھا جب ماں کی ممتا سے مولوی چراغ دین محروم ہو گیا۔ مگر باپ کی شفقت اور محبت نے مولوی چراغ دین کو ڈولنے نہیں دیا۔ حاجی غلام دین نے بڑی توجہ اور اُنسیت کے ساتھ چراغ دین کی پرورش کی اور اُسے دین کی ایک ایک بات انتہائی باریک بینی سے سمجھائی یہ باپ کی تربیت کا اثر تھا کہ چراغ دین ایک سلجھے ہوئے نیک انسان کے روپ میں ڈھلتا چلا گیا۔ حاجی غلام دین کی زندگی نے بھی زیادہ وفا نہ کی، جب چراغ دین بیسویں سال میں تھا تو حاجی غلام دین نماز ادا کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے آگے پیچھے کوئی خاص رشتے دار تھا نہیں باپ کا سایہ بھی چراغ دین سے اُٹھ گیا۔

مگر اللہ کی رضا پر چراغ دین راضی رہا اور باپ کا خلا بھی چراغ دین کے لیے اذیت ناک تھا یوں چراغ دین کی زندگی غموں سے عبارت رہی مگر چراغ دین نے خندہ پیشانی سے تمام مصائب کا سامنا کیا۔ حاجی غلام دین مرحوم کی نیک نامی کو مدنظر رکھتے ہوئے گاؤں کے لوگوں نے چراغ دین کو بے آسرا نہیں ہونے دیا۔

خصوصی طور پر چودھری فلک شیر نے چراغ دین کا خوب ساتھ دیا اور چراغ دین کو اُسی مسجد کا امام بنا دیا۔ چراغ دین کا کھانا چودھری فلک شیر کے گھر سے آتا تھا اور چراغ دین گاؤں کے بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتا تھا بہت ہی کم وقت میں چراغ دین کی شرافت اور پاکیزگی دیکھ کر گاؤں کے لوگ چراغ دین کی بہت عزت و قدر کرنے لگے بلکہ دین کے مسائل پوچھنے کے لیے مولوی چراغ دین کے پاس آیا کرتے۔ مولوی چراغ دین آسان لفظوں میں شرعی باتیں گاؤں کے لوگوں کو بتایا کرتا اور ساتھ یہ بھی تاکید ضرور کیا کرتا کہ نماز کی طرف آجاؤ کیونکہ یہی ایک رستہ ہے جو کامیابی کی طرف لے جائے گا۔

مولوی چراغ دین مسجد کے ساتھ بنے ہوئے حجرے میں رہتا تھا۔

ابھی تک چراغ دین غیر شادی شدہ تھا۔ آج جب مولوی چراغ دین نے ظہر کی آذان دی تو خلاف معمول بڑی تعداد میں لوگوں کی مسجد میں آمد ہوئی چراغ دین کو بہت خوشی ہوئی، چراغ دین نے دل ہی دل میں رب کائنات کا شکر ادا کیا کہ آج کافی لوگ نماز کے لیے آئے ہیں۔ جماعت کے بعد چراغ دین نے دعا کروائی۔

جب مولوی چراغ دین نے کہا۔ اے اللہ تو ہم سے راضی ہو جا۔ ہمیں اس قابل بنا دے کے تیرے

دربار پر حاضری دے سکیں۔ تجھے سجدہ کر سکیں۔ تیرے پیارے نبی کریم ﷺ کی سچے پکے دل سے اتباع کر سکیں، تُو ہمیں اس قابل کر دے تو ہمیں توفیق دے دے۔'' یہ کہتے ہوئے چراغ دین کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور پھر آمین کہہ کر دعا کو اختتام پذیر کیا۔

چراغ دین کی دعا نے ایک سماں باندھ دیا سنت اور نوافل ادا کرنے کے بعد تمام نمازی باری باری جانے لگے نماز ادا کرنے کے بعد چودھری فلک شیر مولوی چراغ دین کے پاس آیا تب تک چراغ دین بھی نماز ادا کر چکا تھا چودھری فلک شیر نے چراغ دین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ابھی گاؤں میں پنچایت لگ رہی ہے آپ کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ بھی پنچایت میں تشریف لائیے گا۔'' چودھری فلک شیر کی بات سن کر مولوی چراغ دین حیران ہوا اور فلک شیر کو کہا۔

''چودھری صاحب میں پنچایت میں آ کر کیا کروں گا۔''

تب چودھری فلک شیر نے جواب دیا کہ آج ایک ایسی عورت کا مقدمہ ہے جس پر الزام ہے کہ وہ گاؤں میں بدکاری پھیلا رہی ہے لہٰذا اس کا ہم نے فیصلہ کرنا ہے۔ آپ آئیں گے تو فیصلہ کرنے میں آسانی پیش آئی گی۔ تب چراغ دین نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں اللہ نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا۔''

گاؤں کی پنچایت بیٹھ چکی تھی لوگوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا تھا۔ پنچایت کے بڑے، نفاست کے ساتھ لگی ہوئی بڑی بڑی کرسیوں پر براجمان تھے اس پسماندہ گاؤں کے زیادہ فیصلے پنچایت ہی کرتی تھی۔ اکا دکا ہی کیس ہوں گے جن کے فیصلے عدالت میں ہوئے ہوں گے ورنہ یہاں مقامی پولیس کو بھی دخل دینے کی اجازت نہ تھی اور ویسے بھی پولیس یہاں کا رخ بھی نہیں کرتی تھی۔ چودھری فلک شیر کے آنے پر پنچایت کے باقی لوگ کھڑے ہو گئے چودھری فلک

غزل

اس کے سوال کا جواب دینا ہے
بظاہر تو اسے گلاب دینا ہے
ہوس ناچتی ہے شہر بھر میں
آج تحفے میں اک نقاب دینا ہے
اسے دکھانا ہے محبت کا نشہ
اسے بھی اپنا خواب دینا ہے
آج اس کی بھی نیند چرانی ہے
اپنی بھی راتوں کا حساب دینا ہے
اسے بھی ڈوبنا ہے وفا کے سنگ
بدر آج گھڑے کو چناب دینا ہے

شاعر: سید بدر سعید

شیر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا اور مقدمہ شروع ہو گیا۔ ہجوم کے بالکل سامنے ایک عورت کالا برقع اوڑھے کھڑی تھی ساتھ میں اُس کے دو بچے بھی تھے۔ ایک کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ ہو گی دوسرا دس سال کا لگ رہا تھا۔ بچوں کے لباس سے غربت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

چودھری فلک شیر نے کڑک دار آواز میں عورت سے مخاطب ہوا۔

''زبیدہ بی بی تجھ پر الزام ہے تُو نے گاؤں میں بدکاری پھیلائی تم۔ اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتی ہو۔''

فلک شیر کے اس سوال پر زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو کی لڑیاں شروع ہو گئیں چودھری فلک شیر کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک آدمی بولا۔

''بس بس یہ مگر مچھ کے آنسو مت بہاؤ۔ تیرے گھر میں کافی لوگوں نے اجنبی لوگوں کو آتے جاتے دیکھا ہے اب تُو بس اپنی فکر منا۔''

''اس کو سنگسار کر دو۔ مار ڈالو گندی عورت کو۔'' ہجوم میں سے لوگوں نے فقرے کسنے شروع کر دیے۔ تب چودھری فلک شیر نے ہجوم سے کہا۔

''آپ لوگ خاموش ہو جائیں جو بھی فیصلہ ہو گا

وہ گاؤں کی بہتری کے لیے ہوگا۔'' تب ہجوم میں خاموشی چھا گئی۔

''دیکھو زبیدہ تجھ پر جو الزام لگا ہے وہ کسی ایک نے نہیں لگایا بلکہ درجنوں لوگوں نے لگایا ہے اور اتنی بڑی تعداد میں لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے تم اپنی صفائی میں جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔'' تب زبیدہ نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

لوگ ٹھیک کہتے ہیں میں سچ میں ہی ایک طوائف کا روپ دھار چکی ہوں۔ مجھے مار ڈالیں اور میرے بچوں کو بھی مار ڈالیں۔'' یہ کہہ کر زبیدہ اپنے بچوں سے بغل گیر ہو گئی بچے بھی ماں کو دیکھ کر رونے لگ پڑے۔

''یہاں گاؤں کی پنچایت کو موت کے فیصلہ پر اختیار نہیں اور نہ ہی ہم قانون ہاتھ میں لیں گے لیکن تم اپنے اوپر لگنے والے الزام کا اقرار کر رہی ہو فیصلہ تو ہوگا اور تجھے وہ بھگتنا بھی پڑے گا۔'' چودھری فلک شیر نے غصے سے زبیدہ کو کہا۔

پھر چودھری فلک شیر نے ہجوم پر ایک نظر ڈالی اور ایک آدمی کو بلا کر پوچھا۔ ''مولوی چراغ دین صاحب تشریف لے آئے ہیں یا نہیں تب آدمی نے جواب دیا، جی وہ آ چکے ہیں ہجوم کے پیچھے بیٹھے ہیں تب فلک شیر نے کہا، جاؤ اُنھیں بلا لاؤ پھر آدمی چلا گیا اور چراغ دین کو ساتھ لے آیا۔

''مولوی صاحب آپ نے یقینی طور پر ساری باتیں سن لی ہوں گی۔ آپ کی کیا رائے ہے اس حوالے سے۔'' چودھری فلک شیر نے چراغ دین سے پوچھا۔

''ہاں جی میں نے ساری باتیں سن لی ہیں جو الزام اس خاتون پر لگایا گیا وہ بھی اور جو خاتون نے جواب دیا وہ بھی۔'' چراغ دین نے جواب دیا۔

''پھر کیا رائے ہے آپ کی اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ چودھری فلک شیر نے پوچھا۔

وہی سلوک کیا جائے جو انصاف کا تقاضہ ہو ورنہ روز قیامت انصاف نہ کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' چراغ دین نے چودھری فلک شیر کو جواب دیا۔

''مگر کوئی بھی سزا تجویز کرنے سے پہلے آپ نے اس خاتون سے پوچھا ہے کہ اُس نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا۔'' مولوی چراغ دین نے فلک شیر سے سوال کیا۔

''ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں مولوی صاحب کہ اس نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا ہے، ہمیں تو جرم دیکھ کر فیصلہ کرنا ہے۔'' چودھری فلک شیر نے سرد انداز میں جواب دیا۔

پھر معاف فرمایئے گا چودھری صاحب آپ درست فیصلہ نہیں کر رہے آپ کا عدل عدل نہیں۔'' مولوی چراغ دین کے اس سوال پر ہجوم میں ایک سناٹا چھا گیا چودھری فلک شیر کے چہرے پر برہمی کے آثار اُبھر آئے تب فلک شیر نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے زبیدہ سے مخاطب ہوا اور کہا۔

''زبیدہ بی بی بتاؤ تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا۔ تب زبیدہ نے ہجوم کو دیکھا اور پھر چودھری فلک شیر کو درد بھرے انداز میں جواب دیا۔

''جب خاوند کی وفات کے بعد رشتہ داروں نے چند دن بعد حال تک نہ پوچھا، جب میرے بچے بھوک سے تڑپنے لگے جب گھر میں فاقے ہونے لگے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے پر بھی ہاتھ کچھ نہ آیا بلکہ صرف میری جوانی کی قیمت لگی۔ لوگوں کی بھوکی نظروں محلے اور رشتہ داروں کے طنز کے تیروں اور معاشرے کے بھی عزت داروں نے ذلیل پر ذلیل کیا تو میں ذلیل ہونے پر مجبور ہو گئی مگر یہ سب کچھ اپنے بچوں کی بھوک کی خاطر کیا ورنہ مجھے تو بھوکا مرنا منظور تھا۔ یہ ہے میرا جرم اور مجھ پر الزام عائد کرنے والے زیادہ تر وہی ہیں جو رات کے اندھیرے میں میری شرم کو تار تار کرتے رہے۔''

زبیدہ کے اس جواب پر چودھری فلک شیر حیران پریشان ہو گیا اور ہجوم پر بھی خاموشی چھا گئی کافی لوگوں کے سر جھک سے گئے۔

''سن لیا آپ نے اس خاتون کا اقرار جرم اگر یہ مجرم ہے تو اس سے پہلے آپ سب گاؤں والے

مجرم ہیں جنھوں نے اس خاتون کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا مفلسی سے تو ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ نے بھی پناہ مانگی تھی، تنگ دستی اور غربت تو اللہ معاف فرمائے کفر تک لے جاتی ہے آپ کا ہمسایہ بھوکا سوتا رہا اور آپ پیٹ بھر کر کھاتے رہے......
ہمارا پورا گاؤں اس جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اگر اس خاتون کو سزا دینی ہے تو سب پہلے آپ سب اپنے آپ کو سزا دیں۔'' مولوی چراغ دین کی ان باتوں نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''آپ سچ کہتے ہیں مولوی صاحب میں واقعی درست انصاف نہیں کر پایا۔ آج سے میں اس انصاف کی کرسی کا اہل نہیں مگر ذاتی طور پر ایک بات کا ضرور اہل ہوں۔'' یہ کہہ کر چودھری فلک شیر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور زبیدہ کے پاس جا کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''آج سے تم میری بیٹی ہو۔''
یہ سُن کر سب میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی لوگوں نے چودھری صاحب زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ یہ سن کر زبیدہ رونا شروع ہو گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

''چودھری صاحب میں کسی کی بیٹی بننے کے لائق نہیں میں داغدار ہو چکی ہوں۔ آپ کیوں اپنی عزت کو رُسوا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی کر چکی ہوتی۔''

''اللہ پاک جب اپنے کسے بندے پر کرم اور فضل والا معاملہ فرماتے ہیں تو اُس کو یوں نہیں ٹھکراتے۔ چودھری صاحب نے جو عظیم فیصلہ کیا ہے اُسی میں ہی آپ کی اور ہم سب کی بھلائی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے تمہیں تاریکی سے روشنی کی طرف لے جانے والا کرم فرما دیا۔ اب مایوسی والی باتیں مت کرو اور جو مل رہا ہے اُسے قبول کر لو۔'' مولوی چراغ دین نے زبیدہ کو کہا، تب زبیدہ نے سر جھکا لیا اور پھر کہا،

''ٹھیک ہے مگر میں تو ساری زندگی چودھری صاحب پر بوجھ بنی رہوں گی۔ مجھے تو کوئی اپنا بھی نہیں سکتا۔ میرے گناہوں کا بوجھ کون اُٹھا سکتا ہے۔''

تب مولوی چراغ دین نے جواب دیا۔
''ندامت کا ایک آنسو، توبہ کا ایک لفظ انسان کے تمام گناہوں کا مداوا کر سکتا ہے اگر وہ سچے دل سے رب کائنات سے معافی مانگ لے۔ اُس کے حضور پیش ہو کر سچے دل سے توبہ کر لے اللہ پاک بہت رحیم ہے اُس کی رحمت انمول ہے آپ اللہ پاک سے توبہ کریں وہ اپنے بندوں کو ضرور معاف فرما دیتا ہے ایک بار بندہ اُس کے دربار میں پیش ہو کر اُس سے معافی مانگے تو سہی اور میں چودھری فلک شیر کے توسط سے آپ کو نکاح کا پیغام دیتا ہوں۔ اگر آپ رضامند ہیں تو میں فی الفور آپ کو اپنی منکوحہ بنانا چاہتا ہوں۔'' مولوی چراغ دین کی اس بات سے تو گویا ایک دھماکہ سا ہو گیا۔ لوگ حیران ہو کر مولوی چراغ دین کو دیکھنے لگ گئے تب چودھری فلک شیر نے چراغ دین کو خود سے بغل گیر کیا اور زبیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بس اب گھر چلو، میرے ساتھ اب میں تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا۔'' تب زبیدہ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے شروع ہو گئے جو کہ خوشی کے آنسو تھے چودھری فلک شیر زبیدہ کو لے کر گھر چلا گیا اور دوسرے ہی دن سادگی کے ساتھ مولوی چراغ دین کے ساتھ زبیدہ کا نکاح ہوا۔

مولوی چراغ دین نے اُسی رات شکرانے کے نوافل ادا کیے خالق کائنات کا شکر ادا کیا جس نے ایک بڑے امتحان میں چراغ دین کو سُرخرو کر دیا گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں مولوی چراغ دین کی عزت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ زبیدہ مولوی چراغ دین کے نام کے ساتھ منسوب ہو کر شرم و حیا کا ایک پیکر بن گئی۔ زبیدہ گھنٹوں سجدے میں پڑے اللہ پاک کا شکر ادا کرتی رہتی جس نے ایک نئی خوبصورت زندگی بخشی۔ انسان کے گناہوں کی طوالت کتنی بھی ہو مگر رب کریم کی رحمت کی وسعت انسان کے سوچ و خیال سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

☆☆☆

تیسری مرد کہانی

نصیب میں نہیں ہے جو......



مور شاہد حسین

اُس مرد کی کہانی جس کی پہلی محبت ہی زمانے کی دھول بن گئی تھی

میرا نام ساحل عباس ہے۔ میرا تعلق اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر چوتھا ہے۔ ابو ڈرائیور ہیں اور بڑا بھائی سرکاری ملازم ہے۔ میں بھی ایک کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہے۔ ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں پرسکون ماحول ہے۔ ہم سارے بہن بھائی ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اپنی زندگی سے جڑی ایک حقیقی آپ بیتی سناؤں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ان دنوں میں اور پڑوسی دوست فرمان جو اپنے ماموں کے گھر پڑھائی کی غرض سے رہتا تھا۔ اسکول اکٹھے آتے جاتے تھے۔ ہماری دوستی مثالی تھی۔ اسکول کے بعد ہمارا سارا دن گھومنے پھرنے میں گزر جاتا تھا۔ رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر بھی بے دھڑک چلے جاتے تھے کیوں کہ فرمان کا ماموں برسوں سے ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ وہ اچھے مزاج اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔

آٹھویں جماعت کے اگزام دینے کے بعد فرمان چھٹیوں پر اپنے گاؤں چلا گیا۔ جب اس کی واپسی ہوئی وہ ساتھ میں اپنی چھوٹی بہن فرزانہ کو بھی پڑھائی کی غرض سے بہاولپور لے آیا تھا۔ فرزانہ کو پیار سے سب فری بولتے تھے۔ وہ جوانی کی دہلیز کو چھو رہی تھی۔ پانچ فٹ سے نکلتا ہوا قد، تندرست وتوانا جسم، اونچی ناک، کشادہ پیشانی، سیاہ گھنے بال، سفید دانت، گلابی رخسار، مسکراتی آنکھیں، کتابی چہرہ، ہونٹ جیسے پھول کی دو پتیاں رکھ دی گئی ہوں اور ان کے درمیان شیرینی بھر دی گئی ہو۔ اس کی آواز بہت دلکش تھی۔ وہ حسن کی مالک تھی اس کی رسیلی مسکراہٹ اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیتی تھی۔

جب میں نے فرزانہ فری کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس نے مجھے اس طرح گھائل کر دیا تھا کہ خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میرے دل میں ابھرتے جذبات میرے لیے بہت انوکھے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرا دل اس کی طرف کیوں مائل ہوتا جا رہا ہے۔ میں دن بدن اس کی طرف کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش سر اٹھانے لگی کہ میں اسے دیکھوں، اس سے ملوں بات



کروں مگر میں خود کو ملامت کرتا کہ اس کے دل میں میرے لیے ایسا کچھ بھی نہیں ہے تو میرا دل کچھ دن بہل جاتا تھا مگر جب وہ نظر سے گزرتی تھی تو دل میں پھر وہی تماشا شروع ہو جاتا تھا۔ میرا دل اس کے لیے بہت بے چین بے قرار رہنے لگا۔ میں نے کئی بار اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کا سوچا مگر ہمیشہ اس کے سامنے آتے ہی میری ساری ہمت گھو کھلی ہو جاتی تھی پھر میں اگلی بار اظہار کرنے کی خود سے قسمیں کھاتا مگر میں یہ سب دل میں سوچ کر رہ جاتا تھا۔

رات کی تنہائی میں جب میں دنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹتا تو وہ خیال بن کر چھا جاتی تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں اس سے اظہار محبت نہ کر پاتا۔ یوں چھ ماہ گزر گئے۔ میرے دل میں خاموش محبت کے سمندر تھے۔ میں اسے دیکھتے دیکھتے اس پر قربان ہو جاتا تھا۔ اسے دیکھے بغیر میرا دل اداس اداس رہتا تھا۔ میں کسی نہ کسی بہانے ان کے گھر جاتا تھا یوں کسی نہ کسی بہانے اس سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ دل کرتا تھا وہ صرف باتیں کرتی رہے اور میں اس کی خوب صورت آواز سنتا رہوں۔

فرزانہ جب بھی میرے سامنے آتی تھی میں اسے دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ جانے اس میں کون سی کشش تھی کہ میں اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

ایک روز میں نے اس کو خط لکھا جو ایک بچے کے ہاتھوں اس تک پہنچایا تھا۔

دل و جان!

السلام علیکم

جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا میرے دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور تم اس پہلی ہی نظر میں میرے دل میں اتر گئی ہو۔ میرا دل صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے میں تمہیں پہلی نظر میں دل دے بیٹھا ہوں۔ تم میری ہر سوچ اور خیال میں ساتھ ساتھ رہتی ہو۔ میں دل ہی دل میں تمہیں پانے کی خدا سے دعائیں مانگتا ہوں۔ جب میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں تمہارا خوب صورت سا چہرہ میرے سامنے مسکراتا ہے۔ مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ شاید تم میرے خیالات کو نہ سمجھو میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں بس اتنی سی التجا ہے کہ پیار کا جواب پیار سے دینا۔

تمہارے پیار کا طلب گار

ساحل عباسی

فرزانہ فری تک خط پہنچ چکا تھا۔ میں اس کے جوابی محبت نامے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ دو سے تین دن گزر گئے۔ اس کا کوئی جوابی محبت نامہ نہیں ملا۔ میں ڈر کے

مارے ان کے گھر بھی نہیں جار ہا تھا۔ یوں اس دوران میں نے دوسرا محبت نامہ لکھنے کا ارادہ کیا اس میں لکھا تھا۔

دل وجان!
السلام علیکم

میں اس امید سے خط تحریر کرر ہا ہوں کہ تم جواب ضرور دو گی۔ نہ جانے تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو بس جو میرے دل میں ہے سچائی کے ساتھ کہہ دیا آگے تمہاری مرضی ہے۔ میرے بارے میں جو رائے رکھو اگر تم میرے سچے پیار اور محبت پر یقین رکھتی ہو اور مجھ سے محبت کرتی ہو پلیز جواب ضرور دیجیے گا ہاں اگر تمہیں مجھ سے کوئی بھی شکوہ شکایت یا کسی قسم کا اعتراض ہو بے شک بتا دو۔ میں تمہاری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔

جواب کا منتظر
ساحل عباسی

جس دن دوسرا محبت نامہ فرزانہ فری کی نظر سے گزرا اسی دن کی شام کو اس کا جوابی محبت نامہ ملا تھا اس نے لکھا تھا۔

دل وجان!
وعلیکم السلام

میں نے جب تمہیں دیکھا تھا تم بہت اچھے لگے تھے۔ میرے دل میں میٹھا میٹھا درد جاگ اٹھا تھا اور اپنے اندر ایک انجانی سی کسک محسوس ہوئی کہ تم مجھے اچھے کیوں لگتے ہو۔ جب تم میری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہو میں تمہارے ہی خیالوں میں گم ہوتی ہوں اور اداس اداس رہنے لگتی ہوں۔ تمہارا ہی خیال ستاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور میں تمہارے پاس اڑ کر آ جاؤں جب تم میری نظروں کے سامنے ہوتے ہو۔ میں تمہیں ہی دیکھتی رہتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم صرف میرے لیے بنے ہو میں تمہارے ہی سپنے دیکھتی ہوں۔ میری نظر میں تمہارا مقام بہت بلند ہے اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بے پناہ محبت کرتی ہوں۔

تمہاری پیار کی طالب
فرزانہ فری

اس کا جوابی محبت نامہ پڑھ کر میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور خوشی سے آنکھیں پر نم ہوئیں۔

یوں محبت ناموں کے ذریعے ہماری محبت پروان چڑھنے لگی۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہا میں ان کے گھر روز جاتا تھا ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے سرشار ہو جاتے تھے۔

روز بروز ہماری محبت میں شدت آنے لگی تھی اور وقت بھی بتہ تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہم اسکول سے کالج پہنچ چکے تھے۔ پھر ہم کالج ٹائم میں ملاقاتیں کرنے لگے یوں ہماری ملاقاتوں کا بھی سلسلہ چل نکلا۔ ملاقاتیں معمول بن گئی تھیں اس کے علاوہ وہ بہانے بہانے ہمارے گھر کا چکر لگا لیا کرتی تھی یا میں ہی ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ ہم ہر بار ملنے کے نئے نئے بہانے تلاش کرتے تھے۔ ہم جب تک ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے تھے بے چین رہتے تھے۔ جب ہم ملتے تھے ایسے لگتا تھا جیسے یہی زندگی ہے۔ دل کرتا تھا وقت رک جائے اور ہم اس طرح خوشیاں سمیٹتے رہیں ہم ان لمحوں سے لطف اندوز ہوتے تھے ہر موسم بہار بہار لگتا تھا اور دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ جب وہ مجھے اپنی نازک سی باہوں میں لیتی تھی جیسے میرے بدن میں بجلی سی دوڑنے لگتی تھی۔

میں اور فرزانہ فری جب بھی ملتے تھے ہمیں وقت، حالات اور لوگوں کا بالکل احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز ابو اور میرے علاوہ گھر کے سارے افراد ماموں زاد کی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ ابو حسب معمول اپنی گاڑی سے گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ موقع دیکھ کر فرزانہ فری کو اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ہمارے گھر چلی آئی تھی۔

ہم کمرے میں بیٹھے تھے۔ بمشکل پندرہ منٹ گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم بری طرح چونکے خوف سے ہم ایک دوسرے کا چہرہ تک رہے تھے اتنے میں ابو کی آواز ابھری۔

"ساحل بیٹا دروازہ کھولو۔"

ابو کی آواز سنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم دونوں بری طرح کانپ رہے تھے۔ مجھے ہمت

نہیں ہو رہی تھی کہ جا کر دروازہ کھولوں۔ وہ سردیوں کے دن تھے ہمیں پسینے چھوٹ رہے تھے۔ گھر کے تمام گرم بستر پڑے تھے۔ میں نے وہ سارے اس کے اوپر ڈالے وہ بھی ان کے نیچے لیٹ کر چھپ گئی جب مجھے اطمینان ہوا تو میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ابو گاڑی کے ضروری کاغذات بھول گئے تھے وہ لینے آئے تھے جب ابو چلے گئے تو میں نے فرزانہ کے اوپر رکھے بستر اٹھائے تو میرے حواس خطا ہو گئے۔ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر چھینٹے مارے پھر بھی اسے ہوش نہیں آیا۔ میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے میں نے دو ہاتھ اٹھائے اور گڑ گڑا کر دعا مانگی اس کے بعد میں نے چند قرآنی آیات پڑھ کر اس پر دم کیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس کو پانی پلایا جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔

ہمارے وہ دن خوشیوں کے پینڈولے میں جھولتے ہوئے گزرے تھے۔ ہمیں ایسے لگتا تھا جیسے یہی زندگی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ دن بدن ہماری محبت میں شدت آنے لگی۔ ہم راتوں کی تاریکی میں بھی ملتے تھے لیکن ہماری محبت بالکل پاکیزہ تھی۔ ہم نے کبھی بھی برے خیالات سے ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں تھا وہ قسمیں کھا کر اپنی محبت کا یقین دلاتی تھی اکثر کہتی تھی۔

”جان چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے میں صرف تمہاری ہوں اور تمہاری ہی دلہن بنوں گی۔ جب وہ دلبرانہ انداز میں بلاتی تھی میں خوشی سے سرشار ہو جاتا تھا اور اسے گلے لگا کر اپنی محبت کا بھی اظہار کرتا تھا ہم ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔

ایک رات میں اور فرزانہ فری اس کے کمرے میں بیٹھے اپنے اردگرد ماحول سے بے نیاز ہو کر محبت کی میٹھی میٹھی باتوں میں مصروف تھے۔ میں اس کے زانوں پر سر رکھ کے لیٹا ہوا تھا اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اچانک کمرے میں غصے سے بھرپور آواز گونجی۔

”فرزانہ......فری!“ میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ کانپ رہی تھی۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہمارے سامنے اس کی چھوٹی خالہ کھڑی تھی۔ ہم شرم اور خوف سے چور چور تھے مگر خالہ نے تھوڑا برا بھلا کہنے کے بعد کسی کو نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔

میں نے جب فرزانہ فری کے بارے میں اپنے گھر والوں کو بتایا اور اس سے ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا اس بات پر گھر کے بڑوں سے ڈانٹ بھی پڑی تھی مگر پھر خاموش ہو گئی تھی۔ دوسری طرف جب اس کے گھر والوں کو ہماری محبت کا علم ہوا، بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ایک زلزلہ آیا تھا میری اور فرمان کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ فرزانہ فری پر پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ اس کے ابو غصے سے آگ بگولہ ہوئے انہوں نے اپنی بیٹی کو گاؤں بلا لیا۔ اس کو بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ زخموں سے چور ہو کر نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا اور اس کی جلد سے جلد شادی کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور چند ہی دنوں میں اس کے اپنے خالہ زاد سے نکاح کر دیا گیا۔

ان دنوں سے میرے دل ودماغ پر اداسی چھائی رہتی ہے وہ مجھ سے جب سے جدا ہوئی ہے اس کی یادیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ یوں اکیلا ہی نہیں ہونے دیتی ہیں۔ آج بھی اس کی مصیبت میرے حواس پر چھائی رہتی ہے اور اس کی محبت دل میں امڈ آتی ہے۔ کبھی کبھی دل اس سے ملنے کے لیے بے چین بے تاب کر دیتا ہے مگر میں دل کی اس خواہش کو ہمیشہ رو کے رکھتا ہوں کہ کہیں اس کی پرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل نہ مچا دوں۔ بس میں نے قدرت کے فیصلے اور تقدیر کے لکھے کو ہنسی خوشی قبول کر لیا ہے میں اپنے رب کی اس رضا پر بخوشی راضی ہوں۔

فرزانہ فری آج اپنی نئی زندگی میں بہت خوش ہے میں بھی اپنے رب سے گڑگڑا کی خوشیوں کی دعائیں مانگتا ہوں اور میری تمام قارئین سے التماس ہے کہ اس کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذیرے کا سفر کرائے گا۔

(ساتواں حصہ)



"روزی تو ہی آ کر میرا ہاتھ بٹا دے قسم سے جب بھی کچھ بناتی ہوں، اپنی جان پر ہی ظلم کرتی ہوں تم سارے نکمے بس کھانے کے لیے آ جاتے ہو۔" دیگچی میں ڈوئی گھماتے ہوئے چندہ چلا رہی تھی کسی نے چندہ کے چلانے کی پرواہ نہ کی۔ اپنے آپ میں مست رہے۔

چنبیلی قدم قدم چلتی آئی اور صحن کے بیچوں و بیچ کھڑی ہو گئی۔ آمنے سامنے موجود کمروں کے درمیان ٹوٹا پھوٹا صحن اور سامنے موجود باورچی خانے میں سالن میں چمچ ہلاتی چندہ اور کمروں کی کھڑکیوں پر لٹکتے شوخ رنگ کے پردے سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ گئی تھی۔

آنکھیں آنسوؤں سے بلا وجہ بھری جا رہی تھیں، تبھی کمرے سے سیفی نکلا اور چنبیلی کو یوں صحن میں کھڑے دیکھ کر چلا اٹھا۔

"چنبیلی تو! میری بہن......" سیفی کی آواز میں جوش کا عنصر غالب تھا۔ آگے بڑھا اور جھٹ سے چنبیلی کے گلے لگ گیا۔ سیفی کی آواز پورے گھر میں گونجی تھی۔ چولہے کی آنچ دھیمی کرتی چندہ مسکراتے ہوئے باہر آئی۔ کمرے میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف رانی اور روزی نے بھی باہر صحن کا رخ کیا تھا۔

"چنبیلی تجھے دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے، تجھے بتا نہیں سکتے۔ کیسے اچانک ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ قسمت یوں بدلتی ہے۔ سچ بولوں تو اس سے پہلے یقین ہی نہ تھا۔" چندہ گلے لگی تو کتنی دیر ساتھ لگی کھڑی رہی۔

سبھی خوش تھے۔ خوشی ان کے ہر ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

"چنبیلی تو مہمانِ خاص ہے۔" چنبیلی کو کھینچتے ہوئے چارپائی پر بٹھایا۔ "چنبیلی بڑے ٹھیک ٹائم پہ آئی ہے میں نے مغز پکایا ہے۔ مل کر مزے سے کھائیں گے اور تیرے سوا کسی کو نہیں کھلاؤں گی۔ کسی نے میرا ہاتھ نہیں بٹایا۔" چندہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی تبھی رانی کو شک سا ہوا کہ چنبیلی کی خاموشی بھید بھری ہے۔

"چنبیلی خیریت تو ہے۔" رانی نے ابھی آدھے لفظ ہی ادا کیے تھے کہ چنبیلی بلک بلک کر رونے لگی۔

"رانی نے بڑی آپا کا ثبوت دیا سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چنبیلی کا سر اپنے ساتھ لگا کر آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگی۔ چنبیلی روتی رہی، روتی رہی۔ رانی نرمی سے چنبیلی کے بال سہلاتی رہی۔

تمام نفوس کے ذہن میں موجود سوال تحلیل ہونے لگے تھے۔ چنبیلی کا یوں بلک بلک کر رونا وضاحت کر رہا تھا کہ وہ مہمان بن کر نہیں آئی۔ کسی کو کچھ کہنے یا بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی عقدہ آپ ہی کھل گیا تھا۔ چنبیلی لوٹ آئی تھی۔

☆......☆......☆

وقت کے پاؤں بھی کبھی رکے ہیں۔ وہ تو اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ دن گزرتے گئے، زوار کو عدم سدھارے دن مہینوں میں بدلنے لگے۔ چنبیلی کہاں گئی؟ یہ سوال کسی نے نہ اٹھایا جیسے سبھی چاہتے ہی یہی تھے کہ چنبیلی کو چلے جانا چاہیے۔ ایک اسفر کا دل تھا جو بے چین ہوا۔ آخر سوتی مرحوم باپ کی محبوب بیٹی تھی۔ اور اب شائد اسفر کی ذمہ داری بھی۔

"رہنے دو اسفر، گڑے مردے مت اکھاڑو۔" اسفر نے فاخرہ سے چنبیلی کا ذکر کیا تھا تو فاخرہ نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔ اور اسفر مزید کچھ کہہ سکا اور نہ کچھ کر سکا۔

سدرہ کے رشتہ ٹوٹنے کی خبر بھی خاص و عام تک پہنچ چکی تھی۔ زوار کے چالیسویں پر صفدر آئے تو کئی باتوں کے درمیان انہوں نے فاخرہ سے یہ بھی کہا۔

"بھابی میرا احمد سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ احمد اور سدرہ کی جوڑی چاند سورج کی ہی جوڑی ہوگی۔" فاخرہ نے دیور کو کوئی جواب تو نہ دیا البتہ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

ساتھ بیٹھی ہوئی راشدہ کا دل بھی عجب لے
میں دھڑکا تھا دل تو چاہا تھا۔ اسفر کے لیے اپنی خولہ
کا بھی تذکرہ کردیں مگر وضع داری مانع آ گئی۔

بی اے کا رزلٹ آ گیا اور سی ایس ایس کا
تحریری امتحان بھی قریب آ چکا تھا۔ اسفر نے غمگین
دل کو سنبھالتے ہوئے توجہ پڑھائی کی طرف
مبذول کی اور شب و روز پڑھائی کو دینے لگا۔

انہی دنوں دعا نے باقاعدگی سے چکر لگانے
شروع کر دیے۔ کتابیں ساتھ لاتی اور جہاں اسفر
بیٹھا پڑھ رہا ہوتا وہاں کتاب کھول کر پڑھنے لگ
جاتی۔ رفتہ رفتہ ہال کمرے میں پڑا صوفہ مخصوص
ہو گیا۔ ایک روٹین ہی بن گئی۔ دعا دس بجے صبح تک
آ جاتی اور شام چھ بجے تک دونوں کزنز اکٹھے مل کر
پڑھتے دوپہر کا کھانا بھی ساتھ کھاتے۔ شام کو حنان
یا فرقان لینے آتے اور دعا چلی جاتی۔

اسفر کی اچھی تیاری تھی۔ اسفر پرامید تھا اور دعا
، دعا کو تھی کہ اس بار ہاں اس بار اسفر کو کامیابی ملنی
چاہیے۔ اسی لیے تو وہ ان چیزوں پر گھنٹوں صرف
کرتی، خوب ڈسکشن کرتی جو اسفر کی کمزور ہوتیں۔

ہر روز واپس اپنے گھر جاتے ہوئے دعا کو
محسوس ہوتا اس کے دل میں اسفر کی محبت بڑھ رہی
ہے اور وہ روزانہ جانے سے پہلے کہتی۔

''اسفر میں تم سے بے حساب محبت کرتی
ہوں۔'' اسفر سے نہیں کہتی تھی، خود سے کہتی تھی دل
میں۔

وقت سرک رہا تھا، سرکتا گیا یہاں تک کہ سی
ایس ایس کا تحریری امتحان بھی آ گیا۔

☆......☆......☆

سی ایس ایس کا امتحان ملک بھر سے ذہین و
فطین لوگوں کی ایک بڑی تعداد دیتی ہے۔ کیا
ڈاکٹرز، کیا انجینئرز، کیا وکلاء اس دوڑ میں بھی
شامل ہوتے ہیں۔ اتنے سارے ذہین و فطین
لوگوں کی موجودگی میں اسفر جیسے متوسط صلاحیتوں
والے لڑکے کو بھلا کہاں کامیابی نصیب ہونی تھی۔

اسفر نے انتھک محنت کی تھی دعا نے بھی بھرپور
کوشش کی تھی کہ کہیں کمی نہ رہ جائے اور اسفر نے
محض اپنی محنت پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ دعاؤں پر بھی
بھروسہ کیا تھا۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کر
دی تھی۔ ہر نماز کے بعد لمبی لمبی دعائیں مانگی تھیں۔
راتوں کو اٹھ اٹھ کر سجدے کیے تھے اور خدا سے
صرف ایک ہی چیز مانگی تھی۔

کامیابی۔

مگر کامیابی نصیب میں نہیں تھی۔

نتیجہ آیا دعا امتیازی پوزیشن سے پاس تھی اور
اسفر ناکام تھا۔ وہ تحریری امتحان ہی پاس نہ کر پایا
تھا۔

دکھ کا ایک گہرا سمندر تھا جس میں اسفر غوطے
لگا رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ زندگی شاید
ناکامیوں کا منہ دیکھنے کے لیے ہی بنی تھی۔ ناکامی
ایک ایسا زہر ہے جس کا تریاق نہیں ہوتا۔

دعا کو اپنی کامیابی کی اتنی خوشی نہ ہوئی جتنی
اسفر کی ناکامی کا دکھ ہوا۔ اسفر اس سے الگ تھوڑی
تھا۔ کاش کہ اسفر کامیاب ہو جاتا یا پھر وہ ہی ناکام
ہو جاتی۔ سوچیں تھیں کہ لامحدود اور ہر سوچ کے
پیچھے ایک کسک چھپی تھی۔ بہرحال انسان سے زیادہ
بے بس کوئی اور مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔ دل میں بارہا
بار خواہش جاگی اسفر سے رابطہ کرے۔ فون پر ہی
سہی مگر ہمت نہ ہوئی۔

صاعقہ بے انتہا خوش تھی۔ سی ایس ایس کا
امتحان پاس کرنا معمولی بات تو نہ تھی۔ انٹرویو اور
انٹرویو کے بعد ٹریننگ وہ وقت دور نہ تھا جب ان
کی بیٹی افسر ہوتی۔ خوشی ان کے ہر ہر انداز سے
چھلکتی تھی۔

خوب سارا وقت صرف کر کے انہوں نے
بادام کی تہہ در تہہ پرتوں والا کیک بنایا۔ چکن جنجر
دعا کی پسندیدہ ڈش تھی وہ بھی خوب لگن سے بنائی،
فرقان، حنان اور والد صاحب بیش قیمت تحائف
لیے دعا کے منتظر تھے۔ Princess of
the day جب کمرے میں داخل ہوئی تو اس
کے چہرے پر خوشی کی وہ رمق نہ تھی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' گھر کے تمام افراد سیلیبریشن کے لیے کمرے میں جمع تھے جب حنان نے پوچھا تھا۔

''ہوں وہ سر میں شدید درد ہے'' دعا کو بروقت بہانہ سوجھا اور چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''ڈاکٹر کے پاس چلیں۔'' حنان بہن کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے اسی وقت تیار ہو گیا۔

''نہیں، پین کلر لی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ سوری میں آج یہاں زیادہ وقت نہیں بیٹھ پاؤں گی۔'' دعا لب کچلتی کہہ رہی تھی۔ صاعقہ نے دھیان سے بیٹی کو دیکھا تھا۔ وہ درد سے کم اور دکھ سے بے حال زیادہ نظر آتی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔ کیک کاٹ لو، پھر چلی جانا، لیکن ہم لوگ تو تمہاری کامیابی کا جشن منائیں گے ایسے مواقع روز روز تھوڑی آتے ہیں۔'' فرقان نے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے کیک بہن کی طرف سرکایا تھا۔

''ضرور'' کیک کاٹتے ہوئے بھی دعا کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ ہی تھی۔

☆......☆......☆

''دل چھوٹا مت کرو اسفر یہ سب شاید تمہارے نصیب میں نہیں تھا۔'' فاخرہ کو بیٹے کی ناکامی کا دکھ تو ہوا۔ دل میں قلق بھی جاگا۔ لیکن بیٹے کو اس نے دلاسے بھی دیے۔ بہر حال اب دلاسوں کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ یوں بھی زوار کی وفات کے بعد فاخرہ کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔

اسفر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''زندگی گزارنے کا سامان تو کرنا پڑے گا۔ سب کچھ ویسا ہوتا جیسے انسان کی خواہش ہوتی تو انسان خود کو خدا سمجھنے لگ جاتا۔'' اسفر کے ساتھ ساتھ فاخرہ یہ باتیں خود کو بھی باور کروا رہی تھیں۔

''میری سرکاری ٹیچر کی سیٹ تو ہے ہی۔ وہ تمہیں منتقل کروا دیتی ہوں۔ میرے ریٹائرمنٹ کا سال بھی تو بس آ ہی چکا ہے۔ ٹیچنگ برا پروفیشن نہیں دنیا کے بہترین پروفیشنز میں مانا جاتا ہے۔''

اسفر ہنوز سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''تم ایم اے، ایم ایڈ کر لو تب تک سیٹ تمہیں منتقل ہو جائے گی ایم اے کون سا مشکل ہوتا ہے۔ اگر تمہیں مناسب لگے تو ساتھ ساتھ دکان پر بھی چلے جاؤ۔ زوار کے جانے کے بعد دکان بند ہی پڑی ہے۔ دکان میں کچھ اور سامان ڈلوا لیتے ہیں۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت آمدنی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ پڑھائی کے ساتھ دکان دیکھ لیا کرو گے؟'' فاخرہ بیٹے پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ مگر چارہ بھی نہ تھا۔ مشکل وقت کے لیے کی گئی بچتیں لگ بھگ ختم ہو گئی تھیں۔

''اگر دوہری ذمہ داری نہ ادا کر سکو تو کوئی بات نہیں۔ ابھی ایم اے تو کرو دکان کو اور میں۔۔۔۔'' فاخرہ کی بات درمیان میں رہ گئی اور اسفر بول پڑا۔

''نہیں امی، کسی قسم کا بوجھ نہ ہوگا'' میں دونوں کام بآسانی کر لوں گا۔'' وہ لڑکا جو ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ سرکاری افسر لگنا چاہتا تھا اس کے نصیب میں موبائل اسسریز اور ایزی لوڈ کی دکان ہی تھی۔

فاخرہ نے کچھ پیسوں سے دکان میں مزید سامان ڈلوا دیا۔ اور اسفر دکان میں اس سیٹ پر بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کرنے لگا جس سیٹ پر کبھی زوار بیٹھا کرتے تھے۔

''یہاں پر تمام کمپنیوں کے ایزی لوڈ دستیاب ہیں۔'' چارٹ پر لکھے خوشخط الفاظ کو بے خیالی سے دیکھتا رہتا۔

یم اے کی کتابیں اس نے خرید لی تھیں۔ کبھی کبھار کتاب لے کر دکان پر جاتا۔ لیکن ابھی تک کتاب کھول کر نہ دیکھی تھی۔ پڑھائی سے جیسے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

یہی تو وقت تھا حالِ دل بتانے کا۔

''اسفر مجھے تم سے خاص کام ہے، میں کل تم لوگوں کی طرف آؤں گی۔'' دعا نے سونے سے پہلے اسفر کو پیغام بھیجا تھا اور موبائل میں موجود اسفر کی ایک تصویر زوم کر کے دیکھنے لگی تھی یہ عام سے حلیے میں بنائی گئی اسفر کی تصویر تھی، ان دنوں کی تھی جب وہ سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔

سرخ گول گلے والی ٹی شرٹ میں سر کتاب پر جھکائے، چہرے پر سنجیدگی، بکھرے ہوئے بال۔

اسفر کے بال گھنے تھے، اس قدر گھنے کے کوئی ہیئر اسٹائل جم ہی نہ پاتا تھا اور بال اکثر و بیشتر یونہی پیشانی پر بکھرے پڑے ہوتے۔

موبائل کو بیڈ کی سائڈ پر رکھنے کے بعد دعا نے کمبل تانا، کروٹ بدلی اور مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔

''اسفر ضرور حیران ہوگا۔ کیا پتا وہ واقف ہی ہو اور کیا پتا ایسے ہی جذبات اس کے دل میں بھی ہوں۔ آخر کمی کیا ہے مجھ میں۔'' دل معصوم خوبصورت سے خوبصورت سوچ بنتا رہا۔ ہونٹوں پر الوہی مسکراہٹ چھائی رہی اور یونہی دعا نیند کی وادیوں میں کھوگئی۔

صبح تیار ہونے کے لیے وہ لباس منتخب نہ کر پار ہی تھی۔ جو سوٹ پسند آتا وہ اوور لگتا بھلا وہ کسی تقریب پر تھوڑی جا رہی تھی اور سادہ جوڑوں پر دل مطمئن نہ ہوتا۔ بالآخر گلابی رنگ کا چنٹوں والا فراک پسند آ ہی گیا۔ نہ بہت سادہ تھا اور نہ ہی بہت کام دار۔ سوٹ زیب تن کرنے کے بعد وہ اس شش و پنج میں مبتلا ہوگئی کہ بالوں کا جوڑا باندھے یا یونہی کھلے چھوڑے۔ بالآخر کھلے بال چھوڑنے پر دل آمادہ ہوا۔ ہاتھوں میں مصنوعی موتیوں والی بریسلٹ باندھی۔ گلے میں زمرد کے پتھر والا لاکٹ۔ اب کانوں میں کیا سوٹ کرے گا؟ یہ نہیں، یہ بھی نہیں، یہ تو بالکل نہیں۔ کئی چیزیں مسترد ہوئیں تو گول کٹوروں والے جھمکے منتخب ہوئے۔

ہلکے رنگ کی لپ اسٹک، تھوڑا سا بلش آن اور آنکھوں میں کاجل بھی ڈال لیا۔ پیروں کو کھسوں میں مقید کیا۔ خوشبو کا انتخاب کرتے ہوئے بھی وہ کئی لمحے سوچتی رہی اور بالآخر ہیوگو باس منظور نظر ٹھہری۔ مکمل تیاری کے بعد اس نے خود کو دیکھا تو بھی مطمئن نہ ہوئی۔

دل دھڑک رہا تھا، دعا نے دھڑکنے دیا۔

تبھی صاعقہ کمرے میں آئی۔ بہن سے ملنے کی نیت سے وہ بھی بیٹی کے ساتھ فاخرہ کے گھر جا رہی تھی۔

''ماشاءاللہ میری بیٹی پرستان کی شہزادی سے کم خوبصورت نہیں لگ رہی۔ میں اپنی نظر نہ لگا دوں۔'' صاعقہ نے مسکراتے ہوئے نظر ہٹائی مبادا نظر لگ ہی نہ جائے۔ دعا جھینپ گئی۔

''امی زیادہ اوور تو نہیں لگ رہی۔'' دعا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں بالکل نہیں۔ میری بیٹی اب تو یوں بھی افسر لگنے والی ہے اب تو تمہیں ہر وقت ایسے سج دھج کر ہی رہنا چاہیے۔'' صاعقہ قریب آئی اور بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ اور جب دعا گاڑی میں ماں کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اسفر کی طرف جا رہی تھی تب صاعقہ نے اسے بتایا تھا۔

''تبریز کو تو تم جانتی ہو، فورتھ فلور میں رہنے والے پاشا صاحب کا بیٹا۔'' گاڑی چلاتے ہوئے صاعقہ کی نگاہیں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہی تھیں۔

''جی'' دعا کا انداز سرسری تھا۔ وہ جن خیالوں میں کھوتی تھی وہ دلربا سے تھے۔

''چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ الائیڈ بینک کی مین برانچ میں منیجر ہے، فرمانبردار لڑکا ہے، جب بھی اس سے ملاقات ہوئی ہمیشہ ادب سے ملا ہے۔''

صاعقہ نے ایک جانچتی نظر بیٹی پر ڈالی تھی اور پھر سے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی تھیں۔ دعا کے لیے یہ ان سنا ہی تھا وہ اسفر کو سوچ گئی۔

''کل پاشا صاحب نے تمہارے ابو سے کہا

ہے۔ اگر ہم رضامندی دیں تو وہ تبریز کا رشتہ لے کر آئیں۔'' دعا خیالوں سے چونکی تھی۔ دفعتاً رخ موڑ کر ماں کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں سراسیمگی تھی۔ چند لمحے ماں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ ماں جو سہیلی بھی تھی۔ تب دعا نے خود کو سنبھالا تھا اور جھجکتے ہوئے ماں کو دھیمی آواز میں بتایا تھا۔

''امی میں اور اسفر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' اسفر سے متعلق مبالغہ کرتے وہ بالکل نہ جھجکی تھی۔

اور صاعقہ کے لبوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ آگئی۔

بیٹی کے جذبات سے تو وہ سالوں سے واقف تھیں لیکن اب انہیں لگتا تھا کہ اسفر جیسا ناکام لڑکا ان کی بیٹی کے لیے موزوں نہیں لیکن خیر۔۔۔۔

جانتی تھیں دعا اس موڑ پر ہے جہاں سمجھنا سمجھانا بے کار ہوتا ہے۔ اسی لیے سر ہلا کر کہنے لگیں۔

''بڑی اچھی بات ہے۔ اسفر تو گھر کا لڑکا ہے، اور یہ سلسلہ کب سے ہے؟ کبھی بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' صاعقہ چھیڑ رہی تھیں اور دعا مسکراتے شرماتے چہرے پر آئی آوارہ لٹ کر کو کان کے پیچھے اڑسنے لگی۔

☆......☆......☆

آج جمعہ تھا اور جیسا کہ زوار کا معمول تھا کہ جمعے کے دن دکان شام کو دو تین گھنٹوں کے لیے کھولتے اسی طرح اسفر نے بھی یہ معمول جاری رکھا۔

طبیعت پر کسلمندی چھائی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ ٹی وی چلا کر صبح کے ٹائم آنے والا کوئی دینی شو دیکھنے لگا۔ سدرہ کالج جا چکی تھی۔ فاخرہ کی طبیعت ناساز تھی سو آج اس نے چھٹی کی تھی۔

موبائل کے ان باکس میں دعا کا رات ساڑھے گیارہ بجے آنے والا میسج تھا۔

''جانے اس کو کیا کام ہوگا؟'' اسفر کندھے اچکا کر پروگرام دیکھنے لگا۔

گھنٹے بھر تک صاعقہ اور دعا آگئے۔ صاعقہ دانستہ فاخرہ کو دوسرے کمرے میں لے گئی کہ بچوں کو تنہائی میسر آئے۔

''تم لوگ ہماری طرف سے جانے کے بعد کسی شادی پر جا رہے ہو۔'' اسفر نے ٹی وی بند کرنے کے بعد دعا کے سراپے پر نظر ڈالی تھی۔

''دعا کی مسکراہٹ مدھم ہوتے ہوتے غائب ہوگئی۔

''نہیں، کیا اوور ڈریسنگ کی ہوئی ہے؟'' دعا کا دل بجھ سا گیا۔ اسفر نے یہ نہ دیکھا تھا وہ کس قدر خوبصورت لگ رہی ہے۔ بس یہی دیکھا تھا کہ وہ کس قدر تیار ہے۔

''نہیں بہت زیادہ نہیں۔'' اسفر نے دل رکھنے کو کہا تھا۔

دوسرے کمرے میں بیٹھی صاعقہ اور فاخرہ بھی محوِ گفتگو تھیں۔

''فاخرہ اپنا خیال رکھا کرو، زوار کے جانے کے بعد تم کچھ زیادہ بیمار رہنے لگی ہو۔''

فاخرہ ہنس دیں۔

''آپا بوڑھی بھی تو ہوگئی ہوں۔''

''جانے دو، مجھ سے چھوٹی ہی ہو، اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے سدرہ کے لیے اپنے دیور کو ہاں کر دی؟''

صاعقہ رفتہ رفتہ گفتگو مطلوبہ موڑ پر لانا چاہ رہی تھیں۔

''ہاں آپا، اپنے لوگ، سلجھا ہوا لڑکا اور کیا چاہیے۔ پچھلا تجربہ بھی تلخ تھا۔ بس اکلوتی بیٹی کو دوسرے شہر بھیجنا پڑے گا۔ اس لیے دل تھوڑا اداس ہے۔''

''اور اسفر؟ اس کے لیے کیا سوچا؟؟''

''اسفر تو لڑکا ہے۔ تھوڑا اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔'' فاخرہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی اور مزید بولی تھیں۔

''کتنی خواہش تھی کہ اسفر بھی زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر پائے مگر نصیب تو اپنا اپنا ہوتا ہے۔'' فاخرہ کا لہجہ افسوس میں گھلا ہوا تھا۔ صاعقہ کچھ دیر خاموشی سے بہن کو دیکھتی رہیں۔ خود سے کہنا کچھ

غیر مناسب تو تھا مگر بہن ہی تھی اب بہن سے کیا میں کیا تو۔

''اسفر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اگر تمہیں مناسب لگے تو۔۔۔۔'' پوری بات کہنے کے لیے صاعقہ کو مناسب لفظ نہ ملے۔

فاخرہ بے یقینی سے بہن کو دیکھے گئیں۔

''آپا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔'' فاخرہ کا لہجہ کھلنے لگا تھا۔

دوسری طرف اسفر دعا کے یوں شرمانے ہچکچانے سے بیزار ہونے لگا تھا۔

''ہاں دعا، اب بتا بھی تو مجھ سے تمہیں کیا کام تھا۔''

دعا توقف سے بیٹھی رہی۔

''ابھی تم نے مراقبہ کرنا ہے تو میں چینج کر آتا ہوں۔'' تم اتنی تیار بیٹھی ہو، مجھے اپنا عام حلیہ مزید عام لگ رہا ہے۔'' اسفر ابھی تک رات والے ٹراؤزر شرٹ میں تھا۔ اسفر اٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ دعا کی آواز نے اسفر کے پاؤں جکڑ لیے۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' اسفر ٹھٹھک کر رک گیا۔ مڑ کر دعا کو دیکھا اور چند ثانیے یونہی دعا کو دیکھتا رہا دعا یوں سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے محبت نہیں جرم کا اعتراف کیا ہو۔ کمرے میں بوجھل سی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ اس خاموشی کو اسفر کی آواز نے توڑا تھا۔

''اچھا مذاق تھا، مگر مجھے ایسے مذاق پسند نہیں میں کبھی تم سے شادی نہیں کروں گا۔'' اسفر کا لہجہ بے لچک اور قطعی تھا۔ دعا نے سر اٹھا کر اسفر کو تحیر سے دیکھا تھا جو کمرے کا دروازہ پار کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

محبت انسان کو برباد کرتی تھی، کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔

دنوں میں دعا کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ آنکھیں جیسے اندر ہی دھنس گئی تھیں۔

''کیا ہوا دعا؟'' صاعقہ محبت سے بیٹی کا سر سہلاتی، دعا خالی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگ جاتی۔

''امی اسفر مان ہی نہیں رہا۔'' دعا کے لہجے میں مایوسی چھپی ہوتی۔

''مان جائے گا، کیوں نہیں مانے گا۔'' صاعقہ تسلی دیتیں۔ دعا کی نظروں کا خالی پن جوں کا توں رہتا۔

دعا نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی مگر اسفر کا رویہ ویسا ہی رہا کٹھور سا۔ اس دن تو دعا دکان پر ہی اسفر سے ملنے چلی آئی۔

عام دنوں میں دعا خود گاڑی ڈرائیو نہیں کرتی تھی۔ زیادہ اچھی ڈرائیور نہ تھی مگر یہ عام دن نہیں چل رہے تھے۔

گاہکوں کا انتظار کرتا اسفر وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پر وقت گزرتا ہی نہ تھا۔ تبھی ایک گاڑی دکان کے سامنے رکی اور دعا گاڑی سے اتری۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اسفر اچنبھے سے دعا کو دیکھنے لگا۔

''دعا خیریت تو ہے۔'' حسرت تو دعا کے چہرے پر کنداں تھی جسے اسفر نظر انداز کر گیا تھا دعا چند لمحے یاس و آس کی کیفیت میں اسفر کا چہرہ تکتی رہی۔

''اسفر میں تم سے بے حساب محبت کرتی ہوں۔'' دعا کاؤنٹر کے سامنے کھڑی تھی اسفر سیٹ پر بیٹھا دعا کو دیکھے گیا۔

''تو؟؟'' اسفر کا لہجہ سرد تھا۔

''تو'' دعا نے بے یقینی سے لفظ دہرایا تھا اور رونے لگی تھی۔ اسفر سپاٹ تاثرات سے دعا کو روتا دیکھتا رہا۔

''آؤ ادھر بیٹھو'' اسفر نے اشارہ کیا تو دعا کاؤنٹر کے پار پڑے ڈیسک پر بیٹھ گئی۔

''یوں تو تمہارا اس طرح دکان پر بیٹھنا مناسب نہیں۔ لوگ دیکھیں گے تو غلط گمان ہی کریں گے۔'' اسفر نے نچلا لب دبایا تھا۔

دعا کہاں اس مقام پر تھی کہ مناسب نامناسب

کا خیال رکھتی۔ اس کے تو بس میں نہ تھا۔ سسکیاں لیتی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"دعا تم بھی کس جھمیلے میں پڑ گئی ہو، آرام سے انٹرویو پاس کرو۔ ٹریننگ کا سال گزارو اور اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہو جاؤ تبریز کے ساتھ تمہاری جوڑی اچھی بھی لگے گی۔" اسفر نے ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کیے تھے۔ اب جب یہ باتیں کھلم کھلا گفتگو کا حصہ بن رہی تھی تو تبریز کے رشتے سے متعلق اسفر کو پتا ہونا کچھ عجب نہ تھا۔

دعا کے پاس جواباً کہنے کے لیے بس یہی تھا۔

"اسفر میں تم سے بے حساب پیار کرتی ہوں۔"

"بے حساب، ہونہہ۔۔۔۔۔" اسفر سر جھٹک کر رہ گیا اور کڑوے لہجے میں گویا ہوا۔

"دعا میں نے ہمیشہ اپنے آس پاس عورتوں کو غالب دیکھا۔ میرے گھر کی سربراہ امی تھیں۔ ہر بات میں ان کے فیصلے مقدم ہوتے، سدرہ کو مجھ پر فوقیت دی جاتی تھیں، دی جاتی ہے اور غالباً دی جاتی رہے گی۔ اب میں بیوی بھی ایسی لے آؤں جو مجھ سے برتر ہو، جس کے سامنے میں سر اٹھا کر بات نہ کر سکوں تو تف ہے ایسی زندگی پر۔۔۔۔" اسفر کے لہجے میں تنفر تھا۔

"میں انٹرویو نہیں دوں گی، نہ ہی مجھ افسر لگنا ہے میں ہاؤس وائف بن کر رہوں گی۔" محبت برباد کر رہی تھی، دعا برباد ہو رہی تھی۔

اسفر استہزائیہ ہنسی ہنسنے لگا۔

"تحریری امتحان تم نے اس لیے پاس کیا تھا"

"میں چھوڑ تو رہی ہوں" دعا کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ اپنی انا کو پسِ پشت ڈالے وہ یہ سب باتیں کر رہی تھی۔

تلخ تاثرات چہرے پر سجائے، اسفر دعا کو دیکھتا رہا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ اس خاموشی میں ایک اسرار تھا۔ پھر اسفر گویا ہوا۔

"دعا تمہاری جوتی کا نمبر کیا ہے؟"

"سات، کیوں؟" دعا کو سمجھ نہ آیا کہ یہ پوچھنے کا مقصد کیا ہے۔

"ٹھیک" اسفر کچھ سوچتے ہوئے سر ہلانے لگا۔

"میں ایک شرط پر تم سے شادی کروں گا۔" اسفر کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ نظریں دعا پر جمی تھیں۔ دعا کے دل کو ڈھارس ہوئی۔

"تم اپنے جوتے سے میرا چہرہ ناپو گی، اور بتاؤ گی کہ میرا چہرہ کتنے انچ کا ہے۔ بھرے بازار میں ابھی ناپ لو میں ابھی ہاں کہے دیتا ہوں۔" اسفر کے چہرے پر پتھروں سی سختی تھی۔ چہرہ سنگ کا تراشا ہی محسوس ہوتا تھا۔

دعا بنا پلکیں جھپکائے اسفر کو دیکھے گئی۔

یہ اس کا محبوب کیا کہہ رہا تھا؟

☆......☆......☆

خولہ کے والد کے انتقال کی خبر آئی تو فاخرہ تعزیت کے لیے بچوں سمیت گاؤں گئیں۔ زوار کی زندگی میں تو وہ راشدہ کو غیر ضروری رشتہ دار گردانتی تھیں مگر زوار کی ناگہانی موت نے اس پر سوچ کے کئی در وا کیے تھے۔ کچھ شوہر مرحوم سے شرمندہ بھی تھیں۔

کئی برسوں بعد فاخرہ کا گاؤں آنا ہوا تھا۔ اگر گزرے سالوں میں شہر کا رنگ ڈھنگ بدلا تھا تو گاؤں میں بھی کئی تبدیلیاں آئی تھیں۔

کچی گلیوں کی جگہ پکے گلیارے تھے۔ گھر بھی پختہ سیمنٹ کے اور بیشتر رنگ روغن شدہ تھے۔ شاذ و نادر ہی دیواروں پر اپلے تھپے نظر آرہے تھے۔

بیوگی کا غم چھوٹا نہیں ہوتا۔ زوار سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باوجود فاخرہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھیں۔ راشدہ اور اس کے خاوند کی محبت اور ذہنی ہم آہنگی کے قصے تو وہ جوانی سے سن رہی تھیں۔

"صبر راشدہ، اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" رنجیدہ سی راشدہ کو فاخرہ تسلی دے رہی تھی۔ گاؤں میں شہروں کی طرح میت کے دفنانے اور چاولوں کی خیرات کے بعد سوگ ختم نہیں کر دیا جاتا

تھا۔ شرعی طریقہ کار کے مطابق سوگ کے تین دن گزارے جاتے۔ مگر ان لوگوں نے ایک رات ہی قیام کیا اور اگلے دن واپسی کے لیے روانہ ہونے لگے۔

اسفر نے یہ وقت ذیشان کے ساتھ ہی گزارا تھا۔ واپسی سے پہلے اس سوچ کے ساتھ کہ پھوپو سے تعزیت کرلوں ذیشان سے کہا کہ اندر پردہ کرائے تاکہ وہ راشدہ سے مل سکے۔

ذیشان نے پردے کا اہتمام کرا کے ملاقات کا انتظام کرالیا۔ دفنایا تو کل ہی جاچکا تھا۔ مگر راشدہ کی آنکھیں ابھی بھی نم تھیں۔

اسفر کچھ دیر پھوپو کے ساتھ بیٹھا رہا، چاہنے کے باوجود تعزیت یا ہمدردی کے کوئی کلمات نہ کہہ سکا اور جب ساتھ بیٹھی فاخرہ کو اندازہ ہوا ان کا بو بیٹا کچھ نہ کہے گا تو بولیں ''چلو راشدہ، اللہ زندگی آسان فرمائے۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' فاخرہ کے ساتھ سدرہ بھی کھڑی ہوئی۔ راشدہ سے گلے لگنے کے بعد فاخرہ ساتھ بیٹھی خولہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

سفید ململ کا دوپٹا ٹکائے خولہ سسکیاں لے رہی تھیں۔

''صبر بیٹا'' جب فاخرہ خولہ کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں تب اسفر نے غیر ارادی طور پر خولہ کو دیکھا۔ ان چند لمحوں کی غیر ارادی نظر میں دھیان بھی آن گھسا اور اسفر نے بے اختیار نظریں چرائیں۔

واپسی کا سارا راستہ اسفر چپ رہا، خولہ کا سراپا سامنے لہراتا۔ بچپن سے لے کر اب تک خولہ سے ہونے والی وہ تمام ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔ جو تعداد میں شاید ہاتھوں کی انگلیوں جتنی تھیں اور ان ملاقاتوں میں یاد کرنے والی کوئی بات بھی نہ تھی۔ ارادی طور پر اسفر نے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول تو کی۔ مگر اگلے چند دن وہ ایک الگ نہج پر سوچتا رہا۔

خولہ خوب سیرت تھی، زبان دراز نہ لگتی، سیدھی سادھی، اسفر سے کم پڑھی لکھی تھی۔ اسفر کی عزت کرتی۔ اس کے اوپر حاکم بن کر نہ بیٹھتی۔ اسفر نے ہر پہلو پر سوچا۔ ایک بار نہیں سوچا بار بار سوچا۔ فیصلے پر پہنچنے میں اسے ایک ہفتہ لگ گیا۔

ایک ہفتے بعد جب فاخرہ کو گرمیوں کی چھٹیاں مل چکیں اور وہ پہلی چھٹی فرصت سے گزار رہی تھیں تب اسفر ماں کے ساتھ آن بیٹھا۔

''امی مجھے راشدہ پھوپو کی بیٹی خولہ پسند ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

''تو پھر دعا؟؟'' فاخرہ کو لمحہ بھر سمجھ ہی نہ آیا بیٹے سے کیا کہے۔

☆......☆......☆

پاکستان کی معاشرت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ لڑکی کی محبت کا قصہ باپ اور بھائیوں کو بتایا جائے۔

دعا کی طبیعت سنبھلتی نہ تھی، کھانے پینے سے رغبت نہ رہی۔ پہروں جاگتی رہتی اور آنسو بہاتی رہتی۔ دنوں میں چہرے کی لالیاں غائب ہوگئیں اور اب تو سرسوں کے پھول کا گمان ہوتا۔

شوہر اور بیٹے تشویش میں مبتلا تھے اور صاعقہ کے پاس گھڑنے کو کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔ حنان تو دعا کو زور زبردستی فزیشن کے پاس بھی لے گیا۔

''انھیں کوئی ذہنی ٹینشن ہے۔ ٹینشن ختم کریں یہ ٹھیک ہوجائیں گی۔'' فزیشن نے تفصیلی معائنے کے بعد کہا تھا۔

''کس قسم کی ٹینشن؟'' فزیشن نے توجہ دلائی تو حنان کو احساس ہوا بہن بیمار کم اور پریشان زیادہ لگتی ہے۔ دعا نے تو کچھ بتانا گوارا نہ کیا مگر جب حنان نے کرید کرید کر صاعقہ سے پوچھا تو صاعقہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کچھ نہ کچھ بتادیا۔

ساری بات سننے کے بعد حنان نے طویل سانس بھرا تھا۔ وہ تھوڑا آزاد خیال تھا بجائے اس بات پر پیچ و تاب کھاتا، اس نے اسفر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

ذاتی طور پر بھی حنان اسفر کو پسند کرتا تھا، سلجھا ہوا لڑکا تھا، تھوڑا کم گو اور جھینپو تھا مگر یہ برائیاں نہیں

تھیں۔ ہاں البتہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے تھا۔ لیکن خیر جب بہن اتنا پسند کرتی تھی کہ اس کے انکار پر بیمار پڑنے لگی تھی تو مزید کچھ سوچنا عبث تھا۔

حنان شام کے وقت ملنے کے لیے گیا تھا۔ اسفر ابھی گھر پر نہ تھا۔ دکان پر جانے کے ساتھ ساتھ اس نے ایم اے کی ٹیوشن کلاسز لینا بھی شروع کر دی تھیں۔ جب تک اسفر آیا، فاخرہ بھانجے سے حال احوال اور جاب سے متعلق سوال پوچھتی رہیں۔ حنان نے جب بتایا کہ وہ اسفر سے ملنے آیا ہے تو فاخرہ خود ہی سمجھ گئیں کہ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

''آؤ اسفر بھائی کو کمپنی دو، حنان آج خاص تم سے ملنے آیا ہے۔'' اسفر آیا تو فاخرہ تنہائی میسر کرنے کے خیال سے کمرے سے چلی گئیں۔

کچھ عمروں کا فرق تھا اور کچھ فرینکنس کی بھی کمی تھی، اسی لیے تو ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد خاموشی کے طویل وقفے آنے لگے۔ الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے حنان نے متعلقہ بات کی تھی۔

''اسفر تم نے دعا کو کیوں انکار کیا؟'' اسفر نے حیران نظروں سے حنان کو دیکھا تھا۔ اسے توقع نہ تھی کہ حنان خود یہ بات اس سے بلاواسطہ کرے گا۔

''دعا افسر لگنے والی ہے۔ اسے کہیں وقت ضائع کرنے کی بجائے انٹرویو پر توجہ دے۔ اچھا انٹرویو دے گی تو ہی اچھی فیلڈ میں منتخب ہو گی۔'' کچھ تکریم کا معاملہ تھا۔ اس لیے اسفر نے قدرے اٹک اٹک کر بات پوری کی تھی۔

''دعا اچھی لڑکی ہے، جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو۔ تم دونوں اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔''

''ہونہہ'' اسفر سر جھٹک کر رہ گیا۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہم اس موضوع پر بات نہ کریں، ہر بات کرنے والی کہاں ہوتی ہے۔'' اسفر کا لہجہ تھوڑا تلخ سا تھا۔ یوں بھی پے در پے کی ناکامیوں کے بعد وہ تلخ ہو گیا تھا۔ حنان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ اس سے قبل وہ کچھ بولتا اسفر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ بیٹھیں میں آپ کے کچھ لاتا ہوں''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں، میں آنٹی کے ساتھ چائے پی چکا ہوں، تم بیٹھو'' حنان نے کہا تو اسفر ایک بار پھر بیٹھ گیا۔

''تم مجھے اپنے انکار کی وجہ بتاؤ، ہم وہ وجہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں'' اسفر کے ماتھے کی تیوری حنان کو ناگوار تو گزر رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی خود کو پرسکون رکھے ہوئے تھا۔ اسفر جو اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا زچ ہونے لگا۔

''کیا زور زبردستی ہے، جب میں نہیں چاہتا تو پھر۔۔۔''

''کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟'' حنان کا لہجہ تا حال پرسکون تھا۔

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' اسفر کے ماتھے کے بل میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

''ہم کیوں ایسے ہی سمجھ لیں۔ بتاؤ میرے بھائی تم کیوں انکار کر رہے ہو، دعا تمہارے انکار سے بیمار پڑنے لگی ہے۔''

''انکار کی ایک وجہ ہو تو بتاؤں'' اسفر جیسے پھٹنے کو تیار تھا۔

''تم ایک وجہ تو بتاؤ'' حنان کو اسفر کے انداز غصہ دلا رہے تھے۔ مگر وہ پھر بھی ضبط کیے صلح جو لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''آپ کی بہن خاندان کی دوسری عورتوں کی طرح کسی پیچیدہ نفسیاتی عارضے کا شکار ہے اپنے سے کم تر لڑکے سے شادی کر کے اس کو اپنا غلام بنا کر پتا نہیں کس قسم کی تسکین چاہتی ہے۔ مگر میں بھی کسی کو اپنے اوپر حاکم بننے کی اجازت نہ دوں گا۔'' اسفر نے جیسے آگ اگلی تھی۔ ابھی تک اسفر کے انداز کو سہتے حنان کے تو جیسے پیروں کو لگی تھی اور سر کو بجھی تھی۔

''دو ٹکے کے ایزی لوڈ والا اپنی اوقات بھول

گیا اسی لیے جو منہ میں آ رہا ہے بولے جا رہا ہے۔" بہن کی محبت میں حنان کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اور اس کی جذباتیت تابوت میں آخری کیل ہی ثابت ہوئی تھی۔

اسفر چند لمحے تو تحیر سے حنان کو دیکھتا رہا اور پھر ہکلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اپنی بہن کے لیے وزیر اعظم کا بیٹا ڈھونڈیں، دو ٹکے کے لوگوں کے پاس کیا کرنے آئے ہیں۔" یہ کہہ کر اسفر رکا نہیں ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ بھلا کون کہتا ہے آگ سے زیادہ کسی چیز میں جھلسانے کی صلاحیت نہیں، لوگوں کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ زیادہ جھلساتے ہیں۔

☆......☆......☆

وہ لڑکی جو ماں کی دلاری تھی، باپ کے آنکھوں کا تارا تھی، جس کے نخرے سہنا بھائی خوش قسمتی سمجھتے تھے، محبت کے ہاتھوں رل رہی تھی۔

محبت ہمیشہ خدا کا انعام نہیں ہوتی۔

محبت ہمیشہ آسودگی نہیں دیتی۔

محبت دکھ بھی دیتی ہے

آزردہ بھی کرتی ہے۔

محبت خوبصورت خیال ہے تو ایک ملال بھی اس میں پنہاں ہے۔

اپنے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر آڑوں بیٹھے بیٹھے جب دعا کا ہر عضو چٹخنے لگا تو وہ اٹھی اور قدم قدم چلتی کھڑکی تک آ گئی۔ چہرے پر زردی کچھ ایسے کھنڈ چکی تھی کہ لگتا تھا کہ چہرہ ازل سے ایسا زرد ہی تھا۔ موم کو پتھر بنانے میں تو ایک لمحہ لگتا ہے تو دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو پتھر کو موم بنا سکے۔

اتنا بے حس کہ پگھلتا ہی نہ تھا باتوں سے

آدمی تھا کہ تراشا ہوا پتھر دیکھا

محسن نقوی نے یہ شعر جیسے اسفر کے لیے ہی کہا تھا۔

کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی دعا کو لگا جیسے آنکھ میں کوئی چیز چلی گئی ہے۔ حالانکہ آنکھ میں کچھ نہ گیا تھا۔ یہ آنسو تھے جو آنکھوں میں چبھن پیدا کر رہے تھے۔ آنسو بہے تو آنکھوں کو بھی سکون ملا۔

"اسفر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں" دعا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تنہائی میں رو کر بھی عجب ہی تسکین ہوتی ہے۔

"کیا تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ رہ پاتی ہوں کہ نہیں تو میرا یقین کرو اسفر میں مر جاؤں گی" دعا روتی جاتی اور خود سے کہے جاتی۔

"یہ کیسی شرط ہے کہ میں تمہارا منہ جوتے سے ناپوں۔ ایسے کرو کہ تم میرا چہرا ناپ لو، مگر۔۔۔۔ مگر مجھ سے عقد کر لو" سامنے اسفر نہیں تھا وہ خود تھی۔

روتے روتے بھی دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ ہاں البتہ کمزوری محسوس ضروری ہوئی۔ سہارا لینے کے لیے اس نے کھڑکی کے فریم پر ہاتھ رکھا تو وہ کھڑ کنے لگا۔ کافی عرصہ پہلے دعا نے فرقان کو فریم فکس کروانے کا کہا تھا۔ مگر فرقان گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وقت نہ نکال پایا اور آج کا کام کل پر چھوڑتے ہوئے بھول ہی گیا۔

"اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں کہے دیتی ہوں، اسی کھڑکی سے کود کر جان دے دوں گی۔" سوچیں تو بے لگام ہوتی ہیں۔ سوچتے ہوئے بندہ کہاں یہ سوچتا ہے کہ کبھی یہ سب حقیقت بن گیا تو؟

☆......☆......☆

فاخرہ نے اپنے تئیں اسفر کو قائل کرنے کی پوری کوشش کی۔ مگر اسفر نے جیسے فیصلہ نہ بدلنے کی قسم کھائی تھی۔ فاخرہ قائل کر کے تھک گئیں مگر افسر ٹس سے مس نہ ہوا۔ صاعقہ فاخرہ سے کھلم کھلا ناراض تھیں کہ بیٹے کو نہ منا سکی۔

"آپا پتا نہیں اسفر ایسا تو نہ تھا پتا نہیں کیسے اتنی ضد کر رہا ہے، کہتا ہے مر جاؤں گا مگر دعا سے شادی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L - 5 / 79 ڈاکخانہ L .5 / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

نہ کروں گا۔'' فاخرہ پشیمان لہجے میں بہن سے فون پر کہہ رہی تھیں۔
''ہونہہ، سب جھوٹے بہانے ہیں۔'' صاعقہ نے غم و غصے کے ملے جلے جذبات سے فون ہی بند کر دیا۔
سدرہ نے بھی اسفر کو سمجھایا۔ دعا اس کی کزن تھی، دوست تھی سالوں کلاس فیلو رہی تھی۔ مگر اسفر نے نہ ماننا تھا نہ مانا۔
روز روز کی کشیدگی سے تنگ آ کر فاخرہ نے یہی فیصلہ کیا خولہ کے لیے ہی اسفر کا رشتہ لے جائیں رشتہ طے ہو جائے گا تو صاعقہ بھی دباؤ نہ ڈالیں گی۔
فاخرہ ایک بار پھر گاؤں گئیں۔ راشدہ کو آنے کا مقصد بتایا۔ راشدہ تو نہال ہی ہو گئیں۔
''فاخرہ یہ تو میرے دل کی آرزو تھی۔ بیٹی والی ہوتے ہوئے خود سے کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ مگر دیکھ لو۔ خدا ہم سے زیادہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ اسفر تو میرے لیے دوسرا ازوار ہی ہے۔ رشتے سے انکار کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' راشدہ خوش تھیں۔ فاخرہ چہرے پر پھیکی ہنسی سجائے سوچ رہی تھیں۔
''راشدہ انکار کر دیتی تو ممکن تھا کہ کوئی روزن کھل جاتا لیکن خیر۔۔۔۔''
اسفر اور خولہ کا رشتہ دنوں میں طے ہو گیا اور اسفر کی فرمائش پر ہی جلد شادی کا انتظام کر دیا گیا۔ یوں تو فاخرہ چاہ رہی تھیں کہ اسفر سرکاری ٹیچر لگ جاتا تب شادی کر دی جاتی۔ مگر اسفر کے رنگ ڈھنگ تھوڑے اور تھے۔ اتنا سرکش وہ پہلے نہیں ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے فاخرہ نے جلد شادی کے لیے انتظام شروع کر دیے۔
''شادی ہو جائے گی تو اسفر خوش رہے گا اور دعا بھی خود کو سنبھال لے گی۔ بھلا بندہ ماضی کو کتنا عرصہ سینے سے لگائے رکھ سکتا ہے۔'' فاخرہ نے کئی بار سوچا تھا۔ اسفر کی خوشی کے علاوہ انھیں بھانجی کی زندگی میں بھی ٹھہراؤ چاہیے تھا۔ سو جو ممکنہ طور پر آسان اور بہتر لگ رہا تھا وہ اسی طرف قدم بڑھا رہی تھیں۔
کچھ دنوں تک راشدہ کا فون آیا۔
''فاخرہ تھوڑا سانس تو لے لو، ایسی بھی کیا ہتھیلی پر سرسوں جمانا، میری عدت کو ختم ہوئے ابھی مہینہ ہوا ہے۔ مجھے ابھی وقت دو۔ میری آخری بیٹی ہے۔ اس کی شادی سے متعلق میرے کچھ ارمان ہیں۔'' ارشدہ کی عام باتوں میں بھی خوشی کی رمق تھی۔
''آپا جلدی کہاں ہے یہ نومبر ہے اور ہم نے فروری کی تاریخ رکھی ہے۔ آپ جی بھر کر اپنے ارمان پورے کریں۔'' فاخرہ نے سجاؤ سے سمجھایا تھا۔
''چلو ٹھیک ہے'' راشدہ نے خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

بستر مرگ پر لیٹے انسان کی زندگی طویل کرنے کے لیے علاج معالجے کا سامان تو کیا ہی جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہ بس سرہانے بیٹھ کر دعا میں پڑھے جاؤ اور مریض کے مرنے کا انتظار کیے جاؤ۔ دعا بھی اپنے علاج معالجے کا سامان کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی محبت کے مرض میں مبتلا تھی۔
دکان پر اسفر کا دل لگ گیا تھا۔ کچھ کمائی ہو جاتی۔ جیب میں پیسے آ جاتے اور گھر پر بھی فارغ نہ بیٹھنا پڑتا۔ اسی لیے دکان کا معمول اسفر کو ناگوار نہ گزر رہا تھا۔
دکان پر اسفر نے کمپیوٹر رکھ لیا۔ کارڈ ریڈرز اور کچھ اس جیسے دوسرے آلات بھی۔ ایزی لوڈ، موبائل اسسریز بیچنے کے ساتھ ساتھ وہ میموری کارڈ بھرنے کا کام بھی کرنے لگا۔ ایزی پیسہ کی سہولت بھی لے لی اور روپے پیسے کی ترسیل کرنے لگا۔ یہ تبدیلیاں لانے سے دکان کی گاہکی بڑھی تھی۔ اوسطاً روزانہ دو سو لوگ دکان پر آتے۔ ان میں سے ڈیڑھ سو، نے لوڈ کروانا ہوتا، پیسے بھیجنے ہوتے یا کچھ خریدنا ہوتا۔ محض چند لوگ ہی موبائل اسسریز کی قیمتیں پوچھ کر چلے جاتے۔

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔
اسفر کا ارادہ تھا کہ شادی سے ایک ہفتہ پہلے دکان پر آنا چھوڑ دے گا۔ یہ ایک عام سا دن ہی تھا۔ لیکن آج گاہک قدرے کم تھے۔ اسفر کمپیوٹر کی سیٹنگ میں مصروف تھا جب کسی نے سے پکارا تھا۔

''اسفر'' اسفر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے دعا کھڑی تھی۔ اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔

''آؤ دعا، کیسی ہو؟'' اسفر نے بادل نخواستہ راستہ دیا اور دعا قدم اٹھاتی دکان کے اندر داخل ہوئی تھی اور کاؤنٹر کے پاس پڑے سٹول پر ٹک گئی۔

''گھر آجاتی، امی اور سدرہ سے ملاقات ہو جاتی، یہاں دکان پر میں مصروف بھی ہوتا ہوں اور غیر مناسب بھی ہے۔'' اسفر نے یوں گفتگو کی ابتداء کی جیسے درمیان میں کبھی کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں ہوئی۔

دعا خالی خالی نظروں سے اسفر کو دیکھے گئی۔

''تم نے شادی کی شاپنگ کر لی، آخر تم میری کزن ہونے کے علاوہ دوست بھی ہو اور ہم اکٹھے پڑھتے بھی رہے ہیں۔'' اسفر نے بھرپور کوشش کی کہ اس کا لہجہ ہشاش بشاش ہو۔ دعا یک ٹک اسفر کو دیکھے گئی۔

''یوں تو مت دیکھو'' اسفر گڑبڑا گیا۔

''اور کتنا امتحان لو گے اسفر۔'' دعا کی آواز میں کرب نمایاں تھا۔

''امتحان۔۔۔'' اسفر نے لفظ زیر لب دہرایا تھا اور سر نفی میں ہلایا تھا۔

''دعا یہ امتحان نہیں۔۔۔ حقیقت ہے۔ اتنا بڑا سی ایس ایس امتحان پاس کرنے والی لڑکی ابھی تک کس دنیا میں رہتی ہے۔ تم امیر ہو، خوبصورت ہو، ذہین ہو، ایک سے ایک بہتر رشتہ تمہارا منتظر ہے۔ میں ٹھہرا دو ٹکے کا آدمی۔''

''اسفر یوں مت کرو'' دعا رونے لگی۔ اگلے لمحے وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

''اسفر چپ چاپ دعا کو روتے دیکھتا رہا۔

''مستقبل میں خود رونے اور مجھے رلانے سے بہتر ہے ابھی رو لو، یہی تو دستور ہے۔ مستقبل سنوارنے کے لیے حال کی تکلیفیں سہی جاتی ہیں۔'' اسفر کا لہجہ ایسا تھا جیسے معمول کی باتیں ہو رہی ہوں۔

دعا روتی رہی۔ اسفر نے چپ کروانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کافی دیر یونہی گزر گئی۔ تب اسفر نے ایک گلاس پانی دعا کی طرف بڑھایا۔ دعا نے نہ تھاما۔

''اسفر میں مر جاؤں گی۔ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں'' دعا کے پاس موجود ٹشو آنسوؤں سے اس قدر گیلا ہو چکا تھا کہ اس سے مزید آنسو نہیں پونچھے جا سکتے تھے۔

''کچھ نہیں ہوتا، تمہیں آؤ گھر چلتے ہیں۔ یہ اتفاق ہی ہے آج میں بائیک نہیں لایا اور پیدل آیا ہوں۔ شاید تمہاری گاڑی میں گھر جانا قسمت میں تھا۔ گھر چکر لگا لیا کرو۔ شادی والا گھر ہے کام ہوتے ہیں۔ سدرہ اکیلی ہلکان ہوتی ہے۔ راستے میں آئسکریم بھی کھلاؤں گا۔ اب تو میں کمانے لگا ہوں۔'' اسفر اٹھا تھا اور گاڑی کی چابی والی چین جو دعا نے اپنے سامنے کاؤنٹر پر رکھی تھی اٹھا کر دعا کی طرف بڑھائی تھی۔ دعا کے پاس جیسے کہنے اور کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

☆......☆......☆

دروازے کی چوکھٹ پر سب سے آگے آگے کھڑی راشدہ نے سامنے سے آتی بارات کو دیکھا اور شاد ہوتے دل کے ساتھ ایک کواڑ کو تھاما تھا۔

خولہ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اور آنکھوں کا تارا تھی۔ آج گھر کا آنگن چھوڑ کر جا رہی تھی۔ بلاشبہ دل کا ایک کونہ بیٹی کی جدائی سے اداس تھا۔ مگر اتنے اچھے لڑکے سے منسلک ہونے پر دل شاد بھی تھا۔ اور اسے اطمینان تھا کہ اچھی زندگی اس کی بیٹی کی منتظر ہے۔

ابھی تو عصر کا وقت تھا۔ برقی قمقمے روشن تو

تھے۔ مگر اندھیرا نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ دھج نہیں دکھا پا رہے تھے۔ سرخ شامیانوں کی بھی ایک الگ چاشنی تھی۔

بارات رکی، سب سے آگے والی گاڑی سرخ گلاب جس کی سجاوٹ تھے سے اسفر اترا۔ سیاہ ٹو پیس میں ملبوس، چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی۔ سرخ چہرہ، گلے میں سنہری مالا، بلاشبہ اسفر اس تقریب کا سب سے خوبصورت مرد تھا۔ بیٹے کے بعد فاخرہ گاڑی سے اتری۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں کمی تھی۔ دل بجھا ہوا ہو تو چاہے جتنی کوشش کرلو، مسکراہٹ ادھوری ہی لگتی ہے۔ ”کاش کہ اسفر دعا کے لیے مان جاتا“ گاڑی سے اترتے ہوئے فاخرہ نے سوچا تھا۔ صورتحال ہی کچھ الگ سی تھی۔

صاعقہ اور اس کی پوری فیملی نے شادی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ ایک ہی تو فاخرہ کی بہن تھی وہ بھی اہل خانہ سمیت شادی میں شریک نہ ہو رہی تھی۔ بہن کو منانے کی نیت سے کل بھی فاخرہ بہن کے فلیٹ پر گئی تھی۔ وہاں جا کر بھی فاخرہ کو احساس ہوا صاعقہ اگر لاتعلق ہو رہی ہے۔ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ دعا کی حالت اس قدر بری تھی کہ ترس آتا۔ سیاہ حلقوں والی ہڈیوں کا ڈھانچہ لڑکی، جاں بلب بستر پر کچھ اس طرح لیٹی تھی کہ مردے کا گماں ہوتا۔

”فاخرہ کیسی بہن ہو تم، تمہیں میری بیٹی پر ترس نہیں آتا۔“ صاعقہ رونے لگیں۔

”آپا میں کیا کرسکتی ہوں، اسفر مانتا ہی نہیں۔ مجھے تو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اس قدر بے حس اور ضدی ہے۔“ خود فاخرہ کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔

”تم کیا کرسکتی ہو؟ تم تو جیسے کچھ نہیں کرسکتیں۔ بیٹے کے سر پر سہرا سجا رہی ہو اور کہتی ہو کیا کرسکتی ہوں۔“ صاعقہ ترش ہوئی تھی۔ فاخرہ لاجواب سی چپ رہ گئی۔

”یہاں کیا ہمارا تماشا دیکھنے آئی ہو، اتنا ترس تو سامنے فلیٹ میں رہنے والی پڑوسن کھالیتی مگر شاید تم۔۔۔“ آنسوؤں میں صاعقہ بات ہی نہ پوری کر پائی اور فاخرہ رقت بھرا دل لیے بہن کو تسلی بھی نہ دے پائی۔ کیا کہتی کہ کل بارات پر چلو۔

”امی آیئے نا، رک کیوں گئیں“ اسفر کی آواز کانوں میں پڑی تو فاخرہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی آگے بڑھنے لگیں۔ دل میں کچھ ایسا قلق تھا کہ دلہا بنا بیٹا بھی برا لگ رہا تھا۔

”زہے نصیب، زہے نصیب،“ مسکراتے چہرے کے ساتھ ذیشان آگے بڑھا اور اسفر سے بغل گیر ہوا۔ بارات کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے لوگوں نے سرخ پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں اور بارات چوکھٹ پار کرتی اندر صحن میں داخل ہوئی۔ مختصری بارات تھی۔ رشتہ داروں کے علاوہ انتہائی قریبی پڑوسیوں کو بلایا گیا تھا۔ لڑکی والوں کی طرف بھی زیادہ مہمان نہ تھے۔

گھر میں داخل ہو کر اسفر نے ایک نظر چاروں اور دوڑائی۔ کھلا کچا صحن، جہاں بچپن میں جب بھی وہ آتا تھا خولہ کے ساتھ ہر کھیل کھیلتا تھا۔ گاؤں آتے ہوئے اس کے پرجوش ہونے کی وجہ بھی خولہ کی کمپنی ہوتی تھی۔ یہ سب سوچیں تو متعلقہ تھیں مگر یہاں ایک غیر متعلقہ سوچ بھی ذہن میں ابھری۔

”دعا کے ساتھ تو جیسے سارا بچپن گزارا ہے، سکول، کالج، بعد کی زندگی۔۔۔“ ساتھ ہی دعا کی خود پر کی گئی چھوٹی بڑی عنایات یاد آنے لگیں تو اسفر گڑبڑا سا گیا۔ کل سے اس کے ذہن میں وقفے وقفے سے دعا کی باتیں آرہی تھیں۔ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی نہ جھٹک پا رہا تھا۔

صحن اتنا بڑا تھا کہ شامیانے لگا کہ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ انتظام کیا گیا تھا۔ اپنے سالوں کی قیادت میں اسفر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا مردانہ حصے میں بنائے گئے سٹیج پر آن بیٹھا۔ نکاح خواہ پہلے سے ہی اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ سفر اسٹیج پر پہنچا تو نکاح خواں نے پرجوش انداز میں اسفر سے معانقہ کیا تھا۔

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



توشہ خاص، رنگ رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، فرحت ساماں، زہرکار، عبرت اثر حکایتیں

کراچی سے پہلی حکایت

رائٹ نمبر

اینیلا امام بخش

ایک رونگ نمبر نے اُس بدنصیب کے بھاگ جگا دیے تھے

میرے موبائل پر اکثر رونگ نمبر آتے تھے۔ کسی نمبر پر میں ہنسی خوشی سے بات کرتی، کسی کو جھڑک دیتی، کسی سے تو باقاعدہ دوستی ہو جاتی، کسی سے تو نوبت ملاقات تک آ جاتی اور یہ ملاقات ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہوتی، کیونکہ مرد حسن پرست ہوتے ہیں اور وہ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں اور یہ دونوں خوبیاں مجھ میں نہیں تھیں۔ میں کالی کلوٹی اور عمر میری 45 سال کی مگر ہوں میں کنواری۔ مجھ سے دو بڑی بہنیں، وہ شادی شدہ اور دو چھوٹی بہنیں وہ بھی شادی شدہ۔ بڑی بہنوں کے تو بچے بھی شادی شدہ تھے۔

میرے بھی شروع میں اونگے بونگے رشتے آئے مگر اماں نے اچھے رشتے کی آس میں جواب دے دیا اب تو رشتے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے بھی دل میں شادی کی خواہش تھی۔

اپنا گھر، شوہر، بچے کسے اچھے نہیں لگتے۔ ایک دن میرے موبائل پر ایک رونگ نمبر آیا۔ میں نے انھیں دو چار باتیں سنا کر موبائل بند کر دیا۔ مگر وقفے وقفے سے وہی کال آئی تو میں کال کاٹ دیتی مگر دوسری طرف بھی کوئی ڈھیٹ تھا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کال ریسیو کی۔

''مجھے کیوں بار بار تنگ کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تمھیں۔'' دوسری طرف فون آنے والے شخص نے اسپیکر آن کر دیا تاکہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوست بھی سن سکیں فون پر اس نے اپنا نام فیروز بتایا تھا۔

''بھئی ہم تو صرف آپ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ ہماری کال کاٹ رہی ہیں۔''

''نہیں کرنی مجھے دوستی آپ سے۔ شادی تو کوئی مجھ سے کرنے کو تیار نہیں، بڑے آئے دوستی کرنے والے۔'' میں نے تنی سے جواب دیا۔

''ایک بار دوستی تو کر لو پھر میں ضرور تم سے شادی کروں گا۔ میری جان کیوں اتنی اتاؤلی ہو رہی ہو شادی کے لیے۔'' اُس نے بڑی مکاری سے کہا۔

''اتاؤلی ہورہی ہوگی تمہاری ماں بہنیں شادی کے لیے۔ دوسری لڑکیوں کی عزت کا ذرا خیال نہیں۔ تم جیسے مردوں کو میرا دل کہہ رہا ہے کہ ایسی گالیاں دوں کہ آئندہ کسی لڑکی کو تنگ کرنے کی جرأت نہ ہو۔ میں ایک کالی کلوٹی 45 سال کی کنواری لڑکی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ مجھ سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ سب مذاق اڑاتے ہیں میرا۔'' آخر میری آواز بھرا گئی۔ آنسو گلے میں اٹک گئے۔ اور میں نے موبائل بند کر دیا اور زاروقطار رونے لگی۔ اسی وقت میرا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر ایک انجان نمبر جگمگا رہا تھا۔ میں نے چوتھی بیل پر کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز ابھری۔ ''میں ارتضیٰ بات کر رہا ہوں پلیز کال کاٹنا مت۔'' اس نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

''جی کہیے میں سن رہی ہوں۔'' میں نے دوپٹے کے پلو سے زور سے آنکھیں رگڑیں۔

''آپ رو کیوں رہی ہے۔'' بے حد دردمندانہ انداز سے پوچھا گیا۔

''آپ میری فکر چھوڑیے میں روؤں کہ ہنسو اس سے آپ کو کیا۔ آپ کو جو کہنا ہے وہ کہیے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے فراڈ نہیں کر رہا۔ نہ ہی میں نے آپ کو پسند کیا ہے، نہ ہی محبت۔ یہ شادی میں ہمدردی میں کر رہا ہوں۔ ویسے میں بھی شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہوں۔'' اس کے لہجے سے سچائی چھلک رہی تھی۔

''مگر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہوئی کیسے۔ میں نے اپنا اشتہار تو نہیں لگایا تھا۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر۔

میرا دوست فیروز آپ کو موبائل پر تنگ کر رہا تھا اور اس نے والیم کھول رکھا تھا۔ سب دوست سن رہے تھے اور آپ پر ہنس رہے تھے۔ اسی وقت میں آ کر ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ آخر میں آپ کی آواز رونے جیسی ہوگئی۔ اس وقت مجھے لگا کہ جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں آپ سے شادی کروں گا اور میرا ہر فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے فیروز سے آپ کا نمبر مانگا اور آپ کو کال

کی۔" وہ بڑے جوش وخروش سے ساری تفصیل بتارہا تھا۔

"ابھی آپ نے مجھے دیکھا نہیں اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ مجھے دیکھنے کے بعد آپ کو اپنا فیصلہ احمقانہ لگے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کہاں ملیں گی آپ مجھ سے۔" اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ تھی۔"

میں نے سوچا آخر آزمانے میں کیا حرج ہے۔ اسے جگہ اور وقت بتانے لگی۔

"میں کوئٹہ سے پرسوں آؤں گا تم سے ملنے۔" یہ کہہ کر ارتضٰی نے فون بند کردیا۔

جب میری ارتضٰی سے ملاقات ہوئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بائیس تیئس سال کا بے انتہا خوب صورت نوجوان تھا مگر وہ مجھے دیکھ کر چونکا تک نہیں مگر پھر بھی میں پُر امید نہیں تھی۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں مگر آپ کو دیکھ کر لگتا تو نہیں۔" میں نے بات کا آغاز کیا۔

"ہاں میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میری شادی کو ایک سال ہوا ہے۔ اور میری بیٹی نو دن کی ہے۔ ہمارے ہاں کم عمری میں شادی ہوجاتی ہے۔" وہ بات کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"میں جلد اپنے والدین کو تمہارے ہاں بھیجوں گا۔"

اس کی بات پر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ وہ مجھے دیکھنے کے بعد بھی اپنی بات پر قائم تھا پھر اکثر میں فون پر اُس سے بات کرنے لگی۔

جب بھی وہ کراچی آتا ہماری ملاقات بھی ہوجاتی۔ اُس کا پورا نام ارتضٰی بگٹی تھا۔ کوئٹہ میں اس کا اپنا کاروبار تھا۔ دولت کی اُسے کوئی کمی نہ تھی۔ وہ اکثر مجھے قیمتی تحائف دیتا۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجا۔ مگر ہمارے گھر والوں نے انھیں صاف جواب دے دیا۔

امی کو ارتضٰی کی کم عمری پر اعتراض تھا۔ اس کی خوب صورتی پر اعتراض تھا۔ امی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ آخر اسے ضرورت کیا ہے دوسری شادی کرنے کی، وہ بھی میرے جیسی لڑکی سے جواب بوڑھی ہورہی ہے۔ میں نے رو پیٹ کر جیسے تیسے اپنے گھر والوں کو راضی کیا۔ پھر جب وہ لوگ دوبارہ آئے تو امی نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ میرے بھائیوں نے جاکر اس کے بارے میں چھان بین کر کے اپنی تسلی کی اور پھر جب وہ تیسری دفعہ آئے تو امی نے ہاں کی پھر بھی کچھ شرائط رکھیں جو سب انھوں نے پوری کیں۔ ایک شرط تو امی نے گھر کی رکھی تھی کہ پہلی بیوی کوئٹہ میں ہو اور اسے کراچی میں گھر لے دے۔ یہ بھی ارتضٰی نے قبول کرلیا۔ پھر بڑی دھوم دھام سے میرا ارتضٰی سے نکاح ہوا۔ جب وہ کراچی میں گھر کا انتظام کرلے گا تو پھر رخصتی ہوگی۔ چھ مہینے بعد جب اُس نے گھر کا انتظام کرلیا تو میری رخصتی ہوگئی۔

میں اب ایک خوشحال زندگی گزار رہی ہوں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مجھے ارتضٰی جیسا جیون ساتھی ملے گا۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ مرد ارتضٰی جیسے بھی ہوتے ہیں۔ جو کسی لڑکی کا فون پر روتا گڑگڑانا سُن کر صرف ہمدردی میں اتنا بڑا فیصلہ کرے گا۔ کاش اس ملک میں چوتھائی فیصد مرد بھی ارتضٰی جیسے ہوجائیں تو یہ ملک سدھر جائے۔

میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ کوئی رونگ نمبر رائٹ نمبر بن جائے گا۔ رونگ نمبر تو اکثر وبال جان بن جاتے ہیں۔ مگر اس رانگ نمبر نے میری زندگی سنوار دی۔ میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں کہ جس نے میرے نصیب میں ارتضٰی کا ساتھ لکھا۔ رب کرے وہ ہمیشہ میرے ساتھ مخلص رہے۔

☆☆☆

ڈسکہ سے دوسری حکایت

رفوگر

نسیم سکینہ صدف



آج کے بے حس معاشرے کی زندہ تصویر، اپنے حق کے لیے انصاف تلاشتی ایک دوشیزہ کی حکایت



یہ کہانی ہے رنگ پورہ کی تیس سالہ کرن ناز کی جو کہ بچپن میں ہی یتیم ہوگئی تھی۔ اس کے والد ابرار عزیز کا انتقال تبھی ہو گیا تھا جب وہ صرف دس برس کی تھی۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔ انھوں نے اپنی ماں کے ساتھ بے چارگی میں زندگی گزارنے کی ٹھان لی لیکن کچھ ہی مہینوں بعد ان پر غموں کا پہاڑ پھر ٹوٹا۔ ہوا یوں کہ ان کی ماں بیمار ہوئی اور اِسی بیماری میں اس کی موت بھی ہوگئی۔ اب کرن ناز پر اپنی دو بہنوں سارہ اور عمارہ کی ذمہ داری آ گئی۔ جب کہ ابھی تو وہ خود بھی ناسمجھ تھی۔ بہرحال رشتہ داروں نے سہارا دیا اور کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان گھر میں کھلوادی۔ چند ہی دنوں میں کرن ناز نے دکان سنبھال لی اور خاطر خواہ آمدنی بھی ہونے لگی۔

وقت کی گردشوں نے کرن ناز کو وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہنوں کو پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ اور خود بھی گھر پر رہ کر پڑھنے لگی۔ اس طرح وقت گزرتا رہا۔ پانچ سال بعد اس نے پرائیویٹ طور پر ہائی اسکول پاس بھی کرلیا۔ اسی بھاگ دوڑ میں اس نے کب

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی اب اس کے حسن میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تب ہوا جب لوگوں کی ستائشی نگاہوں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ محلے کے نوجوان بھی اسے دیکھ کر ذو معنی جملے اچھالنے لگے۔ لیکن وہ سب سے بے خبر صرف اپنی بہنوں کا مستقبل سنوارنے میں لگی رہی۔ لیکن ایک نوجوان کے لیے اس کے دل میں جانے کب نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔

وہ نوجوان تھا نوید انجم جو کہ پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ اس نے کرن ناز کے ہائی اسکول کے فارم بھروانے سے لے کر امتحان کی تیاری میں مدد کی تھی۔ اس لیے وہ کبھی کبھی اس سے بات چیت بھی کر لیتی تھی۔ لیکن بات چیت کا سلسلہ جانے کب پیار میں بدل گیا اور ایک دن دونوں نے اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کہہ بھی دی۔ اس کے بعد یہ پیار بڑھتا ہی گیا۔ نوید انجم نے کرن ناز کو شادی کا بھی یقین دلایا اور اس یقین کی بنیاد پر کرن ناز نے ایک دن اپنی عصمت کی پونجی بھی نوید انجم پر نچھاور کر دی۔

ہوا یوں کہ عید کا موقع تھا دونوں فلم دیکھنے گئے تھے۔ اسی فلم کے ایک رومانی منظر کو دیکھ کر نوید انجم کے جذبات بھڑک اٹھے۔ کرن ناز بھی اس وقت خود کو فلم کی ہیروئین کی جگہ تصور کیے خیالوں میں گم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اب تو نوید انجم کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد کرن ناز کو جب ہوش آیا تو اسے ندامت ہونے لگی لیکن نوید انجم نے شادی کی تسلی دے کر اسے خوش کر دیا۔ ایک بار شرم و حیا کا بند ٹوٹا تو خواہشات کا سیلاب اُمڈ آیا۔ دونوں کو جب بھی موقع ملتا تو ایک دوسرے میں کھو جاتے۔ وقت کا دریا اپنی مخصوص رفتار سے بہتا رہا۔ کرن ناز کا اسٹور اب اور بھی ترقی کرتا گیا۔ اسی دوران اس سے چھوٹی بہن سارہ نے بھی ہائی اسکول کا امتحان پاس کر لیا اور اب وہ بھی سولہ سال کی خوب صورت دوشیزہ ہو گئی تھی۔ کرن ناز کو اس کی شادی کی فکر ہوئی تو اس نے سوچا کہ پہلے اپنی شادی کر لے۔ لہٰذا اس نے نوید انجم سے بات کی تو اس نے شہر جا کر کچھ پیسے جمع کرنے کی بات کہہ کر ٹال دیا۔

بہر حال کرن ناز کو نوید انجم پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے سارہ کا رشتہ ایک مناسب لڑکے سے کر دیا۔

چھوٹی بہن عمارہ آٹھویں میں تھی۔ کرن ناز کی عمر پچیس سال ہو چکی تھی۔ لیکن اسے اپنی شادی کی فکر نہ تھی۔ اب اسے عمارہ کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ بہر حال نوید انجم اسے برابر دلاسہ دے رہا تھا۔ اور اسی دلاسے میں چار سال اور بیت گئے۔

اس دوران کرن ناز نے عمارہ کے لیے بھی رشتہ دیکھ کر اسے رخصت کر دیا۔ کرن ناز اب اپنی ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکی تھی۔ اب اس نے نوید انجم سے فیصلہ کن لہجے میں بات کی۔ نوید انجم کے پاس بھی اب کوئی بہانہ نہیں تھا۔ لہٰذا اُس نے بیس دسمبر 2012ء کی تاریخ شادی کے لیے بتائی۔ لیکن 19 دسمبر کو ہی اس نے آ کر یہ دکھڑا سنایا کہ گھر والے تیار نہیں ہیں۔

اتنا سننا تھا کہ کرن ناز آپے سے باہر ہو گئی۔

''میں شادی تم سے کروں گی گھر والوں سے نہیں۔ کرن نے کہا۔'' اگر تم گھر والوں سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو میری عزت کیوں برباد کی۔ دیکھو نوید میں نے اس سے پہلے کئی بار تمہارے کہنے پر ابارشن کروایا ہے۔ لیکن اب میں ایسی حرکت کبھی نہیں کروں گی۔ اگر تم نے شادی سے انکار کیا تو ساری دنیا کو تمہارے کرتوت بتا دوں گی۔'' اتنا سن کر نوید بھی طیش میں آ گیا اور کہا۔

''تم جیسی بے حیا لڑکی سے کون شادی کرے گا جس کے پاس نہ عزت نہ کوئی کردار ہے۔'' اتنا کہہ کر نوید تو چلا گیا لیکن کرن ناز کے پیروں تلے سے زمین

کھسک گئی۔

آج اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اسے اپنے والدین کی بھی یاد آ رہی تھی کہ اگر آج وہ ہوتے تو میں کیوں بے سہارا ہوتی۔ بہرحال اس نے ایک فیصلہ کیا اور جا پہنچی سیدھی مقامی تھانے میں۔ تھانے دار عمران خان وہاں موجود تھے۔ کرن ناز نے اپنی آپ بیتی سنائی تو انھوں نے اسے بعد میں آنے کو کہا۔

کرن ناز تھانے کے چکر لگاتی رہی لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے اپنے علاقے کے ایم پی اے کو ساری بات بتائی تو انھوں نے اُسے تحریک حقوق انسانی کی چیئر پرسن ماریہ کا نمبر دیا۔ کرن ناز نے وہ نمبر ملایا تو ماریہ نے اس کا پورا نام پتا لیا اور خود ملنے کی بات کی۔

دوسرے دن ماریہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرن ناز کے گھر پہنچ گئیں۔

ساری حقیقت سن لینے کے بعد انھوں نے اسے انصاف دلانے کا یقین دلایا اور دو دن بعد ملنے کا کہا۔

دو دن بعد ماریہ کی موجودگی میں ضلع مجسٹریٹ دفتر کے سامنے مظاہرہ ہوا جس میں حقوقِ انسانی کی سینکڑوں، ممبران نے شرکت کی۔ بعدازاں گورنر کو مخاطب کر کے تین نکاتی میمورنڈم بھی ماریہ نے دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے دن تھانہ رنگ پورہ کے انچارج کو خصوصی حکم ملا کہ کرن ناز کے معاملہ میں کارروائی کر کے مطلع کریں۔

مجبور ہو کر تھانے دار عمران خان نوید انجم کو تھانے اٹھا لائے۔ قانون کے ڈر سے نوید تو مان گیا لیکن یہاں بھی اُس نے گھر والوں کی دہائی دی۔ تھانیدار نے گھر والوں کو بھی سمجھایا لیکن وہ کرن ناز کو اپنی بہو بنانے کو تیار نہیں ہوئے۔ معاملہ بنتا نہ دیکھ کر تھانیدار نے روایتی پولیس والوں کا انداز اپنایا۔ قانون کا پاٹ پڑھایا۔ تھرڈ ڈگری سے ڈرایا اور جیل کی دھمکی دی تو وہ بھی ٹوٹ گئے۔

نوید کا سر احساسِ شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔

کرن ناز جب تھانے پہنچی تو وہ اس کے قدموں میں گر گیا۔ کرن ناز نے پیچھے ہٹتے ہوئے خود اس کو اٹھایا۔ خوشی کے آنسوؤں کا سیلاب ہر طرف امڈ آیا۔ تب تک مٹھائی بھی آ چکی تھی۔ سب کا منہ میٹھا کرایا گیا۔ دولہا دلہن تیار تھے۔ لہٰذا تھانیدار دونوں کو لے کر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے۔ جہاں پیش کرنے کے بعد ضلع کچہری کے امام قاری ثناء اللہ نے نوید انجم اور کرن ناز کا نکاح پڑھوایا۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنانے کے بعد نکاح نامے پر دستخط کیے۔ کرن ناز نے دس سال کی عمر سے جتنے غم اٹھائے تھے، آج وہ سب بھول گئی تھی۔ اسے نوید انجم کے کندھوں کا سہارا مل گیا تھا۔

تحریکِ حقوق انسانی کی چیئر پرسن ماریہ تو اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے مقامی اخباروں اور تھانیدار عمران خان کا بھی شکریہ ادا کیا۔

اس واقعے کے کئی پہلو قابلِ غور ہیں کہ اکثر نوجوان لڑکیاں جذبات کے سیلاب میں بہہ کر اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہیں اور پھر ان کا مقدر ذلت و رسوائی بن جاتی ہے۔ کرن ناز مسلسل پندرہ سال ایک شخص کے جھوٹے وعدوں پر بہلتی رہی اور آخر اس نے یہ کہہ کر اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ وہ ایک ایسی بے حیا لڑکی سے کبھی شادی نہیں کر سکتا۔ جس کا کوئی کردار نہیں حالانکہ اسے ذلت کے راستے پر ڈالنے والا وہ خود تھا۔ اگر کرن ناز اس جواب کے بعد رو دھو کر چپ ہو جاتی یا زیادہ سے زیادہ خودکشی کر لیتی تو نوید کا کیا بگڑتا؟ کرن ناز نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے حقوق کے لیے ہر دروازہ کھٹکھٹایا، جہاں سے اسے اس کا حق ملنے کی امید تھی۔ وہ ایسے رفوگر کی تلاش میں تھی جو اس کی عصمت کا چاک دامن رفو کر دے اور آخر میں جیت آج کی عورت کی ہوئی۔

☆☆☆

ہزاروں خونشاب سے تیسری حکایت

دوسرا مُکّا

رانا نعیم اللہ

آسیبی طاقت کا مظہر ایک حکایت

یہ واقعات میری دادی اماں کے ساتھ پیش آئے تو انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ ہم ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ یہاں ہمیں رہائش کے لیے ایک حویلی نما مکان الاٹ ہوا۔ یہ حویلی شہر سے کچھ دور تھی۔ اس میں دو کمرے تھے۔ ہم نے کمرے کی صفائی وغیرہ کی اور سامان وغیرہ رکھ دیا۔ ہم چونکہ کافی سفر کر کے آئے تھے لہٰذا ہم جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔

رات کے تقریباً دو اڑھائی بجے کے قریب مجھے سخت پیاس لگی۔ میں پانی پینے کے لیے کمرے میں گئی اور پانی پی کر واپس آ رہی تھی کہ میری نظر دو نقاب پوشوں پر پڑی جو گلی کے دروازے سے آہستہ آہستہ آ رہے تھے۔ میں سمجھی کہ ضرور یہ چور ہوں گے کیونکہ اس وقت حالات بھی اسی طرح کے تھے۔ آئے روز چوری، قتل اور ڈکیتی جیسی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں دوڑ کر شوہر کے پاس گئی اور انہیں جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لاٹھی لے کر کہا۔

"کہاں ہے چور۔" لیکن اب چور غائب ہو چکے تھے۔ حالانکہ میں نے اپنی آنکھوں سے چوروں کو کمرے کی طرف آتے دیکھا تھا۔ میرے شوہر نے لاٹھی لے کر تمام حویلی چھان ماری مگر چور کہیں نہ ملے۔ میرے شوہر نے آ کر مجھے غصے سے کہا۔

"کچھ ہوش میں رہا کرو۔ آدھی رات کو ساری نیند خراب کر دی۔" اور پھر وہ سو گئے۔

مگر مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے بار بار وہی سین نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرا وہم تو ہو نہیں سکتا مگر...... میں کر بھی کیا سکتی تھی لہٰذا یہ رات میں نے کروٹ بدل بدل کر گزاری۔

☆......☆

اگلی رات ہمارے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے اور شاید میں کبھی نہ بھلا سکوں۔ وہی تقریباً رات کے دو اڑھائی بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے شوہر کی فلک شگاف چیخ سن کر ہڑبڑا کر اٹھی اور دیکھا کہ میرے شوہر کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں حیران و پریشان تھی کہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا اور اپنے دوپٹے سے خون صاف کرنے لگی۔



میرے شوہر نے بمشکل کہا۔ ''وہ...... نقاب پوش...... ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں نے کہا۔ ''آپ حوصلہ کریں اور مجھے تمام بات بتائیں کہ آخر ہوا کیا ہے۔'' انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔

''ابھی کچھ دیر قبل دو نقاب پوش آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ دو دن کے اندر یہ مکان خالی کردو...... یہ مکان ہمارا ہے اور ہم یہاں کسی کو برداشت نہیں کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کون ہیں؟''

وہ غصے میں آگئے اور کہنے لگے۔ ''ہم جو بھی ہیں ہم یہاں انسان کو برداشت نہیں کر سکتے اور اگر تم لوگ کل تک نہ گئے تو پھر...... تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔''

یہ کہہ کر ان میں سے ایک نقاب پوش نے میرا بازو پکڑا۔ اس کے ہاتھ آگ کی طرح گرم تھے اور پھر میرے منہ پر مکا دے مارا اور کہا۔ ''یہ پہلا مکا ہے اگر کل تک نہ گئے تو کل دوسرا اور آخری مکا ہو گا۔''

اور پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ کسی پرندے کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑ گئے۔

میرے شوہر نے بڑی مشکل سے یہ باتیں بتائی تھیں۔

میں نے کہا کہ کل بھی جو میں نے دیکھے وہ بھی نقاب پوش ہوں گے ضرور ان کا کسی جن یا روح سے تعلق ہے اور اب یہ ہمیں اس مکان میں ٹکنے نہیں دیں گے۔''

میرے شوہر نے کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم یہ مکان چھوڑ دیں گے اور ہم کرائے پر ہی کوئی دوسرا مکان لے لیں گے۔''

وہ باقی رات ہم نے جاگ کر گزاری اور صبح ہوتے ہی میرے شوہر نے شہر جا کو مکان لے لیا اور ہم اس حویلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے آئے مگر اس حویلی میں بیتے واقعات آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعات ابھی ابھی رونما ہوئے ہوں۔'' یہ کہہ کر دادی اماں دور خلاؤں میں دیکھنے لگتی ہیں۔

خدا سب کو ان آفات سے دور رکھے، آمین۔

☆☆☆

فیصل آباد سے چوتھی حکایت

پانی کا پھول

فرحت صدیقی

کیا غریب بچوں کا ترقی پر کوئی حق نہیں ہوتا؟

آمنہ بارہ سال کی بچی ہے۔ گورنمنٹ اسکول میں کلاس 6th میں پڑھتی ہے۔ بے حد پیاری بچی ہے پڑھنے میں پرابلم ہو تو میرے پاس آجاتی ہے۔ آمنہ کے والد مزدوری کرتے ہیں۔ ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بارہ سو کرایہ دیتے ہیں۔ اس کے اندر ہی کھڑکی کے ساتھ ایک چولہا رکھا ہے۔ کمرے میں کونے میں ایک چھوٹا سا باتھ روم ہے۔ اندر سے سیڑھیاں لگا کر چھت پر چلے جاتے ہیں۔ اس سوراخ کو ٹین کی کنالی سے بند کر دیتے ہیں۔ آمنہ کی والدہ مشین پر سلائی کر کے ہاتھ کا خرچہ نکال لیتی ہے۔ بے حد شکر گزار گھرانہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دس بارہ سال پہلے جب یہ لوگ یہاں کرائے پر آئے تھے۔ آمنہ تین سال کی تھی اور رابعہ گود میں تھی۔ دروازے کی سیڑھیوں پر بچے اور آمنہ کی والدہ بیٹھے رہتے تھے۔ کیونکہ ہماری گلی آگے سے بند تھی۔ آمنے سامنے بیس گھرانے تھے۔ انہوں نے مل کر گیٹ لگوا لیا تھا۔ اس کو بند کر دینے سے گلی ایک کھلا صحن بن جاتی تھی۔ جس میں بچے کرکٹ اور بیڈمنٹن شوق سے کھیلتے تھے اور خواتین واک کرتی تھیں۔ سارے دن کے کاموں پر تفصیلی گفتگو کرتی تھیں اور دل ہلکا کر کے گھر چلی جاتی تھیں۔ سب ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔

مجھے یاد ہے جب میری والدہ میرے پاس آتی تھیں تو میرے آنے تک بھابی شہناز امی کے پاس رہتی تھیں۔ وہ سارے محلے کی بھابی تھیں۔ ہاں تو میں بات کر رہی تھی آمنہ کی۔

ایک دن صبح جب میں اسکول جا رہی تھی تو آمنہ کی والدہ نے مجھے روک کر پوچھا۔

''باجی آپ کے اسکول کی کتنی فیس ہے۔ آمنہ تین سال کی ہو گئی ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ اسے آپ کے اسکول میں داخل کرواؤں۔''

''صفیہ مجھے ذرا جلدی ہے واپسی پر بات کرتے ہیں۔'' بھابی شہناز ساتھ ہی کھڑی تھیں۔

''باجی آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں بتا دوں گی آپ اسکول جائیں۔'' بھابی نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ ہر انسان کی اپنی زندگی ہوتی

ہے۔ لیکن اپنے بچوں کے لیے اس کی سوچ ہمیشہ اونچی رہتی ہے۔ اے لیول کی فیس تو ہزاروں میں ہوتی ہے۔ میرا حوصلہ نہ تھا کہ صفیہ کا دل توڑتی۔

وقت کا کام ہے گزرنا۔ وہ گزر جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد میں نے دیکھا کہ صفیہ کے بچے گورنمنٹ اسکول میں جا رہے ہیں۔ جہاں کتابیں اور یونیفارم بھی فری ہوتا ہے۔ ہم سب محلے والے اس کا بے حد خیال کرتے۔ اس کے بہنوئی کو بلڈ کینسر ہوگیا۔ اس کی بہن بھی کپڑے سلائی کرتی تھی۔ سب محلے والوں نے مل کر اس کے مہنگے ترین انجکشن کا اور ضروریات زندگی کا بوجھ اٹھایا۔

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ بھابی شہناز نے گھر سے باہر تھوڑی سی کچی زمین میں پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ جن کی خوشبو ہمارے گھر تک محسوس ہوتی۔ ان دنوں پیار کی برسات تھی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ بھابی شہناز نے درس کے لیے کسی بزرگ کو بلایا تھا۔ پوری گلی میں قنات اور شامیانے لگا دیے گئے تھے۔ خواتین کے لیے چھت پر جگہ تھی۔ عشاء کے بعد دعا تھی اور پھر کھانا، میں گھبرا گئی تھی۔ کم از کم دو سو خواتین اور چار سو سے زائد مرد حضرات...... میں نے گیراج میں صرف دو دیگیں دیکھی تھیں۔ ایک پلاؤ کی اور ایک زردے کی۔ میں چھت سے نیچے گیراج میں آئی تو سلیم بھائی۔ (شہناز کے میاں) ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے تھے۔ میں چپ چاپ کھڑی تھی۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' انہوں نے بلند آواز پڑھی۔ کھانا تقسیم ہونے لگا۔ میں چپکے سے گھر آ گئی کہ یا خدایا۔ کھانا اتنا کم ہے اور لوگ اتنے زیادہ کیا ہوگا۔ میں نے بچوں کو کھانا کھلایا۔ خود بھی کھایا۔ اور وہیں سونے لگی کہ دروازے پر بیل کی آواز گونجی۔

گیٹ پر انعم کھڑی تھی۔

''آنٹی آپ کھانا کھائے بغیر ہی آ گئیں۔'' اس نے شکوہ کیا۔ ساتھ ہی بڑی سی پرات میرے آگے کردی۔ جس میں پلاؤ اور زردہ تھا۔

درد بے کراں

تنہا شاموں اور اکیلی راتوں کا درد
کرب میں گزرتا لمحہ
ذہن پر سوار سلگتی یادوں کے بپھرے سانپ
جینے کی آرزو میں
پل پل کا مرنا
مردہ جسم اور چھلنی روح میں
اب بھی ترے نام کی تڑپ موجود ہے
شاید کبھی تم پوچھ لو مجھ سے
تنہا شاموں اور اکیلی راتوں کا درد

علی رضا عمرانی۔ سجاول

''انعم آپ سب کھانا کھالیں۔ ہم نے کھالیا ہے۔''

''آنٹی سب نے کھانا کھا لیا ہے۔ اور سارے محلے میں اتنا تقسیم بھی کر دیا ہے۔'' ابھی بھی آدھی دیگ کھانے کی ہے۔

یہ ہوتا ہے خدا پر یقین۔ یہ ہوتا ہے اپنے رب پر ایمان اور یہ ہوتا ہے اس کی رحمت کی نوازش...... اللہ تعالیٰ نے اللہ کے نام پر کھانا کھلانے والوں کی عزت رکھ لی تھی۔ سات سو کے قریب کھانا کھلایا بھی گیا اور تقسیم بھی کیا گیا۔

سبحان اللہ۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی آمنہ کی۔ خود کلاس چھٹی میں پڑھتی ہے۔ اپنے سے چھوٹی دونوں بہنوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی پڑھاتی ہے۔ اکثر سندس کو بازار سے سودا سلف بھی لا دیتی ہے۔ اچانک مہمان آجاتے ہیں تو دہی بھلے، سموسے اور جلیبیاں یہاں گھر کے لیے منگواتی ہیں۔ اس کے لیے علیحدہ سے منگوا کر دیتی ہے۔

اردو کی نظم کی تشریح کرنا آتا ہے۔ آمنہ کو بھی تشریح کروا رہی تھی۔ کہ پانی کی پلاسٹک کی بوتل میں ٹھنڈا پانی تھا۔ اس کو اٹھا کر میں پی رہی تھی۔

میز پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ آمنہ چمک کر بولی۔

''آنٹی! یہ دیکھو پانی کا پھول۔'' میں سوچ کر رہ گئی۔ ''پانی کا پھول'' شاید آمنہ بھی پانی کا پھول تھی۔ آمنہ بھی خواب دیکھتی ہے۔ پھولوں کو محسوس کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں بھی رنگ ہی رنگ ہیں۔ وہ شکر گزاری کے رنگ دیکھتی ہے۔ آمنہ پڑھ کر جا چکی تھی۔ میری سوچ کا دائرہ 'پانی کے پھول' کے گرد ہی گھومتا رہا۔

☆......☆......☆

شام کو مجھے ڈاکٹر کی طرف جانا تھا۔ آمنہ کے گھر کے پاس سے گزری۔ تو وہ سو رہی تھی۔ رابعہ اور وینا دونوں کھیل رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چمکتا ہوا کوئی کپڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ہمارے اسکول میں ایک دن پہلے اسپورٹس ڈے KGS کو رنگ برنگے غباروں کے ساتھ اڑا دیا گیا تھا۔ وہ شاید اڑتا ہوا آمنہ کی چھت پر گر گیا تھا۔

میرا دل اندر سے دکھ سے بھر گیا۔ کاش آمنہ جیسے بچے بھی بیرر کے ساتھ کھیلنے کے بجائے ان اسکولوں میں پڑھ سکیں۔ جہاں کائنات کے سارے رنگ موجود ہوتے ہیں۔ A/C کمروں کے علاوہ Activity کے نام پر ہزاروں بچوں کو خوش کیا جاتا ہے۔

لیکن آمنہ!!

وہ تو پانی کا پھول ہے لمحوں میں غائب ہو جائے گا۔

کاش ایسا نہ ہو۔ کاش ویسا نہ ہو۔

یہ بچی پڑھ لکھ کر الیکشن میں کھڑی ہو۔ اور کامیاب ہو کر وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچ جائے۔ تو وہ ضرور سچ مچ کے پھولوں سے معاشرے کو مہکا سکتی ہیں۔

''پانی کے پھول، کے بجائے امن، محبت اور سکون کی خوشبو سے، اپنے ملک کو مہکا سکتی ہے۔

☆☆......☆☆

نو عروس البلاد سے پانچویں حکایت

سوال؟



ایڈیسن ادریس مسیح

ایڈیسن کے قلم سے نکلی ایک نشتر حکایت جو نا جانے کتنوں کو لہولہان کرے گی

آج میرا احساس میرا ہاتھ تھام کر مجھے شہر کی سب سے زیادہ بلند عمارت پر لے گیا جہاں سے میں تقریباً پورا شہر جھانک سکتا تھا۔ شروع میں انتہائی بلندی نے مجھے خوف زدہ کر دیا مگر کچھ ہی دیر میں میں نے اپنے خوف پر قابو پا کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تو مبہوت رہ گیا بلند و بالا عمارات بڑی بڑی گاڑیاں چوڑے تنوں والے پھیلے پھیلے درخت لمبی لمبی آوارہ سڑکیں اور سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی زندگی...... سب کچھ میرے سامنے یوں کھلا پڑا تھا جیسے میں کسی آرٹ گیلری میں کھڑا کسی بہت بڑے مصور کی منی ایچر پینٹنگ دیکھ رہا ہوں۔ او...... ف کس قدر خوب صورت احساس تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے نیچے سڑک پر بہت ساری سفید سفید بطخیں تیرتی دکھائی دیں۔ میں چونک گیا پھر ذرا غور کیا تو وہ بطخیں دراصل سفید اجلے یونیفارمز میں ملبوس شہر کے اعلیٰ ترین کالج کی طالبات تھیں۔ انہوں نے ایک بڑے سے بینر پر کچھ لکھا ہوا تھا اور نازک نازک ''تتلیاں'' لہرالہرا کر حقوقِ نسواں کے لیے نعرے لگا رہی تھیں۔ انہوں نے رنگ برنگے پلے کارڈز بھی اٹھا رکھے تھے جن پر دو مختلف خواتین کی تصاویر چپکائی گئی تھیں۔ جہاں تک میں انہیں پہچان پایا' یہ وہی خواتین تھیں جن کے حوالے سے میڈیا آج کل انصاف کی جنگ لڑنے میں مصروف تھا۔ ساٹھ' ستر طالبات اوران کی میک اپ زدہ استانیوں پر مشتمل پلے کارڈز لہراتا' نعرے اچھالتا یہ قافلہ تو میرے سامنے سے جلد ہی گزر گیا مگر بڑے بڑے سوالیہ نشان دیر تک فضا میں تیرتے رہے۔

☆......☆

چوراہے پر نصب سگنل نے اشارہ دیا تو فٹ پاتھ پر بیٹھی تین چار رنگ برنگی گٹھریوں میں جیسے بجلی بھرگئی۔ ''امت' جنگ' ایکسپریس' ریاست...... آج کا تازہ اخبار...... آج کا تازہ اخبار...... اخبار پڑھیں' باخبر رہیں۔''

مرجھائی ہوئی آنکھوں' ستے ہوئے چہرے والی کمزور سی عورت سب کو باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اخبار بیچ رہی تھی مگر خود بے خبر تھی کہ آج کے دن کی سب سے بڑی خبر تو وہ خود ہے۔ آج کا دن اس کا دن ہے' حقوقِ نسواں کا دن ہے۔

''اے بابو دے ناں اللہ کے نام پر دے دے۔ کوئی روپیہ دو روپیہ دے دے' اپنے بچوں کے سر کا صدقہ دے دے۔ اللہ جوانی سلامت رکھے۔'' زرد چہرے' الجھے بال' چیتھڑوں میں پھولا ہوا پیٹ چھپاتی وہ کم عمر بھکارن ہر راہ گیر سے روپے دو روپے کا سوال کررہی تھی۔ مجھے تو لگا' اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان پل رہا ہے۔ میں نے فوراً اپنی نظریں اس سے ہٹالیں۔ اب میری آنکھیں سگنل کے دوسری طرف ایک بند دکان کے تھڑے پر کھڑی برقع پوش لڑکی کی خوف میں ڈوبی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس کا ہر انداز گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی' شاید وہ بہت جلدی میں تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے بالکل پاس آکر ایک اسپورٹس بائیک رکی۔ لڑکی کچھ اور گھبرا گئی اور اپنے بیگ میں سے نیلے نیلے نوٹوں کی ایک تگڑی گڈی نکال کر لڑکے کو تھمائی۔ لڑکے نے بھی اپنی شرٹ کا اوپر والا بٹن کھول کر گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر لڑکی کو دے دیا۔ نوٹوں کی گڈی گریبان میں ڈال کر لڑکی پر تقریباً جھکتے ہوئے راز کے سے انداز میں کچھ کہا اور پھر پتلون کی سائیڈ والی جیب میں سے دو تین فلم رولز (film roles) نکال کر لڑکی کو دکھائے دوبارہ جیب میں رکھ کر بائیک اسٹارٹ کی اور یہ جا' وہ جا۔ لڑکی صدمے کی حالت میں گنگ کھڑی رہ گئی' خوف زدہ آنکھیں اب برسنے لگیں۔ ان آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی بجائے سوالیہ نشان پھسل رہے تھے۔

☆......☆

جدید سہولیات سے آراستہ شہر کے مہنگے ترین اسپتال کی ایمرجنسی میں ایک خاتون لائی گئی تھیں۔ جس کے چہرے پر کسی نے تیزاب ڈال دیا تھا۔ عملے میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگوں میں بے چینی دوڑ گئی۔ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟

بڑے بڑے سوالیہ نشان اسپتال کے کوریڈور میں اڑنے لگے۔

☆......☆

اس سیلن زدہ کمرے میں موجود چار پانچ کتے زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ وڈیرے نے اپنی صاحب حیثیت بھتیجی کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اس پر کاروکاری کا الزام لگایا تھا اور اس کے پیچھے ان کتوں کو دوڑایا تھا۔ کتوں نے اس لڑکی کو بری طرح سے بھنبھوڑا تھا۔ کتے...... اب اتنے بھی کتے نہیں تھے' بے گناہ انسانی خون ان سے ہضم نہیں ہوپایا' وہ نیم غنودگی میں تھے' اُن کے چوڑے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں سوالیہ نشان بن کر فضا میں بکھر رہی تھیں۔

☆......☆

شہر کی ہماہمی سے دور کسی مضافاتی علاقے میں شام گہری ہوتی جارہی تھی۔ گارے سے لپے صحن میں مٹی کے چولہے میں لوہے کی پھونکنی سے آگ پھونکتی ہوئی زرینہ...... اپنی عمر سے دس سال بڑی دکھائی دیتی ہے۔ کل رات اس کے گیراج میں کام کرنے والے بددماغ شوہر نے لوہے کی اسی پھونکنی سے مار مار کر اس کی کمر اور چہرہ زخمی کردیا تھا۔ بات کیا تھی؟ شاید سالن میں نمک زیادہ ہوگیا تھا یا کوئی روٹی کچی رہ گئی تھی۔ پتا نہیں' کیا بات تھی؟ مگر اس کے شوہر نے صبح بھی اسے گالیاں دی تھیں۔ اس نے پھر بھی اس کے لیے ناشتا بنایا' غسل خانے میں پانی بھرا اور روز کی طرح دروازے تک چھوڑنے بھی آئی تھی۔

آج شام تک اس کا منہ بری طرح سوج چکا تھا۔ آنکھ کے پاس بڑا سا نیل ابھر آیا تھا۔ پڑوسن کی دادی نے کہا تھا۔ "پانی میں نمک ڈال کر گرم کر لو' ٹکور کرو گی تو آرام آجائے گا۔" اس کے سپاٹ لہجے میں برسوں کی تھکن اور بوڑھا تجربہ جھلکتا تھا۔

زرینہ اب چولہے میں آگ پھونک رہی ہے' پھونکنی میں منہ بھر بھر کر پھونک مارنے سے پورے بدن میں لہریں دوڑ جاتی ہیں مگر وہ برداشت کر رہی ہے' اس کو پانی ضرور گرم کرنا ہے' اپنی سوجن کی ٹکور کے لیے نہیں بلکہ اپنے گیراج میں کام کرنے والے شوہر کے لیے...... گریس' تیل سے سنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح صاف نہیں ہوتے ناں......

مٹی کے چولہے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سوکھی' گیلی لکڑیوں سے دھواں اٹھ اٹھ کر شام کے دھندلکے میں مدغم ہونے لگا... مگر...... وہ دھواں...... اس دھوئیں کے مرغولوں سے بھی بڑے بڑے سوالیہ نشان تشکیل پانے لگے۔

☆......☆

شہر کے ایک ماڈرن علاقے کی جدید طرز پر بنی رہائشی عمارت کے تیسرے فلور کی کھلی کھڑکی سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ "مجھے بتاؤ' تمہارے ساتھ problem کیا ہے؟ یہ میرا آج کا فیصلہ نہیں ہے' میں تو پہلے سے کام کر رہی ہوں۔ تمہیں سب پتا تھا' You should have thought before marriage."

"نینا...... وہ بات اور تھی' اب تم married ہو اور تم سے یہی ایکسپیکٹ کیا جاتا ہے کہ تم اپنا maximum time گھر پر spend کرو۔"

"میں کوئی جاہل عورت نہیں ہوں' educated ہوں' باشعور ہوں۔ تمہارے پیچھے نہیں چل رہی' میں کئی contacts ہیں میرے اس شہر میں' تم مجھے نہیں دبا سکتے۔ I know my rights very well. تمہیں پتا ہے' تمہارا problem کیا ہے؟ You are becoming jealous of my fame but listen, modelling is my passion, its my life, I can't leave it."

"پلیز' try to understand تم یوں اسکرین پہ آتی ہو' مجھے اچھا نہیں لگتا۔ when people talk about your figure, your beauty, your smile, like.....like a show piece, I.....I.....just feel very bad. بس میں چاہتا ہوں' تمہیں کوئی اور نہ دیکھے۔"

"oooh.....shut up, don't give me lollypop. سب سمجھتی ہوں میں' اب تم مجھے گھر پہ قید کر کے رکھنا چاہتے ہو۔ its impossible اور تم اتنی گھٹیا سوچ کے مالک ہو' I just couldn't imagine. میں اب ایک لمحہ تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ divorce me. leave me right now."

نسوانی آواز پر گویا ہذیان طاری ہو چکا تھا۔ یہ بھی تو عورت ہی تھی' باشعور پڑھی لکھی' اپنے حقوق سے آگاہ اور فرائض سے بے بہرہ...... آج کی یہ نام نہاد عورت...... اس نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں' اس نے دوپٹے سے آزادی حاصل کر لی ہے' اب اس کی دنیا چار دیواری تک محدود نہیں ہے مگر افسوس' اس کے سر پہ اب چھت بھی تو نہیں رہی......

اب یہ دیناروں میں نہیں بکتی' کانٹریکٹس سائن کرتی ہے۔ اب بادشاہوں کے دربار میں ننگی نہیں نچوائی جاتی' پرائیویٹ ہاٹ مجرے ازخود پیچرائز کرواتی ہے اور شوبزنس میں کام کرنے سے منع کرنے پر شوہر کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اس بنا پر شوہر کو چھوڑ کر جاتی عورت کی کھٹ کھٹ کرتی سینڈل کے نیچے بہت سارے سوالیہ نشان کچلے جا رہے تھے۔ اس طرح کچلے جانے پر جیسے سوالیہ نشانوں کو برا لگا' سارے اڑ اڑ کر میرے پاس اوپر شہر کی سب سے اونچی عمارت پر چڑھ آئے اور میرے سر' چہرے' سینے' کاندھوں سے ٹکرا ٹکرا کر مجھے زخمی کرنے لگے۔ میری سانس پھول گئی اور میں بھاگنے لگا۔ میں بھاگ کر نیچے چھپ جانا چاہتا تھا' انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جانا چاہتا تھا مگر میرے قدم جیسے جم سے گئے تھے' گہری اداسی میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی' تبھی سے مجھے احساس ہو رہا ہے' میرے اندر بھی ایک سوالیہ نشان پیدا ہو رہا ہے' بہت بڑا...... اعصاب شکن...... تکلیف دہ سوالیہ نشان' کیا آپ کے بھی......؟

☆☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

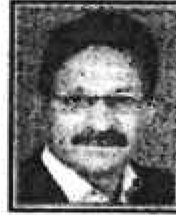
ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

اجنبی محبوبہ



جاوید راہی

قتل کی ایک ایسی داستان، راہی صاحب خود بھی جس کا حصہ بن گئے

کہانیاں لکھنا میرا پیشہ نہیں شوق ہے اور اللہ کا فضل ہے کہ اس شوق کی تکمیل کے لیے مجھے بہت سے مہربانوں کا محبت بھرا تعاون حاصل ہے جن میں اخبارات و رسائل کے مالکان ایڈیٹر اور دیگر حضرات شامل ہیں ویسے تو میں نے انسانی زندگی کے ہر شعبے پر قلم زنی کی ہے لیکن میرا خصوصی موضوع جیل کی دیواروں کے پیچھے آہنی سلاخوں میں محصور قیدیوں کی زندگی کی داستانیں ہیں جو نجانے کیوں اللہ کی اس خوبصورت عطا کو یعنی زندگی کو جذبات کی بھینٹ چڑھا کر خود کو کھو دیتے ہیں۔ ہمیشہ ان کے لیے افسردہ رہتا ہوں اور مقدور بھر کوشش کرتا ہوں کہ ان کی تھوڑی سی دلجوئی ہی کرسکوں، اس طرح میرے محسنین مجھے جیل کہانی والے جاوید راہی کہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میری خوش بختی نے مجھے بہت ہی اچھے دوست عطا کیے ہیں جن میں اخبارت و رسائل کے مالکان ایڈیٹر، ٹی وی چینلز، پولیس افسران، وکلاء، بیرسٹر، جج صاحبان اور جیلر حضرات شامل ہیں۔ مجھے ان سب کا تعاون حاصل ہے اور یہ سب جاوید راہی کو ایک دیانت دار اور معتبر شخصیت سمجھتے ہیں۔ زیادہ تر میں نے جیل میں محصور قیدیوں کی آپ بیتیاں لکھی ہیں لیکن کبھی کچھ کہانیاں خود بخود مجھ تک پہنچ جاتی ہیں اور زیر نگاہ کہانی نے تو مجھے خوب رقص کرایا ہے۔

اس کی تفصیل سنئے یہ بھی خوب کہانی ہے اس کا آغاز خوبصورت خوشبودار لیٹر پیڈ پر درج شدہ ایک خط سے ہوتا ہے جو مجھے ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ بہت سنبھال کر لفافہ چاک کیا۔ بڑی نفاست سے تہہ کیا ہوا خط کھولا، لکھا تھا۔

جناب جاوید راہی صاحب!

میں آپ کی تحریروں کی پرستار ہوں اور طویل عرصے سے آپ کی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں لیکن ایسے ہی ڈرامائی انداز میں جیسی ڈرامائی سچویشن آپ کی کہانیوں میں ہوتی ہے۔ ایک تقریب ہونے والی ہے جس میں آپ کی شمولیت کا دعوت نامہ اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔ آپ اس تقریب میں آئیں اور مجھے تلاش کر کے مجھ سے ملیں، اپنا مختصر حلیہ میں آپ کو بتاتی ہوں۔

میرا رنگ گلابی ہے، قد پانچ فٹ سات انچ ہے، بدن خوبصورت ہے، آنکھیں سیاہ اور روشن ہیں، بس اس سے زیادہ نہیں بتاؤں گی باقی کام آپ کا۔

چشم براہ

الماس فردوس

کافی دلچسپ خط تھا، ایک کہانی کار اگر حسن پرست نہ ہو تو کہانی کبھی مکمل نہیں ہوتی، اپنے رومانی ذوق کے مطابق سب سے پہلے الماس فردوس کی خیالی تصویر نگاہوں میں اُبھرنے لگی۔ درمیانے قد کی ایک دوشیزہ تصور میں مسکرانے لگی۔ اس کا رنگ گلابی مائل تھا، لباس کے پیچ وخم میں جگہ جگہ سے ڈوبتی اُبھرتی جارہی تھی، اچھا ہی رنگ روپ لے کر شباب کی پنکھڑیاں کھول رہی ہوگی، جو کچھ بھی ہو کسی اجنبی دوشیزہ کے لگاوٹ بھرے بلاوے پر اس کے گھر جانا دانش مندی نہیں تھی۔ بعض احمق کبھی کبھی مجھے زنانہ نام سے خط لکھتے ہیں، اپنے خط کا جواب حاصل کرنے کے لیے خود کو نازک اندام دوشیزہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یعنی مجھے احمق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میں ایسے خطوط کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہوں۔ شاید الماس فردوس کے خط کا بھی یہی انجام ہوتا مگر اس خط کے نیچے اس کے باپ کا جو نام لکھا ہوا تھا اسے پڑھ کر میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے باپ کا نام نادر علی شاہ تھا، اس کی ایک شاندار کوٹھی تھی، وہ ولایتی شراب کا لائسنس یافتہ امپورٹر تھا اور کروڑ پتی بن گیا تھا۔ ایک ماہ پہلے کی بات ہے، میں دفتر میں صبح کے وقت ایک میگزین کے ایڈیٹر کے پاس بیٹھا تھا جو میرا دوست بھی تھا ہم دونوں ایک کہانی کے موضوع پر بحث کر رہے تھے، اچانک ہی نادر علی شاہ دندناتا ہوں میرے دفتر میں داخل ہوا پھر ہمارے سامنے میز پر ایک میگزین پھینکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جرم کہانی لکھنے والا جاوید راہی کون ہے؟''

ایڈیٹر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں مگر بات کیا ہے؟''

نادر علی شاہ نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو آپ ہم جیسے شریف آدمیوں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔''



''نہیں، میں قلم کی روشنائی اچھالتا ہوں اگر روشنائی کا کوئی دھبہ آپ کے دامن تک پہنچا تو اس کی وضاحت فرمائیں۔''

نادر علی شاہ نے میز پر پڑے ہوئے میگزین کو اُٹھا کر کہا۔ ''آپ نے مجھ پر اور میری بیٹی پر یہ کہانی لکھی ہے۔''

''تعجب ہے، میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے اور آپ کی بیٹی کو آج تک نہیں دیکھا۔ آپ لوگوں کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔''

''آپ جھوٹ کہتے ہیں آپ نے اس کہانی میں باقاعدہ میرا اور میری بیٹی کا نام لکھا ہے میرا نام نادر علی شاہ ہے، میری بیٹی کا الماس ہے۔ آپ یہ کمزور سا عذر پیش نہ کریں کہ آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ جیسے لکھنے والوں کی معلومات بہت وسیع ہوتی ہیں۔ آپ جاسوسوں کی طرح دولت مند گھرانوں میں جھانکتے پھرتے ہیں، آپ نے اس کہانی میں لکھا ہے کہ میں شراب کا امپورٹر ہونے کے باوجود غیر قانونی طور سے شراب کشید کرتا ہوں اور میری بیٹی الماس فلرٹ قسم کی لڑکی ہے، آپ نے اس پر یہ شرمناک الزام لگایا کہ اس نے کتنے ہی عاشق پال رکھے ہیں۔''

نادر علی شاہ کے ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔ ''میرا نام انسپکٹر آغا دلاور ہے، آپ ثبوت پیش کریں کہ نادر علی شاہ صاحب قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شراب کشید کرتے ہیں، ثبوت ملتے ہی میں انہیں گرفتار کرلوں گا، ورنہ آپ پر یہ ہتک عزت کا دعویٰ کیا جائے گا کیونکہ آپ نے ان کی نیک سیرت صاحبزادی پر بھی کیچڑ اُچھالا ہے۔''

''اگر میں نے سچی کہانی لکھی ہوتی تو ضرور ثبوت پیش کردیتا، میری خیالی کہانی کے کرداروں کے نام محض اتفاقاً نادر علی شاہ اور ان کی صاحبزادی کے ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں، آپ کے یہ نادر علی شاہ لائسنس یافتہ امپورٹر ہیں اور میری کہانی کا کردار غیر قانونی طور پر شراب کشید کرتا ہے دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔''

''کوئی فرق نہیں ہے۔'' نادر علی شاہ نے گرج کر کہا۔ ''آپ ذرا سی ہیرا پھیری سے بات بدل رہے ہیں۔''

میں بے چینی سے ایڈیٹر صاحب کا منہ دیکھنے لگا، ان کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ اُبھری تو میری جان میں جان آئی کہ ضرور کوئی نکتہ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''یہ جتنے مصنف حضرات ہر ماہ اتنی کہانیاں لکھتے ہیں کہ اپنی ہی لکھی ہوئی پچھلی کہانیوں کی تفصیلات انہیں یاد نہیں رہتیں لیکن میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی کہانیوں کے ایک ایک فقرے کو اپنی یادداشت میں محفوظ رکھتا ہوں، میں آپ کی بات کا جواب دینے سے پہلے انسپکٹر صاحب سے پوچھوں گا کیا انہوں نے جاوید راہی کی یہ کہانی خود پڑھی ہے؟''

''ہاں میں نے خود پڑھی ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''آپ غلط کہتے ہیں انسپکٹر صاحب، آپ صرف نادر علی شاہ صاحب کے بھڑکانے پر یہاں آ گئے ہیں۔ اگر آپ نے اسے پڑھا بھی ہے تو اس کے آخری پیرا گراف پر توجہ نہیں دی ہے۔ لیجئے میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ایڈیٹر صاحب نے میری چھپی ہوئی کہانی کا آخری صفحہ کھول لیا۔ آخر میں لکھا تھا۔

''پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی میں نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو پتا چلا کہ میں اپنی خواب گاہ میں زندہ سلامت ہوں اور شراب کشید کرنے والے کسی مجرم نے مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنایا ہے۔ جو کچھ دیکھا خواب تھا جو سنا افسانہ تھا۔''

میں اپنی ہی کہانی کا یہ پیراگراف سن کر خود کو کوسنے لگا کہ مجھے اپنی پچھلی کہانیاں کیوں یاد نہیں رہتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

''کیوں انسپکٹر صاحب! اب تو ثابت ہو گیا کہ نادر علی شاہ، فلرٹ کرنے والی صاحبزادی الماس فردوس کا نہ تو حقیقتاً کوئی وجود ہے اور نہ ہی یہ کسی کہانی کے کردار ہیں، یہ محض ایک اُلجھے ہوئے خواب کی باتیں تھیں۔''

نادر علی شاہ نے جھنجلا کر گھونسا دکھاتے ہوئے کہا ''میں سب سمجھتا ہوں، خواب دیکھنے کی آڑ لے کر مجھے مجرم ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، تم میرا کچھ

نہیں بگاڑ سکتے اور یاد رکھنا اگر تم نے آئندہ کسی کہانی میں میری بیٹی الماس کا نام بھی لیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

میں نے غصے سے اُٹھتے ہوئے کہا "تمہاری الماس ہے کس کھیت کی مولی؟ اگر تمہاری بیٹی بھول سے بھی میری کہانی میں آنا چاہے گی تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا۔ "مسٹر جاوید، آپ میرے سامنے الماس کا گلا گھونٹ کر اسے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔"

"آپ کے سامنے نادر علی شاہ صاحب بھی مجھے شوٹ کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔"

"مسٹر نادر علی شاہ اس وقت نشے میں ہیں مگر آپ ہوش وحواس میں ایسا کہہ رہے ہیں، میں آپ سے بعد میں نمٹ لوں گا، چلئے نادر شاہ صاحب۔۔۔"

ایڈیٹر صاحب نے کہا "جناب ہمارے ہاں پانی کی افراط ہے ٹھنڈا پانی پی کر جائیں۔"

مگر وہ گرم ہو کر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد ایڈیٹر صاحب نے مجھے سمجھایا۔

"جاوید صاحب کسی کو اس طرح مار ڈالنے کی دھمکی نہیں دینا چاہیے، آپ کسی کہانی کے کردار نہیں ہیں حقیقی زندگی میں ایسی دھمکیوں سے مجرمانہ خیالات کو پر لگ جاتے ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "آپ صرف مجھے الزام دے رہے ہیں، کیا آپ نے نہیں سنا وہ غصے میں کیا بکواس کر رہا تھا۔" بہرحال کافی دیر تک یہ موضوع گرم رہا تھا۔

دوسرے دن نادر علی شاہ کی کال موصول ہوئی۔ "مسٹر جاوید سے بات کرنی ہے۔"

"جی بول رہا ہوں۔"

"مسٹر جاوید، میں اپنے پچھلے دن کے رویے پر شرمندہ ہوں، دراصل میں نے بہت زیادہ پی لی تھی، بعد میں، میں نے کہانی کا آخری پیراگراف پڑھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میری بیٹی الماس ہر ماہ آپ کی کہانیاں پڑھتی ہے، اس نے بھی آپ کی حمایت کی ہے۔"

"آپ نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے صحیح معنوں میں انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے کیونکہ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے اس کا اعتراف کرنا بڑی بات ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آج شام کی چائے آپ میری فیملی کے ساتھ پئیں، الماس کو بہت خوشی ہو گی۔"

"مجھے بھی یقیناً خوشی ہو گی مگر افسوس کہ میں چند دنوں تک بہت مصروف رہوں گا، آپ کچھ خیال نہ کریں جب بھی فرصت ملے گی میں آپ کو فون پر اطلاع دے کر حاضر ہوں گا۔"

میں نے نادر علی شاہ کا موبائل نمبر اپنے پاس محفوظ کر لیا، یہ سب ایک ماہ پہلے کی باتیں تھیں اور اب یہ الماس فردوس کا خط آیا تھا جو نادر علی شاہ کی بیٹی تھی، میں خط کو دوبارہ پڑھنے لگا۔ اس نے بڑی بے باکی سے لکھا تھا۔

"آپ کی کہانیاں پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرنے لگی ہوں جیسے ان کہانیوں کے رومانی ماحول میں آپ مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں، آپ اسے میری خوش فہمی سمجھ لیں مگر ہر جوان لڑکی کی طرح مجھے بھی سہانے خواب دیکھنے کا حق ہے۔"

اس کی بے باک تحریر بتا رہی تھی کہ واقعی وہ فلرٹ کرنے والی لڑکی ہے، تحریر کی نصف ملاقات میں اس حد آگے بڑھ گئی تھی اگر کوئی خوش آمدید کہنے والی ہو تو اور اس نے اپنا جغرافیہ بھی بتا دیا ہو تو اپنا دل بھی اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ میں نے وہاں اس لیے بھی جانا مناسب سمجھا تھا کہ میں اس کے باپ کی طرف سے موصول ہونے والی کال میں اس سے کبھی کسی دن آنے کا وعدہ کر چکا تھا، چنانچہ میں نے دعوت والے دن شام کو نادر علی شاہ کا نمبر ملایا دوسری طرف نادر علی شاہ ہی تھا اور جب اس نے میرا نام سنا تو خوشی سے چہک کر کہا۔

"ہیلو مسٹر جاوید، کیسے خوشی کے موقع پر آپ نے یاد کیا ہے، آج تو آپ کو ضرور آنا ہو گا، یہاں ڈنر پارٹی ہے، آج رات بھر جشن منایا جائے گا، آپ نہیں آئیں گے تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے میری غلطی کو اب تک یاد رکھا ہے۔"

"نہیں نادر شاہ صاحب، مجھے اب آپ سے کوئی

شکایت نہیں ہے، میں ڈنر کے وقت پہنچ جاؤں گا۔"

"اوہ تھینکس اے لاٹ، میں یہ خوشخبری ابھی اپنے بچوں کو سناتا ہوں۔" اس نے فون بند کر دیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا نادر علی شاہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کی بیٹی الماس فردوس مجھے دعوت نامہ بھیج چکی ہے۔ شاید یہی بات تھی کہ بیٹی نے باپ کے علم میں لائے بغیر مجھے مدعو کیا تھا۔ میں نے بھی گفتگو کے دوران اس دعوت نامے کا ذکر نہیں کیا کہ اس کی تحریر میں جوانی چٹخارے لے رہی تھی، پھر اس نے شرط رکھی تھی کہ میں وہاں پہنچ کر کسی سے اس کا نام نہ پوچھوں، خود ہی اسے ایک جاسوس کی طرح تلاش کروں، لہٰذا میں اسے تلاش کرنے کے لیے رات کے آٹھ بجے گھر سے نکلنا چاہتا تھا مگر بھلا ہو ایڈیٹر صاحب کا عین وقت پر ان کی کال آگئی۔

"کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔"

"نہیں بھئی، تھوڑا لیٹ کر دو ایک بڑی گرم خبر ہے، اس کو آج کے ایڈیشن میں شامل کرنا ہے۔ میرا ایک ماتحت چھٹی پر ہے اس لیے تمہیں اس کی جگہ کام کرنا ہے جلد آجاؤ۔"

میرا گھر ایڈیٹر صاحب کے آفس سے زیادہ دور نہیں تھا، میں نے وہاں پہنچ کر تمام کام نمٹایا اس میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہوئے، جب دس بجے میں وہاں سے چلنے لگا تو ایڈیٹر صاحب نے کہا۔

"ڈنر پر اس وقت۔۔۔۔"

"ہاں بھئی نیو ائیر فل نائٹ تقریب ہے۔"

"مگر آپ اس میں کیسے شریک ہو رہے ہیں وہاں تو اندھیرا ہوتا ہے اور آپ کو اندھیرے میں بڑا ڈر لگتا ہے۔"

واقعی میری ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ اچانک گھپ اندھیرا ہو جائے تو مارے خوف کے میری جان نکلنے لگتی ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں، لڑنے مرنے کے معاملات میں پیش پیش رہتا ہوں، جوڈو کراٹے کے فن سے واقف ہوں، کوئی دشمن مقابلے پر آ کر میرے نام پر شکست نہیں لکھ سکتا مگر اندھیرے میں اس لیے گھبرا جاتا ہوں بلکہ حواس باختہ ہو جاتا ہوں کہ پتا نہیں موت کس طرف سے آ رہی ہے۔ بہر حال میں نے ایڈیٹر صاحب سے پوچھا۔

"کیوں وہاں اندھیرے کا کیا کام، آپ مجھے خوامخواہ ڈرا رہے ہیں۔"

"بھئی کیا تم نے کبھی دیکھا نہیں، آج کی رات جہاں بھی جشن منایا جاتا ہے وہاں ٹھیک بارہ بجے کو تقریباً بارہ سیکنڈ کے لیے بالکل اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔"

میں ایڈیٹر صاحب کو دیکھنے لگا۔ واقعی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن ایک ان دیکھی الماس فردوس کے پیچھے میں نصف شب کے اندھیرے کو بھول گیا تھا، اب آزمائش کا وقت آگیا تھا، بچپن سے مجھ میں اندھیرے کا خوف سمایا ہوا تھا مگر اندھیرے میں کہیں الماس کے پیار کی روشنی دکھائی دے رہی تھی چنانچہ میں نے ایڈیٹر صاحب سے کہا۔

"ارے چھوڑیئے جناب، اب میں ایسا بچہ بھی نہیں ہوں، اجازت دیجیے مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

میں وہاں سے چل پڑا، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میں نادر علی شاہ کی کوٹھی پہنچ گیا تھا، وہاں بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی، کوٹھی کے برآمدے میں نادر علی شاہ نے میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی دیر سے آنے کی شکایت کی میں نے شکایت کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ ایک مسلمان ہوتے ہوئے آپ یہ نیو ائیر نائٹ اس قدر دھوم دھام سے منا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"بھئی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی بیگم کے مرنے کے بعد ایک انگریز عورت سے شادی کی تھی، وہ بھی مر چکی ہے، میری پہلی بیوی سے ایک بیٹی ہے جس کا نام یاقوت سحر ہے، دوسری انگریز بیوی سے ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی ہے بیٹے کا نام بہادر علی شاہ اور بیٹی کا نام تم اپنی کہانی میں استعمال کر چکے ہو، میں ابھی تمہیں ان سب سے ملاتا ہوں۔"

"آپ کسی کا تعارف مجھ سے نہ کرائیں، میں خود ہی ان کو پہچاننے کی کوشش کروں گا۔"

یہ بات میں نے اس لیے کہہ دی کہ مجھے الماس

فردوس کی شرط پوری کرنا تھی، نادر علی شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہاں ابھی تم کسی کو پہچان نہیں سکو گے، کوٹھی کے اندر سب فینسی ڈریس میں ہیں۔ وہ سب مختلف روپ بدلے ہوئے ہیں، کیا تم ایسی پارٹی میں پہلی بار شریک ہو رہے ہو؟ بھئی تم کسی کو نہیں پہچان سکو گے۔"

"میں پہچان لوں گا، میرا خیال ہے کہ آپ اپنی انگریز بیوی کی یاد تازہ کرنے کے لیے جشن منا رہے ہیں۔"

"ہاں یہی سمجھ لو، دراصل الماس کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی، میں اس کی دلجوئی کے لیے انگریزوں کے تہوار بھی منا لیتا ہوں، بہر حال تم اندر چلو، بارہ بجنے والے ہیں۔"

"کس کے؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"آنے والے وقت کو کون جانتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ کس کے بارہ بجنے والے ہیں۔" اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی، مجھے وہ تاریکی یاد آ گئی جو ٹھیک بارہ بجے مسلط ہونے والی تھی، میں فوراً ہی کوٹھی کے اندر روشنی میں چلا آیا۔

وہاں عجوبے نظر آ رہے تھے، کسی نے خرگوش کا ماسک چہرے پر چڑھا رکھا تھا، کوئی گھوڑا بنا ہوا تھا، کوئی شہزادی کے روپ میں تھی اور کوئی شیطان بن کر اپنے سر پر دو سینگ اُگائے پیچھے سے اپنی دم ہلا رہا تھا۔ کسی نے ماسک چڑھا رکھا تھا اور کوئی نقاب پہنے ہوئے تھی، میں ہر ایک کو توجہ سے دیکھنے لگا کیونکہ مجھے الماس کی تلاش تھی۔ اچانک ہی بارہ کا گھنٹہ بج گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام روشنیوں نے دم توڑ دیا اور چاروں طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ میں ایک دم سے لڑکھڑا کر قریبی دیوار سے جا لگا۔ ہر سو ایسا گھور اندھیرا تھا جیسے جیتے جی مجھے قبر میں اُتار کر مٹی برابر کر دی گئی ہو اور اب انتظار تھا کہ منکر نکیر آتے ہوں گے، کچھ اس طرح کے اندیشے مجھے خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ خوف زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، بڑے سے کمرے میں مردوں اور عورتوں کے گیت گانے کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ڈیجیٹل واچ روشن ہو گئی تھی جس پر سرخ رنگ میں سیکنڈ گزر رہے تھے اور ساتھ ہی ہر سیکنڈ کے ساتھ آواز بھی آ رہی تھی، پچھلا سال ہر سیکنڈ کے ساتھ پیچھے ہٹ رہا تھا، وہ گا رہے تھے کہ پرانے سال کی آخری رات دم توڑ رہی ہے اور نیا سال طلوع ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے قریب کہیں کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی، وہ سسکی تھی یا پرانے سال کی آخری ہچکی تھی، یہ بات گیت کے شور میں واضح نہ ہو سکی، گھڑی بھی بولتی جا رہی تھی، پھر اچانک ہی کوئی مجھ پر آ گرا، میں نے فوراً ہی اسے بازوؤں سے سنبھال لیا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی نوجوان دوشیزہ ہے۔

اندھیرے کا خوف دور ہو گیا یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ تاریکی میں ایسے خوبصورت حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی سر سنگیت میں نئے سال کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے، میں نے دوشیزہ کی پذیرائی کرتے ہوئے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

"ہیلو۔۔۔۔ کیا الماس بھٹکتی ہوئی میرے پاس آ گئی ہے؟"

وہ میرے بازوؤں میں مجھ سے لگی کھڑی تھی اس طرح میں اس کے خط کے مطابق اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا قد درمیانہ ہے اور صحت بھی اچھی ہے، میں نے کہا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم ہی الماس فردوس ہو اور اگر تم ہی الماس ہو تو پھر شرط ہار کر خاموش نہ رہو۔"

اسی وقت گھڑی کی ٹک ٹک بڑے خوبصورت انداز میں ختم ہوئی اور روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ پہلے چند ساعت کے لیے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے بازوؤں کی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی تاکہ کوئی ہمیں آغوش میں نہ دیکھ لے، مگر گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ ڈھیلی ہو کر فرش پر گر پڑی۔ میرے بارہ بج گئے تھے۔ میں نے روشنی میں دیکھا کہ میرے قدموں کے پاس ایک حسین دوشیزہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے، اس کے دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے تھے، پچھلے سال کی آخری ساعت میں اس کے بدن کی جان نکل چکی تھی اور اب نئے سال کی روشنی میں محض ایک لاش بن کر

فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

جو عورتیں گا نا گا رہی تھیں اب چیخ کر دور بھاگنے لگیں، مرد اس لاش کے قریب آنے لگے، ایک شخص نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''ٹھہریئے! آپ میں سے کوئی بھی الماس کے قریب نہ جائے میں یہاں کا فیملی ڈاکٹر ہوں، مجھے دیکھنے دیجئے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر قریب آ کر الماس پر جھک گیا۔ اب تمام لوگ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی پریشانی سے ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔ اب بھی کے چہروں سے نقاب اُتر گئی تھی، میں جس حسینہ کی لو لگائے وہاں تک گیا تھا وہ موت سے لو لگا کر میرے بازوؤں میں آئی تھی، واہ ایسے بھی وعدہ نبھایا جاتا ہے۔ اتنے میں نادر علی شاہ مہمانوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آنے لگا۔

''کہاں ہے میری بچی، کیا ہو گیا میری الماس کو؟''

وہ بیٹی کی لاش کے سامنے آ کر ٹھٹک گیا، چند ساعتوں تک وہ یوں ساکت ہو کر اسے دیکھنے لگا جیسے اس کی موت کا یقین نہ آ رہا تھا پھر چیخ مار کر فرش پر جھک گیا، شاید وہ بیٹی سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے کہا۔

''رُک جایئے نادر صاحب! یہ قتل کا کیس ہے آپ اسے ہاتھ نہ لگائیں، کسی نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔''

یہ سنتے ہی تمام لوگ ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھنے لگے، ایک نوجوان نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے روشنی ہوتے ہی اس شخص کو دیکھا کہ یہ الماس کو فرش پر ڈال رہا تھا۔''

''یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا۔ ''الماس اس سے لگی ہوئی تھی، روشنی ہوتے ہی اس نے فوراً اسے فرش پر گرا دیا۔''

دو عورتیں بھی چشم دید گواہ بن گئیں، نادر علی شاہ نے اچانک ہی لاش کے پاس سے اُٹھ کر میری گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔

''بدمعاش، کمینے آخر تم نے اپنی دھمکی پوری کر دی، میری معصوم بچی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک معمولی سا جھٹکا دے کر اپنی گردن چھڑا لی اور بولا۔

''ہوش میں آیئے نادر علی شاہ صاحب، آپ بغیر سوچے سمجھے مجھ پر الزام لگا رہے ہیں، اسے میں نے نہیں کسی اور نے ہلاک کیا ہے، دانش مندی یہ ہے کہ آپ فوراً اپنے مہمانوں کی گنتی کریں اور اس ہال کے تمام دروازے بند کرا دیں، اگر قاتل کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا ہے تو وہ یقیناً ہمارے درمیان موجود ہوگا۔''

کچھ لوگوں نے میری تائید کی اور فوراً ہی دروازے بند ہونے لگے ایک نوجوان نے نادر علی شاہ سے کہا۔

''ڈیڈی، آپ مہمانوں کی گنتی کریں میں انسپکٹر دلاور کو فون کرتا ہوں۔'' ڈیڈی کہنے والا اسکا بیٹا بہادر علی شاہ ہو سکتا تھا، میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ٹھہریے، بہادر علی شاہ صاحب، آپ اس علاقے کے تھانے کے انچارج کو فون کریں، انسپکٹر دلاور کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بہادر علی شاہ نے غصے سے کہا۔

''میں صحیح مشورہ دے رہا ہوں، اس وقت میری پوزیشن کمزور ہے، اگر تمہارا رشوت خور انسپکٹر آئے گا تو پھر میں بھی یہاں سے پولیس کے کسی دیانت دار افسر کو فون کر دوں گا، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ قانون کے کسی ذمہ دار افسر کے آنے تک آپس میں جھگڑا نہ بڑھاؤ۔''

ڈاکٹر صاحب نے میری تائید کی تھی ''ٹھیک ہے بہادر، اصولاً اس شخص کی بات مان لینی چاہیئے، تم اس علاقے کے تھانے دار کو فون کرو۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''مگر یہ ہے کون، اب سے پہلے میں نے اسے یہاں کی کسی پارٹی میں نہیں دیکھا۔''

نادر علی شاہ نے نفرت اور غصے سے کہا۔ ''ایسے

لوگوں کو اونچی سوسائٹی میں پوچھا نہیں جاتا، یہ بن بلائے مہمان کی طرح چلے آتے ہیں۔''

''شیم ۔۔۔ شیم ۔۔۔'' سب لوگ مجھے شرم دلانے لگے، میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''نادر علی شاہ آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے شرم آنی چاہیے، آج دوپہر کو آپ نے مجھے کال کر کے مدعو کیا تھا اور آپ نہیں جانتے آپ سے پہلے الماس نے بھی مجھے اس پارٹی میں آنے کے لیے ایک خط بھیجا تھا۔''

نادر علی شاہ نے مجھے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا ''اب میری مظلوم اور مقتول بیٹی کو بدنام کر رہے ہو کہ وہ تمہیں خط بھی لکھا کرتی تھی۔''

''کہاں ہے وہ خط؟'' ڈاکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تو میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا، اس کی آنکھوں میں جیسے بجلی بھری تھی مگر میں اپنی قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے سنبھل کر بولا۔

''وہ خط میرے پاس محفوظ ہے، میں اپنے قانونی مشیر کے ذریعے اس تحریر کو عدالت تک پہنچاؤں گا۔''

''تم خود کو بہت بڑا قانون دان سمجھتے ہو۔''

''یہ شخص جرموں کی کہانیاں لکھتا ہے۔'' نادر علی شاہ نے سب کو بتایا کہ میرا کام کیا ہے، جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

''نادر صاحب، آپ وقت ضائع کر رہے ہیں آپ کو سب سے پہلے مہمانوں کی گنتی کرنی چاہیے۔''

''میں باتوں کے دوران ہر ایک کو دیکھتا جا رہا ہوں اور پہچانتا جا رہا ہوں کہ میرے تمام معزز مہمان یہاں موجود ہیں۔''

''کیا ایک بھی کم نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف یاقوت موجود نہیں ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی خواب گاہ میں ہوگی، وہ مریضہ ہے، میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

ایک مہمان عورت نے مداخلت کی ''لیکن میں نے یاقوت کو یہاں کچھ دیر پہلے دیکھا تھا، اندھیرا ہونے سے چند سیکنڈ پہلے وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی الماس کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ چند قدم آگے بڑھی تھی کہ اندھیرا ہو گیا۔ الماس اور یاقوت آپس میں سوتیلی بہنیں تھیں ٹھیک ایسے وقت جبکہ متوقع تاریکی پھیلنے والی تھی وہ الماس کی طرف کیوں جا رہی تھی؟'' اس مہمان عورت نے کہا۔

''خاتون! میں آپ کا شکر گزار ہوں یہاں جس ہستی کی کمی ہے آپ نے اس کے متعلق چشم دید بات بتائی ہے، یہ بات قابل غور ہے کہ ٹھیک تاریکی پھیلتے وقت مس یاقوت اپنی سوتیلی بہن الماس کی طرف کیوں بڑھ رہی تھیں۔''

اس دوران بہادر شاہ جو موبائل لے کر ہال سے باہر چلا گیا تھا واپس آ گیا اور میری بات سن کر بولا، کیا تم اپنا الزام یاقوت کے سر تھوپنا چاہتے ہو، پولیس والے اس بات کا یقین نہیں کریں گے کہ یاقوت جیسی نازک لڑکی نیو ائیر نائٹ کے آغاز کے دوران الماس جیسی صحتمند لڑکی کا گلا گھونٹ سکتی ہے۔''

ڈاکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا ''یہ صاحب اپنی کہانیوں میں نازک لڑکیوں سے قتل کرواتے ہوں گے، اب یاقوت کو بھی اپنی کہانی کا کردار بنانا چاہتے ہیں۔''

نادر علی شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''ٹھہرو، ٹھہرو کسی بھی بات کو طنز میں یا مذاق میں نہ اُڑاؤ۔ میں اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں، اس کے لیے میں نے مسٹر جاوید پر الزام لگایا ہے کیونکہ یہ میرے سامنے الماس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دے چکے ہیں، اب ایک خاتون کی چشم دید گواہی سے پتا چلتا ہے کہ یاقوت بھی اندھیرے میں الماس کے قریب ہی موجود تھی، میں یاقوت کا دشمن نہیں ہوں وہ بھی میرا خون ہے، وہ بھی میری لاڈلی بیٹی ہے مگر میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کروں گا کہ وہ تاریکی میں اپنی سوتیلی بہن کے قریب کیوں گئی تھی؟''

پھر نادر علی شاہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بہادر علی! تم الماس کے سگے بھائی ہو لیکن تم اپنی بہن کے بارے میں یہ بات غلط کہہ رہے ہو کہ وہ صحتمند تھی، یہ تو موت کے بعد بھی بظاہر صحتمند نظر آ رہی ہے لیکن یہ اختلاج قلب کی مریضہ تھی، کیوں ڈاکٹر

صاحب کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟''

''آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اعتراف کیا۔

''اس مرض نے میری بیٹی کے دل کو بہت کمزور بنا دیا تھا، یہ بات ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ وہ ایک بار خواب دیکھ کر ڈر گئی تھی اور دہشت زدہ ہو کر اس نے اپنی سانس روک لی تھی، بڑی مشکل سے اس کی سانسوں کو بحال کیا گیا تھا۔''

''ڈیڈی، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' بہادر علی شاہ نے تلخ کلامی کی۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الماس اندر سے بہت کمزور تھی، اس کا گلا گھونٹنے کے لیے بہت زیادہ قوت کی ضرورت نہیں تھی۔ مرد ہو یا عورت کوئی بھی اسے گلا دبوچنے کی دہشت سے مار سکتا تھا اور وہ اس طرح ماری گئی ہے۔''

''بھائی صاحب، آپ میری بھانجی پر الزام لگا رہے ہیں۔'' ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے نادر علی شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ یاقوت سحر کا ماموں تھا، اس کی صحت قابل رشک تھی، اچھا خاصا باڈی بلڈر نظر آ رہا تھا، اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایسی زندگی نمایاں تھی جیسے وہ اپنی بھانجی کو الزام سے بچانے کے لیے اپنے بہنوئی کا بھی گلا گھونٹ دے گا۔ نادر علی نے سحر کے ماموں سے کہا۔

''عارف تم اس کے ماموں ہو، مگر میں اس کا باپ ہوں، تم جانتے ہو کہ میں الماس اور یاقوت کو دو آنکھوں کی طرح عزیز رکھتا آیا ہوں، لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ ایک خاتون کی چشم دید گواہی کو نظر انداز نہیں کروں گا، میں مسٹر جاوید اور یاقوت دونوں کا محاسبہ کروں گا۔''

''تو پھر ڈاکٹر قدرت علی اور بہادر علی کا بھی محاسبہ کرنا چاہیے میں نے ان دونوں کو بھی الماس کے قریب دیکھا ہے، کیا میری چشم دید گواہی قابل قبول نہیں ہوگی؟''

''ضرور ہوگی، سانچ کو آنچ کیا، میں اس وقت سے اب تک الماس کے قریب ہوں۔''

''بے شک میں بھی الماس سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن میں اس کا سگا بھائی ہوں، اس کے لیے مر سکتا ہوں، اسے مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''برخوردار سگے رشتوں میں زیادہ دشمن نکل آتے ہیں، جب فیصلے کی گھڑی آئے گی تو قانون سگے بھائی کا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔''

میں بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ سن کر ذرا اطمینان ہو رہا تھا کہ الماس کی موت کے وقت صرف میں ہی نہیں بلکہ یاقوت، ڈاکٹر قدرت علی اور بہادر علی بھی آس پاس موجود تھے، میں تنہا معتوب نہیں تھا، اب اپنے طور پر بھی یہ معلوم کر سکتا تھا کہ میری مردہ محبوبہ کا قاتل کون ہے، میں نے طویل خاموشی کے بعد سب سے پہلے عارف صاحب کو مخاطب کیا۔

''عارف صاحب، اس سلسلے میں یہ سوچنا ہوگا کہ الماس کے قتل سے کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، نادر علی صاحب کروڑ پتی ہیں اب الماس کے حصے کی جائیداد بھی یاقوت اور بہادر علی کے درمیان تقسیم ہو جائے گی، ان دونوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے گا، الماس کی موت سے ڈاکٹر صاحب کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہ ابھی میں نہیں کہہ سکتا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ لیکن آپ کی ساری محبت اور ہمدردیاں صرف اپنی بھانجی کے ساتھ ہیں۔ یاقوت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے آپ کا ہاتھ بھی الماس کی گردن تک پہنچے ہوں گے، یہ ہال زیادہ بڑا نہیں ہے جس وقت اندھیرا ہوا اس وقت آپ بھی الماس سے زیادہ دور نہیں تھے۔''

''اچھی بات ہے، تمہاری الزام تراشی پر مجھے غصہ نہیں آئے گا، مفروضہ قاتلوں کی فہرست میں مجھے بھی شامل کر لو۔'' ماموں عارف نے بڑی فراخدلی سے مسکرا کر کہا۔

اتنے میں انسپکٹر دلاور وہاں پہنچ گیا اس کے ساتھ انٹیلی جنس کا ایک نامور آفیسر مسعود پرویز بھی تھا جسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں اس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے فوراً ایک اجنبی انداز

اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے وہ جاوید راہی ذرا میں بھی دیکھوں۔"

اس کے اس انداز نے مجھے بھی سمجھا دیا کہ وہ فی الحال اجنبی بن کر رہنا چاہتا ہے۔ میں نے بہادر علی سے کہا۔

"تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، تمہیں قانون کے مطابق علاقے کے تھانے دار کو فون کر کے بلانا چاہیئے تھا۔" بہادر علی مسکرا کر انسپکٹر دلاور کو دیکھنے لگا۔ دلاور نے مسعود سے کہا۔

"یہ ہیں وہ حضرت جاوید راہی صاحب پھر اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔" میں انٹیلی جنس کا افسر ہی لے آیا اب یہ کیس سیدھا انٹیلی جنس ڈیل کرے گی اور کسی کو اعتراض نہیں رہے گا۔"

"اعتراض تو نہیں رہے گا لیکن یوں لگتا ہے کہ آپ لوگ مل کر میرے خلاف محاذ بنا رہے ہیں، آپ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ آپ بعد میں مجھ سے نمٹ لیں۔"

اس دوران مسعود لاش پر جھکا ہوا تھا لیکن وہ چاروں طرف کی باتیں بھی سنتا جا رہا تھا چنانچہ اس نے سر اٹھا کر دلاور سے پوچھا۔

"دلاور صاحب، کیا آپ کو مسٹر جاوید نے دھمکی دی تھی؟"

"اس سے پہلے انہوں نے الماس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی تھی اور یہ اس پر عمل کر چکے ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے، میں اس سے پہلے الماس سے کبھی نہیں ملا، میرے پاس الماس کا ایک خط موجود ہے جس میں اس نے میری تحریری صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے اور اس نے مجھے اپنی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ یہاں ہم پہلی بار ملنے والے تھے۔ مگر اس سے پہلے کوئی قاتل ہمارے درمیان آ گیا۔"

"ٹھیک ہے، آپ وہ خط اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ میں بعد میں وہ آپ سے طلب کروں گا، ابھی آپ یہ بتائیں کہ آپ نے الماس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی کیوں دی تھی؟"

"مجھے نادر علی صاحب نے اشتعال دلایا تھا انہوں نے کہا کہ آئندہ میں نے اپنی کسی کہانی میں الماس کا نام استعمال کیا تو وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔"

"کمال ہے، یہاں تو دھمکیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، پہلے نادر علی صاحب نے جاوید کو شوٹ کرنے کی دھمکی تھی پھر جاوید نے الماس کا گلا گھونٹ کر مار دینے کی دھمکی تھی، پھر دلاور صاحب نے جاوید سے نمٹنے کی دھمکی تھی، آپ تینوں حضرات کے تحریری بیان میں ان دھمکیوں کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے۔"

انسپکٹر دلاور نے چونک کر پوچھا۔ "مسعود صاحب، کیا آپ میرا ابھی بیان لیں گے، میں تو قانون کا محافظ ہوں اگر کوئی مجرمانہ انداز میں میرے سامنے کسی کو مارنے کی دھمکی دے تو میں اس حرکت سے باز رکھنے کی دھمکی دے سکتا ہوں۔"

"چلئے آپ اسی انداز میں اپنا بیان لکھ دیں اور یہ بھی لکھیں کہ آپ یہاں کیوں آئے تھے، آپ کے جسم پر وردی نہیں ہے، آپ اس علاقے کے تھانے دار نہیں ہیں، آپ کو اس پارٹی میں مدعو نہیں کیا گیا پھر بھی آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟"

"دعوت نامہ تو تھا میرا، بس کسی مصروفیت کی بنا پر نہ پہنچ سکا لیکن اب جبکہ یہ اطلاع ملی تو میں آپ کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔"

"لیکن بات وہی ہے کہ مسٹر بہادر علی نے متعلقہ تھانے دار کو کیوں نہیں بلایا۔ پھر آپ کو فون کیا گیا آپ میرے پاس پہنچ گئے لیکن بس یہی ایک بات میرے دوست جاوید کے لیے بہتر ہو گی کیونکہ جاوید میرا بہت اچھا دوست ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ بے گناہ ہے۔ میں بھرپور کوشش کر کے اس کی بے گناہی ثابت کر کے رہوں گا۔" پھر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"جاوید مجھے اُمید ہے کہ تم نے یہاں کچھ ابتدائی کاروائی ضرور کی ہوگی۔" جواب میں، مَیں نے اپنی کاروائی کے بارے میں بتایا، یہ بھی بتایا کہ قاتلوں کی کیا فہرست ہے اور ان میں یاقوت سحر کا نام بھی ہے جو اس وقت اپنے بیڈروم میں ہے۔

''اچھا چلیے ذرا ان سے بھی مل لیتے ہیں۔'' مسعود نے کہا اور اس کے بیڈروم کی طرف چل پڑا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''نہیں آپ یہیں رُکیے، اگر آپ کی ضرورت محسوس کی گئی تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔'' ڈاکٹر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا تھا، پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا مرض ہے یاقوت کا؟''

''میں تمہیں اس کا مرض بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' یاقوت کے ماموں نے کہا ''اصل میں اس کو بے خوابی کا مرض ہے، پہلے اسے خواب آور گولیاں کھلائی جاتی رہیں مگر اس کی صحت گرنے لگی، پھر بھائی صاحب کو پتا چلا کہ یہ ڈاکٹر صاحب جدید طریقہ علاج سے ہر مرض کا علاج کر سکتے ہیں لہٰذا ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اب یہ تنویمی عمل سے اس کا علاج کرتے ہیں۔ یہ اس عمل سے یاقوت کو باآسانی سلا دیتے ہیں اور اُٹھنے کے لیے جو وقت مقرر کرتے ہیں اس وقت وہ بیدار ہو جاتی ہے۔''

میں نے مرعوب انداز میں ڈاکٹر کو دیکھا لیکن وہ اس وقت بُری طرح بپھرا ہوا تھا اور میری کوئی بات سننے کے لیے رضا مند نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسعود آ گیا اور اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔

''جاوید ذرا مجھے وہ خط تو دکھاؤ۔''

میں نے اپنی جیب سے وہ خط نکال کر اسے دے دیا، اس نے وہ خط لے کر دیکھا پھر کہا۔ ''آپ سب حضرات یہ بات جانتے ہیں کہ الماس ایک انگریز ماں کی بیٹی تھی، وہ بے شک اردو بول سکتی تھی لیکن اردو پڑھنا یا لکھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، جب اس خط کا ذکر آیا تو جاوید کی غلط فہمی دور کیوں نہیں کر دی گئی کہ الماس نہ تو اردو پڑھ سکتی تھی اور نہ ہی لکھ سکتی تھی، پھر اس نے تو یہ خط نہیں لکھا۔''

''میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا جناب، جاوید صاحب اب تو آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔'' بہادر علی نے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ یہ خط جاوید صاحب نے خود ہی لکھا ہو۔''

''یا پھر کسی لڑکی سے لکھوایا ہو۔'' عارف نے کہا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے، آپ لوگ ایک ایک کر کے میرے پاس آئیں اور اس خط کو پڑھیں، ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے کوئی اس تحریر کو پہچانتا ہو۔''

سب سے پہلے بہادر علی شاہ نے اس خط کو پڑھا اور ناگواری کے سے انداز میں اسے واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو یاقوت کی تحریر لگتی ہے۔''

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ماموں نے غصہ سے کہا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو، کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یاقوت نے الماس کے نام سے خط لکھ کر جاوید کو یہاں پھنسانے کے لیے بلایا ہے، لاؤ میں اس تحریر کو پہچان لوں گا۔''

اس نے خط اپنے ہاتھ میں لے لیا اسے کھول کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا، وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''یہ تحریر تو یاقوت سے ملتی جلتی مگر میری بھانجی ایسی بے غیرت نہیں ہے، وہ ایسا محبت نامہ کبھی نہیں لکھ سکتی۔''

''مگر آپ کی بھانجی یاقوت میرے دوست سے دلچسپی رکھتی ہے، ابھی خواب گاہ میں جاوید کا نام سن کر بستر سے اُٹھ گئی، یہاں آ کر اسے دیکھنا چاہتی تھی، میں نے اسے وہیں روک دیا اور کہا کہ جاوید آپ کے پاس آ جاتا ہے، اب ہم اس کو یہ خط دکھائیں گے اگر یہ اس کی تحریر ہے تو اسے اعتراف کر لینا چاہیے۔''

''کہاں ہیں جاوید صاحب۔۔۔؟''

مسعود نے میرا تعارف کرایا اور وہ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ اتنے میں مسعود نے وہ خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مس یاقوت، آپ جاوید سے بعد میں باتیں کر لیجیے گا یہ بتائیے کہ یہ خط آپ نے لکھا ہے۔'' اس نے مسعود کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اسے کھول کر پڑھنے

لگی، پڑھنے کے دوران اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی بھی جھلک رہی تھی کیونکہ وہ رومانی انداز میں خط لکھا گیا تھا اس نے ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے انداز میں میری جانب دیکھا اور پھر مسعود سے کہا۔

''یہ تحریر ہو بہو میری ہے مگر میں نے یہ خط نہیں لکھا۔''

''آپ اسے دوبارہ پڑھیں، اس پر ذرا سا غور کریں اگر پھر بھی انکار ہو تو ابھی میرے سامنے ایسا ہی ایک خط لکھیں میں دونوں خطوط اپنے محکمے کے تحریر شناس کے پاس بھیجوں گا۔''

''میں اسے دس بار بھی پڑھ کر یہی کہوں گی کہ یہ میں نے نہیں لکھا ہے بے شک لکھائی کی کامیابی سے نقل کی گئی ہے، میں ابھی اپنے بیڈروم سے ایک کاغذ پر کچھ بھی لکھ کر لاتی ہوں۔''

''ٹھہرو یاقوت میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مسعود صاحب یہ خط میرے نام آیا ہے اور یہ میرے ہی ہاتھ میں رہے گا اگر مس یاقوت کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے ڈکٹیٹ کرا سکتا ہوں۔''

''مجھے خوشی ہوگی۔'' یاقوت نے کہا'' آیئے میرے ساتھ۔''

میں اس کے ساتھ خواب گاہ کی طرف جانے لگا، اسکے ساتھ چلتے ہوئے میں نے اسے توجہ سے دیکھا تھا، خط کے مطابق وہ بھی درمیانے قد کی تھی اور صورت بھی پیاری سی تھی، وہ میری کہانیوں کی تعریف کر رہی تھی اور میں ایک شاعر کی طرح داد وصول کر رہا تھا، میں نے اس موضوع سے ہٹ کر سوال کیا۔

''الماس کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟''

''آپ پولیس والے نہیں ہیں؟ ایسی باتوں میں وقت ضائع نہ کریں، میں آپ سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں بھی بہت سی باتیں کروں گا مگر اس وقت میرے سامنے پھانسی کا پھندہ ہے۔ مجھے قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے، آپ بھی مشکوک ہیں، اندھیرا ہونے سے چند منٹ پہلے آپ کو الماس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

''دیکھنے والے درست کہتے ہیں، لیکن اندھیرا ہوتے ہی میں اپنی خوابگاہ میں واپس آگئی تھی، سب لوگ مل کر بے سُری آواز میں گا رہے تھے کہ جی اُلجھنے لگا، میں وہاں نہ ٹھہر سکی، ویسے میں اس کی سوتیلی بہن ہوں، مجھ پر کتنے ہی الزامات تراشے جا سکتے ہیں۔ آپ پر شبہ کرنے والے احمق ہیں، اس خط سے ثابت ہو جائے گا کہ آپ کو دھوکے سے یہاں بلا کر پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''ہاں یہ خط مجھے بہت سہارا دے رہا ہے۔''

ہم خوابگاہ میں پہنچ گئے تھے، وہ میز کے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، پھر کاغذ قلم نکال کر بولی۔

''اب آپ اس کیس کی باتیں نہ کریں مجھے اُلجھن ہوتی ہے چلیئے خط لکھوایئے۔''

میں خط کھول کر کہا'' اس خط میں مجھے جناب جاوید صاحب کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اگر آپ سچ میں خط لکھتیں تو مجھے کس طرح مخاطب کرتیں؟''

وہ سر جھکا کر مسکراتی ہوئی بولی'' میں آپ کو اپنے انداز میں مخاطب کروں گی لیکن شرط یہ ہے کہ میرے لکھنے کے دوران آپ یہ خط نہ پڑھیں ورنہ میں نہیں لکھ سکوں گی۔''

''اچھی بات ہے میں نہیں پڑھوں گا، آپ لکھنا شروع کر دیں۔''

وہ قلم اُٹھا کر کاغذ پر جھک گئی پھر کچھ لکھنے کے بعد کہا۔'' میں مخاطب کر چکی ہوں، آپ آگے لکھوایئے۔''

میں خط کا مضمون پڑھنے لگا اور وہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنے لگی، میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، جب خط مکمل ہو گیا تو وہ کاغذ قلم چھوڑ کر اُٹھ گئی، اس نے کن اکھیوں سے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی، میں اسکا لکھا ہوا خط اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

''میرے اور صرف میرے جاوید!

آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں یوں تو آپ چند منٹ پہلے میرے سامنے آئے ہیں مگر کہانیوں کی

صورت میں آپ ہمیشہ میرے ہاتھوں میں ہیں اور میری نگاہوں کے سامنے رہے، میں ایسے ماحول کی پروردہ ہوں جہاں لڑکیاں اپنے والدین کے سامنے بھی کھل کر اپنی پسند کا اظہار کرتی ہیں، اسی لیے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ خط لکھ رہی ہوں اور میرا خیال ہے کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔

میں دوسرا خط تفتیش کے سلسلے میں لکھ رہی ہوں

فقط آپ کی یاقوت سحر''

خط پڑھتے وقت میرا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا، وہ منہ موڑے کھڑی تھی، میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑلیا اور وہ شرما کر دوہری ہوگئی۔ حالات کے تحت میں نے زیادہ بے تکلف ہونا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر میں نے کہا۔

''پھر کب ملاقات ہوگی؟''

''جب چاہو چلے آنا، میرے کمرے کا دروازہ پائیں باغ میں کھلتا ہے، وہ ہمیشہ تمہارے انتظار میں رہے گا۔''

''اب ہمیں چلنا چاہیے، مسعود انتظار کررہا ہوگا۔''

اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور لگتا تھا جیسے اس کا دل مجھ سے جدا ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا، مجھے اس کی بے حسی کی وجہ سمجھ نہ آئی کہ الماس سے اس کا رشتہ سوتیلا تھا تاہم دونوں ایک باپ کی اولاد تھیں، یاقوت کا فرض تھا کہ اس کی موت پر افسوس کرتی لیکن وہ دوسری محبت کے گن گارہی تھی، وہ الماس سے ایسی لاتعلق تھی جیسے الماس کسی کہانی میں قتل ہوئی ہو اور کہانی پڑھنے کے بعد اسے بھلا دیا گیا ہو۔ بڑے ہال میں مسعود بیٹھا ہوا سب کے بیانات قلمبند کررہا تھا۔ فوٹو گرافر اور فنگر پرنٹ ایکسپرٹ اپنا کام کررہے تھے۔ میں نے الماس کی طرف سے لکھا گیا خط اور تازہ تحریر مسعود کے حوالے کردی۔ پھر مجھے اور یاقوت کو بھی اپنا بیان قلمبند کروانا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قدرت کا بیان قابل ذکر تھا، اس نے مسعود کو جو جواب لکھوائے تھے وہ اس طرح تھے۔

''اچھا ڈاکٹر! جیسا کہ یاقوت کو بے خوابی کا مرض ہے آپ اسے کس طرح سلا دیتے ہیں۔''

''میں تنویمی عمل کے ذریعے اسے ٹرانس میں لاتا ہوں، اس کے بعد اسے سونے کے لیے کہتا ہوں اور یہ بڑے آرام سے سوجاتی ہے۔''

''پھر بیدار ہونے کے لیے کیا عمل کرتے ہیں؟''

''پہلے یوں ہوتا تھا کہ یاقوت کو سلانے کے وقت میں اس کے جاگنے کا وقت مقرر کردیتا تھا لیکن پھر ایک مصلحت کے تحت میں نے فون کی گھنٹی مقرر کردی ہے اور اب میں اسے حکم دیتا ہوں کہ فون کی گھنٹی کی آواز سے اُٹھ سکتی ہے، یہ ایک باقاعدہ عمل ہے جسے میں کر کے دکھاتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا پھر اس نے یاقوت پر وہ عمل کیا اور یاقوت اس کے عمل کے زیر اثر سوگئی پھر فون اس کے کان کے پاس رکھا گیا تو مسعود نے پوچھا۔

''لیکن ایک بات بتائیے کیا یہ جاگنے کے بعد دوبارہ سوجاتی ہے۔''

''نہیں یا تو یہ صبح تک جاگتی رہتی ہے یا پھر مجھ سے فون پر رابطہ کرتی ہے اور میں اسے فون پر سوجانے کا حکم دیتا ہوں اور یہ سوجاتی ہے چلیے اب کوئی بھی اس نمبر پر فون کرو۔''

بہادر علی نے اپنے موبائل فون سے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور فون کی گھنٹی بجنے لگی، یاقوت پہلے تو نیند میں کسمسائی پھر نیم خوابیدہ انداز میں آنکھیں کھول کر فون اُٹھا کر کان سے لگالیا اور بولی۔

''ہیلو، کون۔۔۔۔۔۔؟''

ماموں نے فون بہادر سے لے لیا اور بولے۔ ''میں تمہارا ماموں بول رہا ہوں۔''

''جی ماموں کہیے، اور ہاں میں سوگئی تھی۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے میں یہاں کہاں سے آگئی؟'' اتنی دیر میں ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''دیکھ لیا آپ لوگوں نے، یہ تھا یہ عمل۔''

''بہر حال ایک قتل ہوا ہے اور آپ جو لوگ اس میں شبے کے طور پر شامل کیے ہیں ان سے میں درخواست کروں گا کہ یہ شہر چھوڑ کر نہ جائیں۔ میری ابتدائی تفتیش مکمل ہوگئی ہے اور اب میں سب سے اجازت چاہوں گا۔'' پھر اس نے میری طرف رُخ کر

کے کہا۔

"چلیے جاوید صاحب۔" اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

دوسرے دن میں نے مسعود سے ملاقات کی تھی، میں نے اسے یاقوت کے بارے میں تمام باتیں بھی بتائی تھیں اور اس نے کہا تھا۔

"تمہیں اس پر بھرپور نگاہ رکھنی ہے، وہ بہت چالاک ہے۔"

"لیکن مسعود یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خط اس سے لکھوایا گیا ہو اس نے ٹرانس میں یہ الفاظ لکھے ہوں اور وہ بالکل بے قصور ہو۔"

"تمہارا اشارہ ڈاکٹر کی طرف ہے۔"

"بالکل۔"

اتنی دیر میں اطلاع ملی کہ نادر علی مسعود سے ملنا چاہتا ہے مسعود نے اسے بلوالیا۔

"جناب مجھے اپنی بیٹی کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے، لیکن میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں، اب مجھے کافی حد تک شک اپنے بیٹے بہادر علی اور عارف پر بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہادر علی نے اسے مارا ہے تاکہ سارا شک عارف اور یاقوت پر جائے۔ یاقوت کو سزا ہوجائے اور وہ ساری جائیداد کا مالک بن جائے یا پھر عارف جو یاقوت کا ماموں ہے ساری دولت یاقوت کے ذریعے اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرصے کے لیے یاقوت کو حراست میں لینا چاہتا ہوں۔"

"کیوں، آخر کیوں؟"

"سب کچھ سامنے آجائے گا، مجھے اس کا ایک انٹرویو کرنے دیں۔"

نادر علی سوچ میں ڈوب گیا، مسعود نے پھر کہا۔

"اچھا چلیں ایک کام کیے لیتے ہیں، میں کچھ دیر کے لیے اس کے پاس اس کے ماموں کی حیثیت سے جاؤں گا باقی آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"کیا مطلب؟" نادر شاہ نے کہا اور مسعود اسے کچھ سمجھانے لگا۔

رات کا آخری پہر تھا سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، بس ایک سایہ دبے پاؤں یاقوت کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سائے نے یاقوت کے دروازے کے قریب پہنچ کر ہلکی سی دستک دی اور اندر سے یاقوت نے دروازہ کھول دیا۔ پھر اس نے عارف کو پہچان کر کہا۔

"جی ماموں آجایئے، ماموں۔" عارف نے اندر داخل ہوکر دروازہ پھر بند کردیا۔ یاقوت نے کہا۔

"ماموں آپ جلدی کیجئے نا، اب کیا پروگرام ہے آپ کا؟ اس بڈھے کو کب جہنم واصل کررہے ہیں جس نے میری ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔"

جواب میں ماموں سر ہلانے لگے تھے "وہ کیسے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی الماس نے، اب بس وہ بڈھا راستے سے ہٹ جائے پھر بہادر علی کو بھی دیکھ لوں گی کہ وہ کتنا بہادر ہے؟" وہ بولے جارہی تھی پھر وہ ایک دم مڑی اور ماموں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"آپ بھی تو کچھ بولیے نا۔"

"بولو گی اب تم حوالات میں، مس یاقوت میں تمہیں تمہاری بہن الماس کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔" اچانک مسعود کی آواز اُبھری۔

"مم۔۔۔ ماموں۔۔۔" یاقوت کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

پھر اس نے اعتراف جرم کرلیا تھا، ساتھ ہی اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ الماس کے بعد اس کا اور اس کے ماموں عارف کا ارادہ نادر علی اور بہادر علی کے قتل کا تھا۔ ماموں عارف کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ صرف مسعود کی حاضر دماغی کی وجہ سے یہ کیس آرام سے حل ہوگیا تھا۔ یاقوت اور اس کا ماموں اس قتل میں ملوث تھے۔ وہ لوگ الماس، بہادر علی اور نادر علی کو راستے سے ہٹا کر دولت پر قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ بیماری بھی صرف ایک ڈرامہ تھی تاکہ کسی کو اس پر شک نہ ہوسکے۔

بہرحال مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اور میں اپنی مردہ محبوبہ اور حالیہ محبوبہ عرف قاتلہ سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

☆☆☆

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done

Liked　Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک
ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ
یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 18

سلمان نے سردار کی آواز سن کر کہا۔
''کنعان تیار ہو جاؤ اور حملہ کرو'' یہ سنتے ہی جنات کو جو گروپ سلمان اس کی ماں زلیخاں اور کنعان کو گرفتار کرنے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس پر تینوں نے حملہ کر دیا اور یہ دیکھ کر سردار کی حیرت اور غصے کی انتہا نہ رہی کہ اس کے بھیجے ہوئے لشکر کے سارے سپاہی ایک ایک کر کے زمین چاٹ رہے تھے اور سلمان اس کا ساتھی اور اس کی ماں ایسے حملے کر رہے تھے کہ ان کو کوئی ایک سپاہی بھی چھو تک نہیں رہا تھا۔ ان تینوں کے پاس حملہ کرنے کے جو ہتھیار تھے ایسے ہتھیار اس سے قبل کبھی سردار اور اس کی جناتی فوج نے دیکھے تک نہیں تھے..... سردار کے سب سپاہی جن کی تعداد کوئی پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی جب صفحۂ ہستی سے مٹ گئے تو سردار نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے باقی سپاہی خود بخود خوف سے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اس نے مذید کسی اور ٹکڑی کو حملہ کرنے کا حکم دیا تو اس کا حکم نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے ایسے میں اس کے قریب کھڑے ہوئے اس کی مجلس کے مشیر کیلاش نے اس کے کان میں کہا۔
''سردار مذید جنگ جاری رکھنا ہمارے حق میں ٹھیک نہیں ہوگا آپ سلمان سے بات چیت کرنے کو کہیں اور اسے مجبور کریں کہ وہ قبیلے کے قوانین کا احترام کرے'' سردار نے یہ بات سن کر کیلاش کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا اس نے سارے ہجوم میں روحانی مجلس کے عظیم بزرگ کو تلاش کرنا شروع کیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ عظیم بزرگ موجود نہیں تھے ان کی جگہ ان کا ایک چیلہ البتہ جنگ کو شکست میں بدلتے دیکھنے میں محو تھا.... سردار نے اپنے قریب کے ایک محافظ سے اسے بلا کے لانے کو کہا.... کچھ ہی دیر میں وہ محافظ روحانی مجلس کے چیلے کو بلا کر لے آیا.... سردار اس کے ساتھ اپنے خیمے میں چلا گیا۔
''کیا بات ہے! یعقوب عظیم روحانی باپ اس وقت ہمارے درمیان میں کیوں موجود نہیں ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے ہمیں اس وقت ان کی کتنی ضرورت ہے؟'' سردار کی بھاری آواز جس میں غصہ بھی موجود تھا خیمے میں ایک گونج کی طرح سنائی دی۔
''وہ آئے تھے سردار مگر ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے غائب ہو گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے مجھ سے کہا



تھا کہ سردار سے کہنا اس وقت سلمان کی روحانی طاقت کو ہم کسی بھی قیمت پر شکست نہیں دے سکیں گے۔ اسے آسمانی دیوتاؤں کی مدد حاصل ہے اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ سلمان کو اپنے باپ کو آزاد کرا کے لے جانے کا موقع فراہم کر دیا جائے۔'' یعقوب کی بات ابھی ٹھیک سے پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ سردار گرجا۔

'' یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری روحانی مجلس کے کاہن ہزاروں سال کی تپسیا کے بعد بھی ایک کل کے لونڈے کا مقابلہ کرنے سے لاچار ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین نہیں آتا یعقوب یہ کیسے ہوا۔ بتاؤ ہمیں کیا راز ہے یہ؟'' سردار شماش کی رگوں میں لہو اگر ہوتا تو اس وقت اس کی ساری رگوں سے پھوٹ کے باہر نکل آتا۔ اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

یعقوب جیسے تھر تھر کانپنے لگا اور اس کی زبان گنگ ہو گئی اس سے جو کہا تھا عظیم روحانی کاہن نے وہ بھی اس کے دماغ سے جیسے پل بھر کو صاف ہو گیا۔ اسے سردار کے غیض وطیش کے سامنے اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

'' سردار یہ میں نہیں جانتا پر جو کہا قسم رب عظیم کی سب وہ ہی کہا جو مجھ سے عظیم روحانی کاہن نے کہلوایا ہے''

'' ہم ابھی کاہن سے ملنا چاہیں گے ابھی اور اسی وقت'' سردار کو جیسے یعقوب کی بات پر یقین نہیں آیا۔

'' انھوں نے یہ بھی کہا تھا۔'' یعقوب ڈرتے ڈرتے بولا۔ '' آپ لازمی ان سے ملنا چاہیں گے۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوگا سردار۔''

'' کیا ٹھیک نہیں ہوگا!'' سردار پوری طاقت سے گرجا۔ '' کاہن سے ملنا غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا ہم اس قبیلے کے سردار ہیں اور ہمارے لیے کچھ بھی غلط نہیں ہے''

'' جی سردار میں یہ جانتا ہوں۔ میں تو بس....'' یعقوب نے سردار کے غصے سے سرخ ہوتی انگارہ آنکھوں کی طرف دیکھا اور اس کی آواز جیسے حلق میں ہی اٹک کے رہ گئی.... سردار نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی اور درشتگی سے بولا۔

'' ہمیں ابھی اور اسی وقت عظیم کاہن کے پاس لے کر چلو ہم اسی سے معلوم کریں گے یہ تماشا کیا ہوا ہے۔ ایک کل کے جن نے ہماری ماہر سپاہ کے پچاس جنات کو کیسے دوسرے جہان میں بھیج دیا۔ ایسا تو جنات کی پوری تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔'' سردار اسے دروازے کی طرف گھسیٹنے ہی والا تھا۔ گردن چھوڑ چکا تھا۔

'' سنیے تو سردار میں آپ کو بتانے پر مجبور ہوں ورنہ چپ رہتا۔ عظیم روحانی کاہن نے کہا تھا کہ اگر سردار نے ان سے ملنے کی کوشش کی تو سلمان اس پورے قبیلے کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے گا۔ اس لیے سردار کو چاہیے وہ اپنی جنگجو سپاہ کو لڑنے سے منع کر دے اور سلمان کو اپنے باپ ابراہیم کو آزاد کرا کے لے جانے دے۔ یہی وقت کا فیصلہ ہے۔ سردار کو وقت کا فیصلہ اور مصلحت کو سمجھنا ہوگا نہیں تو وہ ہو جائے گا جو کسی نے کبھی نہیں سوچا تھا۔''

یعقوب کی بات پوری ہوئی تو سردار کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف لرزتا دکھائی دیا۔ پہلی بار ایسا معلوم ہوا جیسے سردار کو یعقوب کی بات پر یقین آ گیا ہے اس نے کچھ دیر تک سوچا اور پھر یعقوب کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔

'' آؤ ہمارے ساتھ آؤ'' یعقوب سردار شماش کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور.... جو منظر اس نے جنگ کے میدان میں دیکھا وہ اس کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا۔ سلمان، اس کی ماں زلیخاں اور اس کے دوست کنعان نے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے اور اس کی بہادر سپاہ کے جنات ایسے گاجر مولیوں کی طرح

کٹ کٹ کر گر رہے تھے کہ سردار کی آنکھوں کو یقین نہیں آیا کہ یہ اس کی وہ ہی فوج ہے جو کسی بھی مقابلے میں کبھی شکست نہیں کھاتی تھی اسے عظیم کاہن کی باتیں کھلے سچ کی طرح معلوم ہونے لگیں سلمان اس وقت کوئی عام جن نہیں تھا اس کے ساتھ آسمانوں کے دیوتا کی طاقت تھی اسی لیے اس کا اور اس کے دونوں ساتھیوں کا بال بھی بیکا نہیں ہو رہا تھا اور وہ اس کے سپاہیوں کو مسلسل کاٹے ڈال رہے تھے اگر چند گھنٹے یہ جنگ اور جاری رہی تو یقیناً اس کا پورا قبیلہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ خوف اور بے یقینی نے اس کی آنکھیں پتھرا دیں اور اس کی آواز اس کے وجود میں کہیں گم ہو کے رہ گئی۔ ایسا ہی حال یعقوب کا بھی تھا مگر اسے چونکہ عظیم روحانی کاہن کی باتوں پر ایمان تھا اس لیے وہ اپنے ہوش وحواس میں تھا۔ اس نے جو سردار کو ہوش وخرد سے بیگانہ آنکھیں پھاڑے جنگ کے شکست خوردہ منظر کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ سردار کو یہ تک بھول گیا ہے اسے ان حالات میں اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے ہمت کر کے سردار کو جھنجوڑا اور بولا۔

"سردار جنگ کا نقارہ بجانے کا حکم دیجیے جس کے بجتے ہی جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اپنے باقی ساتھیوں کو مرنے سے بچائیے جلدی کیجیے سردار نہیں تو غضب ہو جائے گا۔"

سردار یعقوب کے جھنجوڑنے پر ہوش میں آ گیا اور پوری طاقت سے چیخا۔

"نقارہ بجاؤ ہم جنگ ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں" کئی بار سردار نے یہ بات کہی تو جنگ کا نقارہ زور زور سے بجنے لگا اور لڑتے ہوئے سب سپاہی ایک دم چونک کر اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر گئے۔ سب کی نظریں سردار کی طرف اٹھیں۔ سلمان، زلیخاں اور کنعان بھی اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے اور اسی وقت انھیں جیسے ہوش آیا کہ وہ اب تک کیسی ہولناک جنگ لڑتے رہے تھے اور ان کے ہاتھوں سے کتنے لاتعداد جنات اپنی جانیں گنوا چکے تھے۔ کچھ دیر تک ایسے سکوت رہا جیسے اس ماحول میں کوئی سور پھونکا جا چکا ہو اور ساری اقلیم کسی خدائی حکم سے ساکت وجامد ہو چکی ہو۔ سردار کی آواز پھر گونجی۔

"سلمان کی بہادری کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اسے غیبی خدا کی اعانت حاصل ہے اور ہماری سپاہ آج اور اس وقت اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے اس لیے ہم اس کے باپ ابراہیم کو باعزت رہا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی ایک طرف سلمان اور زلیخاں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا وہیں کنعان سمیت یہاں موجود تمام جنات کی حیرانی دیدنی تھی کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سردار تو آخری جن کی موت تک لڑنے کی بات کیا کرتا تھا پھر اس نے آج اتنی جلدی شکست کیسے مان لی۔

یہ سردار کو کیا ہوا ہے۔ تاہم انھیں یہ بھی حیرانی تھی کہ اس میں ضرور کوئی ایسا راز ہے جو صرف سردار جانتا ہے بھلا ان تین جنات نے جن میں ایک عورت ہے جو سلمان کی ماں ہے یہ سب کیسے کیا۔ وہ سردار کی اتنی بہادر سپاہ کو یوں گاجر مولی کی طرح کیسے کاٹے ڈال رہے تھے۔ سلمان اتنا بہادر اور جری کیسے ہو سکتا تھا اور کوئی بھی عورت کسی مرد جن سے زیادہ جیدار کیسے ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں یہ سب کیا ہوا تھا کیا دنیا میں اب بھی معجزے ہوتے ہیں۔ انھوں نے تو یہ سنا تھا کہ معجزے خدا کے نبیوںؑ کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مگر جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ کسی کی عقل میں نہیں سما رہا تھا اور وہ اسے معجزے سے کم ماننے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔

سردار شکست مان چکا تھا اور اس نے سلمان کے باپ کو قید سے رہا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جب ابراہیم کو قید سے نکال کر وہاں سب کے سامنے لایا گیا تو اس وقت بھی میدان میں ایسا سکوت طاری تھا کہ جیسے سب ہی بولنا بھول گئے ہوں۔

سلمان جو ساری صورت حال کو بھانپ چکا تھا اسے ویسے بھی مزید لڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے

قبیلے کو ستانے کا کوئی لالچ تھا نہ شوق اس کا مقصد خدا کی مدد سے پورا ہو چکا تھا اور وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ اس نے البتہ اسی سکوت کی کیفیت میں اپنی ماں اور کنعان سے روحانی رابطہ کرنے کی ایک کوشش ضرور کی تھی اور اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کا روحانی رابطہ ان دونوں سے ہو گیا تھا۔ سلمان نے ان دونوں سے ایک ہی جملے میں بس اتنا کہا۔

''ہوشیار اور چوکنے رہنا کہیں ہماری غفلت میں سردار کوئی چال نہ چل جائے'' پھر اسے نے دیکھا کہ اس کی ماں اور اس کا دوست کنعان پہلے سے زیادہ چوکس کھڑے ہو چکے تھے۔ ابراہیم نے سارے منظر کو اپنی بے پناہ حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا اور اس کی جان سے پیاری بیوی اس کے سامنے موجود ہیں لیکن ساتھ ہی سردار اور اس کے حواری بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے اور سب کے چہروں سے ہزاروں سوال جھانک رہے تھے۔ ابراہیم سردار کے سامنے جھکنے کا سوچ ہی رہا تھا جیسا کہ قبیلے کی روایت تھی کہ یکایک اس کی بیوی زلیخاں اس کی طرف بڑھی اور اس کے سینے سے لگ گئی زلیخاں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب کبھی آپ کو نہیں دیکھ سکوں گی مگر ہمارے بیٹے نے وہ کر دکھایا جس کا میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔'' زلیخاں کی بات سن کر بھی ابراہیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ماں کو باپ کے سینے سے لگے دیکھ کر سلمان اور بھی محتاط اور ہوشیار ہو گیا کہ اب وہ تین سے دو ہو چکے تھے ان کی ماں ان کے ساتھ نہیں رہی تھی وہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر کہیں سے کہیں نکل چکی تھی۔

اسی وقت سردار کی آواز پھر گونجی۔

''زلیخاں تم اپنے شوہر کو لے جا سکتی ہو۔ ہم نے اسے آزاد کیا۔'' ابراہیم کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا وہ سردار سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ سلمان ان کے قریب آیا اور بولا۔

''بابا اب یہاں سے چلے جانا ہوگا ہم اور یہاں نہیں رک سکتے چلیں جلدی کریں''

''مگر بیٹے مجھے بتاؤ تو یہ سب کیا ہے؟'' ابراہیم کی حالت ابھی تک ایسی تھی کہ وہ تحیر کے پانیوں میں ڈول رہا تھا۔ آخر ایسا کیسے ہوا سردار نے اسے کیوں اور کس لیے رہا کر دیا وہ بھی بنا کسی پوچھ گچھ کے۔ پھر اس کی نظر میدان کے دوسرے حصے پر پڑی اور وہاں جو اس نے اپنے جیسے جنات کی لاشوں کے انبار دیکھے تو اس کی جیسے آواز گنگ ہوئی اور اس نے کچھ دیر تک جیسے اپنے ہوش و حواس کھو دیے۔ اسے یقین نہیں آیا کہ سردار کی ناقابل تسخیر فوج کو کسی نے ایسی بے چارگی سے شکست سے دوچار کر دیا تھا اور اس شکست کا اس کی رہائی سے کیا تعلق ہے۔ تاہم اسے سلمان نے سمجھایا کہ میں آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گا اس وقت یہاں سے چلیں اور وہ باپ کو تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں سے لیے چلا گیا ابھی وہ اس جنگ کے میدان سے باہر نہیں نکلے تھے کہ سردار کی آواز پھر گونجی۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو اب تم میں سے کسی کو بھی قبیلے میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس لیے تمہیں یہ قبیلہ چھوڑ کر جانا ہوگا۔'' سلمان نے سردار کی بات سن کر ایک تمسخرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا اور اسے لگا ایک شکست خوردہ سردار آخری بار خود کو یہ یقین دلا رہا ہے وہ قبیلے کا سب سے طاقت ور جن ہے اور اسے اب بھی حکم دینے کا حق حاصل ہے ورنہ اس شکست کے بعد سردار کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اس حکم کی کیا حیثیت ہے یہ تو سلمان کا اچھا اور نیک دل ہی تھا جو اس نے بگل بجنے کے بعد خود ہی جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا تھا ورنہ وہ اور اس کے ساتھی چاہتے تو آج سردار کی سرداری کو ہمیشہ کے لیے مٹا سکتے تھے۔

مگر سلمان کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بنا اور لڑے جب سردار نے اس کے باپ کو رہا کرنے کا فیصلہ سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ اسے اب اور جنگ و قتال کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس نے

سردار کی اس احمقانہ بات کا جواب دینے کے بجائے اسے بھی اپنے حق میں کچھ کے نظر انداز کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کے مقابلے میں اس کے باپ کو قبیلے سے دور لے جانا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کا باپ ایسا قدیمی خیالات کا جن تھا جو بنا قبیلے کے رہنا کالے پانیوں کی سزا سے کم نہیں جانتا تھا۔ سلمان کا عشق کہتا تھا کہ اسے اب یہاں رہنا نہیں ہے اسے ہر حال میں اپنی صنوبر کے پاس پہنچنا ہوگا اور اسے ہر مصیبت سے بچانا ہوگا۔ صنوبر کا خیال آتے ہی وہ ایک دم ہی اپنے آس پاس سے بیگانہ ہوگیا اور سوچنے لگا کہ پتا نہیں اس کے اس طرح وہاں سے چلے آنے کے بعد صنوبر پر کیا گزری ہو۔ اس نے اس کے یوں چلے جانے کو کہیں بزدلی اور بے وفائی سے تو تعبیر نہیں کیا ہوگا۔ ابھی وہ اپنے زہر عشق کی مزید الجھنوں میں پتا نہیں کہاں سے کہاں نکلنے والا ہی تھا کہ کنعان اس کے قریب آیا اور بولا۔

''اب کیا سوچا ہے۔ ہم کہاں جائیں گے سردار نے ہمیں دیس نکالا دے دیا ہے۔ قبیلے سے نکل جانے کا حکم سنا دیا ہے۔''

''سردار کی کیا مجال ہے جو وہ مجھے یہاں سے نکال سکے۔ یہ ایک شکست خوردہ جن کا آخری حکم تھا جو اس نے اپنی ہی تسلی کے لیے دیا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی سردار ہے یا جنات نے اسے اپنا سردار ماننے سے انکار کر دیا ہے اس سے زیادہ اس کے اس حکم کی کوئی حیثیت نہیں ہے مگر میں خود یہاں نہیں رہنا چاہتا اس لیے ہم یہاں سے چلے جائیں گے'' سلمان نے جوش اور جذبات کے ملے جلے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ ہی تو پوچھ رہا ہوں ہم جائیں گے کہاں؟'' کنعان نے پوچھا۔

''تم بھی عجیب ہو کنعان اس وقت جب کہ تمہیں اس بات کے حصار سے باہر ہی نہیں نکلنا چاہیے تھا کہ ہم نے بابا کو رہا کرا لیا تھا اور اب ہم سردار کی طاقت کو شکست دے کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ جبکہ تمہیں تو اس مقصد کی کامیابی پر تھوڑا سا بھی یقین نہیں تھا پھر اتنی جلدی اس اتنی اہم اور دبیز بات کو بھول کر تمہیں یہاں سے جانے کی پڑی ہوئی ہے'' سلمان کی بات سن کر کنعان نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو....'' سلمان نے اشتیاق سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''قسم سے مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ یہ خوفناک جنگ میں نے ان ہاتھوں سے لڑی ہے اور یہ میں ہی تھا جس نے سردار کے انگنت سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا''

''کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو!'' سلمان اس کی بات سن ایک عجیب سے مخمصے میں الجھ گیا۔

''کھل کے یہ کہ ہم نے جنگ ضرور لڑی مگر ہمیں کہیں کسی بھی مرحلے پر یہ احساس تک نہیں ہوا کہ یہ ہم ہیں جو سردار کی بہادر سپاہ کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک رہے ہیں''

کنعان کی بات سن کر سلمان کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ پھر بھی اس نے پوچھا۔

''تمہارا مطلب ہے تمہیں ہوش ہی نہیں ہے کہ تم ایک ایسی خوفناک جنگ لڑ رہے تھے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ ہمارے تو صرف ہاتھ تھے، وجود تھا لیکن طاقت کوئی اور ہی تھی جو اس وقت ہمارے وجود میں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ ہم نہیں ہمارے بہروپ میں کوئی غیبی طاقت تھی جس نے تمہارے ساتھ یہ جنگ لڑی اور فتح حاصل کی اور اب جو تم سے بات کر رہا ہوں تو یہ میں ہوں تمہارا دوست کنعان۔ تم اگر مجھ سے اب بھی یہ کہو کہ ہم سردار کی فوج کے نرغے سے تمہارے بابا کو آزاد کرا سکتے ہیں تو میرا جواب اب بھی یہی ہوگا کہ یہ ناممکن ہے'' سلمان کنعان کی بات کو پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ سردار کے خلاف جنگ میں کنعان کے روپ میں کوئی اور غیر مرئی طاقت تھی جس نے اس کا ساتھ دیا تھا اور اب وہ طاقت اپنا کام

کر کے جا چکی ہے اور یہ احساس بھی کنعان کے پاس موجود نہیں ہے کہ اس نے کیسے اور کس طرح سردار کے سپاہیوں کو ایک ایک کر نیست و نابود کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا اور دل ہی دل میں اپنے رب ذوالجلال کا شکر بجالایا جس نے ایسے کڑے وقت میں اس کی ایسی مدد کی جیسی وہ اپنے نیک بندوں کی کیا کرتا ہے غیر معمولی اور ناقابل یقین.....

''لیکن تم خود کو بار بار ہم کہہ کر کیوں تخاطب کر رہے ہو؟'' سلمان کی یہ بات سن کر کنعان کے منہ سے ایک ہنسی میں لپٹی ہوئی آواز نکلی اور وہ اسی انداز میں بولا۔

''تو کیا تمہارا خیال ہے تمہاری ماں کو میری جیسی کیفیت کا سامنا نہیں ہوا ہے۔ یقین نہیں آتا تو جاؤ اور ان سے پوچھ لو وہ بھی میری طرح اس احساس سے بے خبر ہو چکی ہیں کہ انھوں نے اتنی بہادری سے سردار کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کیسے کیا ہے'' کنعان کی بات سن کر سلمان کو یقین آ گیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ یقیناً اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا اور ان کے قریب جا کے بولا۔

''اگر آپ لوگ تھک رہے ہیں تو یہاں قریب جو غار ہے ہم اس میں کچھ دیر ٹھہر سکتے ہیں اس طرح بابا آرام بھی کر لیں گے'' زلیخاں نے ابراہیم کی طرف دیکھا اور بولی۔

''نہیں بیٹا ہمیں سردار کے قبیلے کی سرحدوں سے دور نکل کر ہی ستانے اور آرام کرنے کا سوچنا چاہیے۔ کچھ پتا نہیں کہ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے کس طرح کی منصوبہ بندیاں کر رہا ہو'' زلیخاں کی بات سن کر ابراہیم کے چہرے پر حیرت اور ناخوشگواریت کے آثار نمایاں ہو گئے۔

''تم تو اس طرح کہہ رہی ہو زلیخاں جیسے وہ قبیلہ کبھی ہمارا تھا ہی نہیں اور بس سردار کا ہی تھا۔'' ابراہیم نے اسی لہجے میں کہا۔

''اب آپ کو اچھا لگے یا برا لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس قبیلے سے اب ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا آپ نے سنا نہیں سردار کیا کہہ رہا تھا اس نے ہمیں قبیلہ بدر کر دینے کا حکم دیا تھا تو اب ہم اس قبیلے میں کیسے رہ سکتے ہیں'' زلیخاں کی بات سن کر ابراہیم کی سمجھ میں اب بھی پوری بات نہیں آ سکی کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم تین جنوں نے مل کر سردار کی ایسی غضب ناک فوج کو شکست کیسے دی اور یہ کیسے ہوا کہ سردار جو کل تک مجھے سزا دینے اور میری موت کے در پہ ہو رہا تھا اس نے مجھے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔'' ابراہیم اب بھی بے یقینی کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

''یہ سب تو میں آپ کو کسی محفوظ جگہ تک پہنچ کر بتاؤں گا یہ کیسے ہوا۔ لیکن آپ جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ سردار نے آپ کو رہا کر کے آپ پر کوئی احسان کیا ہے تو ایسا نہیں ہے ایک ہارے ہوئے سردار کو اپنی مکمل شکست سامنے نظر آ رہی تھی اس نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ آپ کو باعزت رہا کر دے نہیں تو اس کا اپنا اور اس کے قبیلے کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔''

سلمان کی بات سن کر اس کے باپ نے اسے حیرت اور ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کے بیٹے کا انسانوں میں رہتے رہتے دماغ کچھ خراب ہو چکا ہے۔ لیکن اب وہ بولا کچھ نہیں چپ رہا۔ وہ کبھی چلتے اور کبھی اڑنے لگتے ایسے ہی سارا سفر طے کیا۔ مگر اب بھی وہ اپنے گھروں سے دور تھے۔ پتا نہیں یہ فاصلہ کس قدر طویل تھا۔ کنعان سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر پہنچ کر اپنے ماں باپ کو کیسے راضی کرے گا۔ کیا کہے گا ان سے کہ سردار نے انھیں بھی سلمان کے ماں باپ کے ساتھ قبیلہ بدر کر دیا ہے۔ پتا نہیں وہ مانیں گے یا نہیں.... نہ مانے تو؟'' یہ سوال ایک لمحے کو اس کے حلق میں تیر ہو گیا۔ پھر اس نے خود کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ اپنے والدین کو ضرور بالضرور راضی کر لے گا۔ وہ اس کی بات کبھی ٹال ہی نہیں سکتے۔

''کیا اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہے ہو؟'' سلمان نے قریب پہنچ کر کہا تو اس نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا'' کیا سلمان سوچوں کے لیے دماغ کو اور احساس کے لیے دل کو سمجھ لیتا ہے!''

''کیا سوچنے لگے؟'' سلمان نے کہا۔ ''ہاں یہی سوچ رہا تھا کہ میرے ماں باپ کیسے راضی ہوں گے میں ان سے کیا کہوں گا کہ سردار نے انھیں کیوں قبیلے سے جانے کا کہا ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو اس وقت تو انھیں یہ بات سمجھانا ممکن نہیں ہو گا تمھیں بس انھیں یہ کہنا ہو گا کہ ان کے سارے سوالوں کے جواب بعد میں دے دو گے اس وقت تو یہاں سے چلیں۔ اگر انھوں نے دیر کی تو کہیں سردار کے آدمی انھیں گرفتار کرنے نہ پہنچ جائیں۔ ہو سکتا ہے اس خوف سے وہ کوئی زیادہ حجت نہ کریں اور تمہاری بات مان جائیں'' سلمان کی بات سن کر کنعان کو کچھ حوصلہ ملا اور اسے یہ یقین آنے لگا کہ اس کے ماں باپ اس کی بات مان کر ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائیں گے۔

☆☆☆

جنگ ہارنے اور ابراہیم کو رہا کرنے کے بعد سردار وہاں رکا نہیں اور یعقوب کو لے کر سیدھا عظیم روحانی کاہن کی مجلسی عمارت میں پہنچا جو باقی گھروں کی طرح ایک غار میں ہی قائم تھی۔ عظیم کاہن کو معلوم تھا کہ سردار زخمی ناگ کی طرح جنگ میں ہونے والی شکست کے بارے میں جاننے کو سخت بے چین ہو گا اور سب سے پہلے اسی سے یہ پوچھنے پہنچے گا کہ وہ جنگ تین جنوں سے کیسے ہار سکتے ہیں۔ کاہن کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ وہ اس سے اس کی روحانی عظمت اور ایک چھوٹی عمر کے جن کے سامنے ہونے والی شکست کے بارے میں بھی بہت سے سوالات کرے گا۔ یہی ہوا جس وقت شاش اس کی عبادت گاہ میں داخل ہوا تو وہ اپنی عبادت کے آخری لمحوں میں تھا لیکن یہ بات اسے اب بھی معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ سلمان کو ایسی غیبی مدد کیوں کر ملی اس کی اصل وجہ کیا ہے؟؟

سردار کی گرجتی ہوئی آواز اسے سنائی دی تو وہ کاہن سمجھ گیا کہ سردار اس سے ملنے آ پہنچا ہے.... کاہن اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے سردار کے سامنے پہنچا۔ اس نے سردار کی طرف دیکھا۔ غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے پر شعلہ بار آنکھیں ایسے جل رہی تھیں کہ کاہن کو ایک لمحے کو اپنا وجود سردار کے غصے اور طیش کے سامنے بے بسی سے تڑپتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ جانتا تھا سردار کسی بھی بات سے ناراض ہونے کی صورت میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا کا حکم دے سکتا تھا اس لیے اس نے سردار کے غصے کو قابو میں رکھنے کے بارے میں گہری سوچ بچار کی تھی اور سوچ لیا تھا کہ اسے سردار سے کیا کہنا ہے.....

☆☆☆

تین دن ہو چکے تھے۔ شرجیل کو گھر سے گئے ہوئے۔ اور ان تین دنوں میں شرجیل کے باپ سرفراز نے کون سی ایسی جگہ یا رشتے دار اور اس کے دوستوں کے گھر تھے جہاں اس کے بارے میں پتا نہیں کروا لیا تھا اس کی فیکٹری کے کتنے ہی لوگ تھے جو اس کام پر مامور تھے اور دن رات شرجیل کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی لیکن وہ کہیں ہوتا تو ملتا۔

ملک سے باہر بھی ہر رشتے دار اور امکانی جگہوں پر اس کے بارے میں پتا کرو کر دیکھ لیا تھا مگر کہیں سے امید کی کوئی کرن جگمگاتی ہوئی نہیں نظر آئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا شرجیل کے ملنے کی امیدیں ماند پڑتی جا رہی تھیں اور یہ ایک اندیشہ جو سب ہی ذہنوں اور دلوں میں سرسرا رہا تھا کہ کہیں اسی دشمن نے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو جس نے پہلے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اندیشہ تھا مگر اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی سب ہی اس حقیقت سے آنکھیں چرانا چاہتے تھے۔ا

بلکہ دور پرے کے رشتے داروں اور ملنے والوں میں ایسی باتیں دبے لفظوں میں کہی جانے لگی تھیں۔
فیکٹری کے مزدوروں اور ہر محکمے کے ورکرز بھی اپنی اپنی سمجھ سے گوٹیاں ملا رہے تھے۔ لیکن اصل بات نہ کوئی جانتا تھا اور نہ ہی اس کے بارے رائے دینے کے قابل تھا۔ صنوبر کی سوچیں شل ہو چکی تھیں۔ درد جیسے دل میں آ کے ایسے بیٹھ گیا تھا کہ اب اس کو کہیں اور کبھی نہیں جانا۔ اس کی بھوک پیاس اور ہنسنے بولنے کی ساری صلاحیتیں جیسے مر چکی تھیں اور وہ خود بھی آدھی مر چکی تھی۔ اسے شرجیل نے دوسری بار ایسا دکھ دیا تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا۔ پچھلی بار بھی جب وہ ملک سے باہر گیا تھا تب اس کے ماں باپ نے اس پر کہیں اور شادی کے لیے دباؤ ڈالا ہوا تھا اور وہ سوچ بچار کرنے اور فیصلہ کرنے کی خاطر یہاں سے دوریوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ صنوبر سے دور بھیج دیا گیا تھا تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اور صنوبر سے ملنے کی جو تڑپ اس کے دل میں موجود تھی وہ اس کے فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں کو نقصان نہ پہنچا سکے....
محبت سچی ہو تو اسے کہیں بھی بھیج دو۔ کسی بھی ماحول میں قید کر دو۔ وہ مر تو سکتی ہے مگر بے وفائی نہیں کر سکتی اور ایسا ہی ہوا تھا شرجیل کوئی تین مہینے بعد واپس آیا اور وہ ثابت قدم تھا اس نے اپنی محبت کا دامن چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بتا دیا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر صنوبر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ واپس آنے کے بعد جب وہ صنوبر سے ملا تو صنوبر کو اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر کیوں چلا گیا تھا اور اگر ایسا کر ہی چکا تھا تو وہاں رہ کر اسے فون کر سکتا تھا۔ لیکن شرجیل نے کچھ بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ خود کو بھی آزمانا چاہتا تھا اور جانتا تھا کہ صنوبر سے رابطہ کرنے کی صورت میں اس کی صرف آواز سن کر بھی اسے پھر سے جینے اور اس کی محبت کو فخر سے اپنانے کی طاقت مل جائے گی اور وہ اپنے آپ سے بھی سارے سہارے چھین کر ہی خود کو آزمانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے صنوبر کو کوئی اطلاع نہیں دی اور اسے پوری طرح بے خبر رکھا۔
شرجیل کو لگا کہ وہ امتحان میں پورا اترا تھا۔ مگر اصل حقیقت تو یہ تھی کہ امتحان تو صنوبر نے دیا تھا جو کچھ نہیں جانتی تھی کہ اس کا شرجیل کہاں ہے اور کس لیے وہ اس سے دور ہے اس کے باوجود وہ نہ صرف شرجیل کا انتظار کرتی رہی اس کی محبت کو دل سے لگا کر جیتی رہی اصل امتحان ہوتا ہی وہ ہے جس میں آپ کو نہ سوال پتا ہوں اور نہ جواب پھر بھی آپ ثابت قدم رہیں۔
صنوبر کتنی ہی دیر تک شرجیل سے ناراض رہی لیکن پھر مان ہی گئی۔ عورت کا دماغ بھلے ہی مرد سے چھوٹا ہوتا ہو مگر اس کا دل ہمیشہ مرد سے زیادہ بڑا ہوتا ہے اور ایسا کتنی ہی بار کتنے ہی واقعات میں ثابت ہو چکا ہے۔
اسے یاد آ رہا تھا کہ شرجیل نے اس سے وعدہ کیا تھا اب وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا اور جب بھی کہیں بھی چند گھنٹوں کے لیے بھی جائے گا تو اسے ضرور باخبر رکھے گا لیکن اس بار بھی ایسا نہیں ہوا اور وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا نہ جاتے ہوئے بتایا اور جانے کے بعد کوئی فون کیا نہ کسی اور ذریعے سے کوئی خبر بھیجی۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا وہ مجھ سے بھی ناراض تھا لیکن مجھ سے کیوں ناراض ہوگا میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ ایسے ہی سوالوں میں پر وقت ہر پل وہ گھری رہتی خود ہی سوال کرتی خود ہی جواب دیتی مگر دل کو سکون پھر بھی نہیں ملتا تھا کہ اصل حقیقت سے تو وہ بالکل بے خبر تھی۔
وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا شرجیل تو دنیا سے کب کا جا چکا ہے۔ اب اس کا صرف وجود باقی ہے جس میں سلمان رہتا ہے اور سلمان کو کیا پتا کہ شرجیل نے اس سے کون کون سے وعدے کیے تھے جو اسے نبھانے تھے اسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ خود بھی صنوبر سے عشق کرتا ہے اور عشق بھی ایسا کہ صنوبر کی خاطر وہ کتنے ہی بہروپ بھر چکا تھا اس کے ماں باپ کی جانیں خطرے میں پڑ گئیں اس کا قبیلہ چھوٹ گیا اور وہ خود دربدر ہو گیا

پھر بھی اسے صنوبر کی محبت نہیں ملی اسے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سے نہیں کسی اور سے محبت کرتی ہے اور وہ کسی اور شرجیل ہے تو اسے بہت دکھ ہوا تھا اتنا کہ اس نے خود کو اس جہان فانی سے کہیں دور بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے سوچ لیا کہ جس زندگی میں صنوبر کی محبت نہیں ہے اس زندگی کو جینے کا فائدہ کیا ہے اس لیے وہ اپنی جان جان آفریں کے حوالے کرنے ہی والا تھا کہ اسے ایک پرنور چہرے والے بزرگ دکھائی دیے جو اسے دور کہیں آسمانوں پر جنت اور دوزخ کے پاس لے گئے اور انھوں نے اس پر یہ راز کھولا کہ جنت اور دوزخ کے علاوہ بھی ایسی ایک جگہ ہے جہاں اس جیسے ٹوٹے دلوں کو رکھا جائے گا۔ جہاں ان کے دل جوڑ دیے جائیں گے۔ اور انھیں وہ سب ملے گا جو انھیں دنیا میں نہیں مل سکا تھا۔

لیکن اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے زندگی کا سفر پورا کیا ہو۔ اپنے پورے سانس لیے ہوں اور خود کو کبھی اس محبت کے دائرے سے باہر کھینچ لانے کی کبھی کوئی کوشش نہ کی ہو۔ محبت کو نفرت اور انتقام سے نہ بدلا ہو اور پوری طرح ثابت قدمی سے جیا ہو بن پڑے تو اپنے محبوب کے لیے ہر وقت' ہر مصیبت میں اس کی مدد کی ہو ان سب شرائط پر جو بھی محبت کا روگی پورا اترے گا اسے ہی اس عظیم اور ناقابل بیان مقام پر لائے جائے گا اور یہ مقام ایسا مقام ہے۔ جو اس کے سارے دکھوں کا مداوا ہے اس کے لیے سکھ اور شانتی کی وہ منزل ہے۔ جس کے بارے میں اگر کسی کو بھی پہلے سے بتا دیا جائے تو سب ہی یہاں آنے کی آرزو کریں اور کسی کی بھی محبت بھی نفرت سے نہ بدلے' کوئی کسی کو دھوکے باز کہے اور نہ دھوکا دے مگر جس نے محبت بنائی ہے وہ نہیں چاہتا کہ محبت کو اتنی سستی شے بنا دیا جائے۔ محبت تو دنیا کی سب سے مہنگی دولت ہے اور یہ ہر کسی کو ملتی بھی نہیں ہے....

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں\
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اسی لیے پرنور چہرے والے باریش بزرگ نے سلمان کو بھی وہ جگہ پوری طرح نہیں دکھائی اور سلمان کی آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جو کچھ بھی اس نے دیکھا تھا وہ سب ایک خواب تھا لیکن ایسا سچا خواب جس کے خواب ہونے پر جاگنے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آیا اور وہ مسلسل ان نورانی چہرے والے بزرگ کو تلاش کرتا رہا اور پھر وہ اسے ایک جگہ مل گئے اور انھوں نے اسے جینے کا سلیقہ بتایا انھوں نے اسے بتایا کہ وہ عشق کی ناکامی پر دل نہ ہارے اور خود کو ان سب امتحانات سے گزارنے کے لیے تیار رکھے جن سے گزر کر اس کی محبت سرخرو ہو جائے گی اور اسے وہ مل جائے گا جو کسی نفس کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ تب سے سلمان نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ شرجیل اور صنوبر کو ایک کرنے میں ان کی ممکن مدد کرے گا اور بھی اپنے اس منصب سے روگردانی نہیں کرے گا۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی شرجیل کو موت کے منہ میں جانے سے نہیں بچا سکا محبت کے سو دشمنوں نے چھپ کر اور ایسا کاری وار کیا تھا کہ شرجیل اس سے جانبر نہیں ہو سکا اور اسے فوری اور جذباتی فیصلے کے تحت خود کو شرجیل کے جسم میں حلول کرنا پڑا۔ اب شرجیل مر کے بھی زندہ تھا اور سلمان تحلیل ہو چکا تھا۔

کون ہو گا دنیا میں کو ایسے امتحان سے گزر سکتا ہو کہ جسے دل سے چاہا ہو اسے کسی اور کے حوالے کر وہ بھی خوشی اور اپنی مرضی سے۔

سلمان نے صرف ایسا کیا بلکہ وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ اب ہمیشہ کے لیے اپنی ہستی کو مٹا ڈالے گا اور آخری سانس تک صنوبر کا شرجیل بن کر ہی زندگی گزار دے گا۔ اسے کیا معلوم تھا فیصلہ کرتے ہی اس پر ایسی افتاد پڑے گی اور اسے بتایا جائے گا کہ اس کے پیدا کرنے والے ماں باپ کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

سرداران کی جان کا دشمن بن جائے گا اور یہ سب اسی کی وجہ سے ہوگا کہ اس کا قبیلے میں موجود نہ ہونا اور مسلسل جھوٹ بولتے چلے جانا اس کے ماں باپ کی زندگیوں کے لیے اتنا بڑا خطرہ بن جائے گا کہ انھیں اس راستے میں اپنی جانوں کا نذرانہ بھی دینا پڑ سکتا ہے۔ یہ سب سننے کے بعد اس سے رہا نہیں گیا اور اسے اپنے والد کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کی خاطر اپنے قبیلے میں واپس آنا پڑا تا کہ وہ اپنے باپ کو سردار کی قید اور پھر موت کی سزا سے بچا سکے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو اسے یقین تھا اگر اس کے بابا کو کچھ ہوا تو اس کے غم میں اس کی ماں بھی زندہ نہیں رہ سکے گی اور وہ اپنی ماں اپنے باپ کو اس جرم کی سزا میں مرنے نہیں دینا چاہتا تھا جو انھوں نے کیا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اس کے شوق عشق کی سزا میں مصلوب ہونے والے تھے تو کیوں انھیں یہ سزا ملے۔ بس ایسا ہی کچھ سوچ کر اسے شرجیل کو وہاں سے بھگا لانا پڑا اور اس سب میں جو قصور اس سے سرزد ہوا وہ یہی تھا کہ اس نے صنوبر کو نہیں بتایا تھا۔

وہ کہاں جانتا تھا کہ شرجیل پہلے بھی ایسا کر چکا تھا۔ جانتا بھی تھا تو اسے یاد نہیں رہا کہ وہ اب سلمان نہیں صنوبر کا شرجیل ہے۔ ماں باپ کے سر پر موت منڈلائی تو اسے بس اتنا ہی یاد رہا کہ وہ ان کا بیٹا سلمان ہے اور اسے انھیں بچانا ہی ہوگا۔ ہر بیٹے کا یہ فرض ہوتا ہے اور اسے بھی یہ فرض پورا کرنا تھا۔ کرنا چاہیے ایسے ہی خیالات نے اس کی رگ رگ میں آگ بھر دی اور وہ اپنے ماں باپ کو بچانے چلا آیا۔

مگر اب وہ کب سے غار کے ایک کونے میں بیٹھا مسلسل صنوبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اس کی اس حرکت کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اسے شرجیل کے ماں باپ کی اتنی فکر نہیں تھی اسے فکر تھی تو بس صنوبر کی تھی جو اس کا عشق ہے اور شرجیل کی محبت ہے۔ پتا نہیں اس کے بعد کیا ہونے والا ہے وہ سوچ کے گھوڑے دوڑاتا رہا لیکن کوئی ایسی بات وہ غلطی سے بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں صنوبر نے کہیں اسے بھلا تو نہیں دیا۔ کہیں وہ اتنی ناراض تو نہیں ہوگئی کہ اب اس کی شکل تک دیکھنا نہ چاہتی ہو۔ وہ سوچتا رہا اور کڑھتا رہا مگر اس کے دل کو کسی بھی بات سے سکون نہیں مل رہا تھا۔

اس کے قریب ہی خاموش بیٹھا ہوا کنعان جس نے اس کی خاطر اپنی جان تک کی پروا نہیں کی تھی اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ اس کے ماں باپ اس کے کہنے سے اس کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں جانے پر راضی ہوں گے بھی یا نہیں... اگر وہ نہ مانے تو کیا ہوگا۔ سردار اسے یہاں رہنے نہیں دے گا اور سلمان کے یہاں سے جاتے ہی اسے اور اس کے ماں باپ کو ایسی کڑی اور عبرت ناک سزا دے گا کہ جنات کے قبیلے میں بھی بھول سے بھی کوئی سردار کے خلاف سر نہیں اٹھا سکے گا۔

سردار کے ظلم کے بارے میں سوچ کر وہ کانپ سا جاتا اب اس کے سامنے کوئی راستا باقی نہیں رہا تھا اسے ہر حال میں اپنے ماں باپ کو ساتھ لے جانا ہوگا ایسا نہ ہوا تو اس کے ماں باپ بے موت مارے جانے کے خطرے میں رہیں گے اور وہ انھیں چھوڑ کے جا نہیں جا سکے گا۔

سلمان نے کس مشکل سے اپنے ماں باپ کی جان بچائی ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جو جانیں اس نے بچائی ہیں انہی جانوں کو وہ پھر سے سردار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ جانتا تھا سلمان کی غیر موجودگی میں ان کی حیثیت کسی معمولی کیڑوں مکڑوں سے زیادہ نہیں تھی۔

''اگر میرے ماں باپ جانے پر راضی نہ ہوئے تو؟'' کنعان نے جیسے اس کی اداسی اور سکوت کو اپنے سوال سے متزلزل کر دیا تھا۔

''انھیں جانا ہی ہوگا اس کے علاوہ کوئی اور راستا نہیں ہے ہمارے پاس۔ سردار کو جب بھی موقع ملے گا وہ وار ضرور کرے گا اور اس کے وار سے بچنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ انھیں جانا ہی ہوگا۔''

''فرض کرو وہ نہ مانے تو کیا تم.....!'' پوری بات کنعان کر نہیں سکا کیوں اس کی بات ابھی مکمل

نہیں ہوئی تھی اور سلمان نے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے ایسے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو ''یہ ناممکن ہے کہ میں یہاں تمہاری حفاظت کی خاطر رک جاؤں مجھے تو ہر حال میں جانا ہوگا''

''تم جو کہنا چاہتے ہو اور جو سوچ رہے ہو وہ ناممکن ہے کنعان۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے میری اور میرے والد کی جان بچانے میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کی مگر اس کا بدلہ اب مجھ سے یوں تو نہ لو کہ میں جیتے جی مر جاؤں۔ اور میری زندگی دکھتا ہوا پھوڑا بن جائے۔'' سلمان کی اداسی اور اندیشوں میں ڈوبی آواز سے کنعان نے اندازہ لگالیا کہ اسے ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے تھی۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں ایسا کیا ہے جس کی خاطر تم نے خود کو فراموش کر دیا ہے اور اسی مقصد کی خاطر جی رہے ہو؟''

''ابھی نہیں.... وقت آنے پر میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ مگر ابھی میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔'' سلمان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''تم پریشان کیوں ہوتے ہو ہم تمہارے اماں اور ابا کو منالیں گے انھیں ہمارے ساتھ جانا ہی ہوگا۔'' سلمان نے اسے دلاسا دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے سلمان مگر ایک اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی!'' کنعان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ ہم تمہارے ماموں کے قبیلے میں جا کے رہنے لگتے۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ہم انسانوں میں ہی جا کر رہیں'' کنعان کے لہجے میں جو کچھ تھا وہ سلمان سمجھ چکا تھا۔

''اتنی بڑی لڑائی لڑنے کے بعد کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہاں کا سردار بھی ہمارے سردار کا ماتحت ہے۔

اول تو وہ سردار شاش کے باغیوں کو کبھی پناہ نہیں دے گا اور اگر میرے ماموں مان بھی گئے اپنی بہن کی وجہ سے تو یہ اپنے ساتھ ساتھ ان کی جان کو بھی خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔''

سلمان نے قدرے تفصیل سے اسے بات سمجھائی تو کنعان کو ماننا ہی پڑا کہ سلمان سچ کہتا ہے ہمارے پاس انسانوں کی دنیا میں جا کے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔

ابراہیم کو اس کی بیوی زلیخاں نے بہت حد تک مطمئن تو کر دیا تھا مگر ابراہیم اندر سے اب بھی اداس تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے پہلی بار ہی سلمان کی ضد کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے ہوتے اور اسے پڑھنے کے لیے انسانوں کی دنیا میں نہ بھیجا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔

اسے رہ رہ کر ملال ہو رہا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر گئے وقت کو واپس لانے کی اس میں قدرت تھی اور نہ ہی ایسا ممکن تھا اب تو جو بھی ہو چکا تھا اسے جھیلنا ہی ہوگا اس نے سوچا۔ اسے اپنے قبیلے سے چلے جانے کا اتنا دکھ تھا کہ اس دکھ اس کے سامنے دنیا کا ہر دکھ چھوٹا تھا۔ وہ خوشی خوشی سزا پانے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ اسے بیٹے کے راز کو چھپانے کی سزا دی جا رہی تھی اور اسے بیٹے کی زندگی کی خاطر یہ سزا منظور تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے اسے اپنے قبیلے سے الگ ہونا پڑے گا۔

ابراہیم ان جنات میں سے تھا جو سمجھتے تھے کہ جس آدمی کا کوئی قبیلہ نہیں ہوتا وہ سمجھو جن ہی نہیں ہے ایسے جن کو صرف شیطان کے قبیلے میں ہی پناہ ملتی ہے اور تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا اور وہ خود کو شیطان کا چیلہ نہیں کہلوا سکتا تھا اس زندگی سے تو وہ موت کہیں زیادہ اچھی تھی جو سردار اسے سلمان کا راز چھپانے کی پاداش میں دینے والا تھا۔

زلیخاں نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گئی کہ اس کی ہر طرح کی تسلی اور دلاسا اس کے ابراہیم کو مطمئن نہیں کر سکا قبیلے سے جدائی تو جیسے ابراہیم کے لیے زندگی سے دور چلے جانے کے مترادف تھا۔ وہ دبے لفظوں

میں یہ کہہ چکا تھا کہ ۔تم لوگوں نے مجھے کیوں بچایا مرجانے دیتے۔'' اس کی بات سن کر ایک لمحے کو زلیخاں کو غصہ سا آ گیا تھا مگر وہ جانتی تھی اس وقت وہ قبیلے سے دور چلے جانے کے سوگ میں مبتلا ہے اس وقت اسے کوئی معقول بات بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں آئے گی مگر وقت گزر جانے کے بعد وہ سب کچھ سمجھ جائے گا۔ زلیخاں اس خیال کی مالک تھی کہ اپنی اولاد سے بڑھ کر نہ تو کوئی اصول ہوتا ہے جسے توڑا نہ جا سکتا ہو اور نہ ہی کسی قبیلے کی کوئی شناخت اور پہچان ایسی ہو سکتی ہے اولاد پر جسے ترجیح دی جا سکتی ہو۔ ایک عورت تو مرد کی خاطر اپنا قبیلہ' اپنے لوگ اپنا گھر بار پہلے ہی چھوڑ چکی ہوتی ہے تو اس کے لیے محبت اور رشتوں سے زیادہ اہم کیا ہو سکتا ہے یہی فرق ہوتا ہے عورت اور مرد کی سوچوں میں جو اس وقت زلیخاں اور ابراہیم کی سوچوں میں دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

''کہو کاہن یہ کیسے ہوا کہ وہ کل کا وہ جن تمہارے جیسے ہزاروں سال سے عبادات غلطاں رہنے والے کاہنوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ سب کے سامنے سے وہ اپنے باپ کو ایسے چھڑا کر لے گیا جیسے یہ کوئی معمولی بات تھی اور اس نے چٹکی بجاتے ہی اسے سر کر لیا۔'' سردار کا اور پھر بھڑکا۔

''جانتے ہو کتنی ذلت ہوئی ہے ہماری اور ہمارے قبیلے کی۔ کیسے اب ہم دنیا کے سامنے منہ لے کر اور سینہ تان کر چلیں گے۔ اگر تمہاری عبادات، گہری تپسیائیں اتنی ہی کمزور اور معمولی ہیں تو ہم یہ کیوں نہ اس روحانی مجلس کو ہی ختم کر دیں ویسے بھی ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں نظر آتا۔ بولو کاہن چپ کیوں ہو۔ ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب چاہیے ہیں۔ ابھی اور اسی وقت۔'' سردار کی گرجتی ہوئی آواز نے آس پاس جیسے کسی زلزلے کو جنم دے دیا تھا اور ہر طرف خوف کی چادر سی تن گئی جنات کو معلوم تھا کہ سردار روحانی مجلس کے کاہن اعظم کے پاس گیا ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ آج وہ ہو جائے جو جنات کی دنیا میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ روحانی مجلس کے کاہن اعظم کی گردن اڑا دی جائے اور قبیلہ ہمیشہ کے لیے رانڈ ہو جائے۔ روحانی مجلس نہ رہی تو سمجھو پھر کسی بھی شیطانی بلا کو اور ناگہانی آفت کو روکا نہیں جا سکے گا اور کچھ پتا نہیں کہ قبیلے والے کون کون سی مصیبتوں اور بلاؤں کا شکار ہو جائیں۔ ہر طرف یہی ایک سوچ غالب تھی اور سب دل سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ کچھ بھی ہو سردار روحانی مجلس کو ختم کرنے کا حکم نہ سنائے۔ کاہن چپ تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جو سردار کو مطمئن کر دینے کے لیے کارگر ہو سکتی ہے۔

''جان کی امان پاؤں تو عرض کروں'' کاہن کی ملتجی آواز سنائی دی۔

''کہو... اور جلدی کہو... کاہن'' سردار کو اس وقت کاہن کو کاہن اعظم کہنا بھی گراں گزر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ کاہن اس اعزاز اور خطاب کو رکھنے کا حق کھو چکا ہے۔ اس نے انگارہ برساتی ہوئی آنکھوں سے کاہن کی طرف دیکھا۔ جو سردار کو مطمئن کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا۔

''سردار آپ کا غصہ بجا ہے لیکن یہ صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ کتنی بڑی قیامت تھی جو قبیلے پر ٹوٹنے والی تھی۔ اور اسے ٹالا ہے ہم نے' اس روحانی مجلس نے۔ یہ روحانی مجلس کی روحانی صلاحیت اور قدرت تھی جس نے یہ کھوج لگایا اور وہ بھی بروقت... کہ سلمان کتنی بڑی اور سفاک قوتوں کی مدد لے کر آیا تھا۔

وہ چاہتا تو آپ کو اور پورے قبیلے کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ یہ روحانی مجلس کا ہی کمال تھا جو وقت کے رہتے ہوئے اس طوفان کو بھانپنے میں کامیاب ہوئی ورنہ میرے منہ میں خاک اس وقت نہ آپ یہاں موجود ہوتے اور نہ ہی قبیلے کا کوئی ایک بھی ذی نفس زندہ ہوتا۔

یہ ہمارا ہی بروقت دیا گیا مشورہ تھا کہ اس وقت پسپائی اختیار کر کے ابراہیم کو جانے دیا جائے۔ اس

وقت قبیلے کی زندگی کو بچایا جائے باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔ تو کیا آپ کو لگتا ہے ہم نے غلط کیا اگر ہم نے غلط کیا ہے تو ہم ہر سزا کے لیے تیار ہیں۔''

کاہن چپ ہوا تو سردار کو ایسا لگا کہ واقعی کاہن سچ کہتا ہے ورنہ جس تیزی سے اس کی زیرک اور سیکھی ہوئی بہادر سپاہ کا صفایا کر رہا تھا۔ سلمان اگر یہ جنگ اور کچھ گھنٹے جاری رہتی تو سلمان اس کے سب بہادر جوانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا کر نابود کر دیتا۔

''ٹھیک کہتے ہیں آپ کاہن اعظم'' سردار کی آواز اور لہجے میں پھر سے کاہن کا احترام اور وہی نرمی لوٹ آئی تھی جس کا تقاضا روحانی مجلس سے بات کرتے ہوئے سب ہی سرداروں کو پورا کرنا ہوتا تھا۔

''آپ ہی کی وجہ سے اور بصیرت نے آج قبیلے کو مٹنے سے بچایا ہے۔ آپ نہ ہوتے تو ہم بھی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے اور غصے اور ضد میں شاید سب لوگوں کی جان گنوا بیٹھتے لیکن.....'' سردار دو زانو ہو کر کاہن کے قدموں میں جھک گیا۔

''مجھے یہ جانے بغیر کبھی چین نہیں ملے گا کہ ایک کل کا لونڈا آپ جیسے عظیم کاہن کے علم اور روحانی طاقت سے آگے کیسے نکل گیا۔ اسے کہاں سے ملی ایسی طاقت کہ اس اکیلے نے ہمارے سینکڑوں ہزاروں جوانوں کو موت کا ذائقہ چکھا دیا۔ کہو کاہن یہ کیا راز ہے؟'' سردار جیسے زمین پر جھکتا چلا گیا اس کے دل میں شکست نے ایسی آگ لگا رکھی تھی کہ وہ اس آگ میں اندر ہی اندر جل کر بھسم ہوتا جا رہا تھا۔

''اٹھو سردار... ایسے گر جاؤ گے تو آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ دشمنوں نے تمہیں زمین سے مٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور سلمان کی جیت کو وہ اس کی طاقت نہیں تمہاری کمزوری سمجھ رہے ہیں انھوں نے آپس میں مسکوٹ کر کے تم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہیں اپنے لوگوں کو اپنے قبیلے کو ان دشمنوں سے بچانا ہوگا۔'' کاہن کی آنکھوں میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایسے کسی منظر کو جو ابھی زمین کی چھاتی پر اترا بھی نہیں تھا اپنی آنکھوں سے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کے عین سامنے ہو۔

''کیا کہتے ہو کاہن اعظم... تو کیا سلمان نے اپنے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی ہے۔ وہ ہمیں نیست نابود کر دینا چاہتا ہے۔ کیا آسمانوں کا خدا صرف سلمان کی مدد کر رہا ہے یا کوئی ایسی شیطانی طاقت ہے جو سلمان کے قابو میں آ چکی ہے اور وہ اس کی مدد سے ہمارا وجود مٹانے کے درپہ ہے۔'' سردار کو شکست کے وہ سارے مناظر اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

''نہیں سردار ایسا نہیں ہے'' کاہن نے جلدی سے کہا۔

''تو پھر کیسا ہے۔ مجھے یہ بات پوری طرح پاگل بنا کے چھوڑے گی کہ ایک اتنے کم عمر جن چھوکرے نے میری ایسی غضب کی تربیت یافتہ سپاہ کو مٹی چٹا دی'' سردار کھڑا ہو چکا تھا اور خوف اور بے بسی اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لے چکی تھی۔

''نہیں سردار آپ غلط سمجھ رہے ہیں سلمان آپ کا اور قبیلے کا دشمن نہیں ہے۔ اسے تو بس اپنے باپ ابراہیم کو آپ کی قید سے آزاد کرانا تھا۔ اس کا ارادہ کسی کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا اسی لیے کسی آسمانی طاقت نے اس کی ایسی لازوال مدد کی ہے کہ ہماری عقل دنگ رہ گئی ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' سردار کاہن کی باتیں سن کے متحیر رہ گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سردار۔ سلمان کو اگر اپنے والد کو بنا کسی کو ہلاک کیے لے جانے کی اجازت دے دی جاتی تو اس نے ایک چڑیا کے بچے کو بھی نہیں مارنا تھا۔ اس کا ارادہ جنگ کرنے کا نہیں تھا۔ اس پر جنگ مسلط کی گئی تھی اور اس نے جو کچھ کیا وہ اس کی مجبوری تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ کو اس سے نہیں اصل خطرہ اپنے دشمنوں سے ہے جن تک آپ کی شکست کی خبر پہنچ چکی ہے اور اب وہ آپ سے اپنے ماضی کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



شکستوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔'' کاہن نے کمال جرأت سے اپنی بات کہی حالانکہ وہ جانتا تھا اس وقت سردار کو سلمان پر غصہ ہے اور وہ اس بات پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔

''اگر ایسا تھا تو وہ ہم سے کہہ سکتا تھا۔ اس نے ہمارے سینکڑوں، ہزاروں جنگجوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو کیا یہ دشمنی نہیں تھی؟'' سردار گرجا۔

''آپ کو اس وقت میری بات سمجھ نہیں آئے گی لیکن میں اور میرا علم کہتا ہے اس وقت آپ سلمان کو بھول جائیں اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی ان دشمن طاقتوں کے بارے میں سوچیں جو آپ کی ذرا سی بھی غفلت سے قبیلے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سلمان کے بارے میں ہم بعد میں فیصلہ کریں گے کہ وہ غلط تھا یا صحیح'' کاہن کی بات سردار کو پسند تو نہیں آئی مگر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے دل میں سلمان کے لیے جو نفرت جمع ہو چکی تھی اسے نکالنا اب کسی کاہن کے بس کی بات نہیں تھی وہ اسی وقت شانت ہو سکتا تھا جب سلمان کو اس کی جرأت کی سزا دینے میں کامیاب ہو جائے۔ اس لیے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس وقت وہ وہاں سے چلا گیا تاکہ قبیلے اور فوج کو جو نقصان پہنچ چکا تھا اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے۔

راستے میں وہ یہ بھی سوچتا رہا اگر کاہن کو سلمان کے ارادوں کا پتا تھا کہ وہ جنگ کرنا نہیں چاہتا بس اپنے باپ کو آزاد کرانا چاہتا ہے تو اس نے ہمیں اس بات سے باخبر کیوں نہیں کیا۔ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے وہ اپنے غار میں پہنچا اور اس نے جنگجوؤں کے سپہ سالار کو طلب کیا۔

☆☆☆

وقت کی اس انوکھی روش کو سمجھنے کی صلاحیت تو کسی میں نہیں تھی لیکن فارس کو یہ ضرور پتا چل چکا تھا کہ شرجیل اپنی جان کے خوف سے دم دبا کر یہاں سے بھاگ چکا ہے اور اب اس کے لیے صنوبر تک پہنچنا' اسے حاصل کرنا پہلے سے زیادہ آسان بن چکا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو اس نے بیٹے کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ کوئی انوکھی اور ناقابل یقین چیز مانگ رہا ہو۔

''تمہیں کیا لگتا ہے وہ لڑکی جو شرجیل سے محبت کرتی ہے تمہارا پرپوزل ایکسپٹ کر لے گی؟'' اتنے براہ راست سوال کی توقع فارس کو نہیں تھی اس لیے ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ آپ کوشش کریں تو یہ ہو بھی سکتا ہے'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔

''چلو ٹھیک ہے میں آصف کریم سے ذاتی طور پر مل کر دیکھتا ہوں۔ لیکن یہ یاد رکھنا بیٹے آصف کریم ہمارے کسی احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اور نہ ہی اسے ہمارے اثر رسوخ سے دبایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک آزاد اور اپنی مرضی کا مالک بزنس مین ہے۔ وہ ہماری بات سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

البتہ سرفراز کا بیٹا یہاں موجود ہوتا تو ہم اس پر اپنا اثر رسوخ ڈال کر اسے تمہارے راستے سے ہٹا سکتے تھے لیکن وہ تو خود ہی کہیں چلا گیا ہے۔'' بولتے بولتے اچانک رحمن کو کوئی خیال آیا اور وہ بولا۔ ''تم کیا جانتے ہو سرفراز کا بیٹا اس طرح کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کہاں اور کیوں چلا گیا؟'' سوال پھر غیر متوقع تھا اس لیے ایک بار پھر فارس گھبرا گیا۔

''میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ اس پر کسی نے جان لیوا حملہ کیا تھا ہو سکتا ہے۔ ان ہی لوگوں نے اسے پھر دھمکی دی ہو اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کہیں چھپ گیا ہو۔''

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے لیکن ایک بات سمجھ لو۔ میں بعد میں یہ نہ سنوں کہ اس پر حملہ تم نے کرایا تھا۔ جو سچ ہے وہ مجھے ابھی بتا دو نہیں تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔'' باپ نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو فارس اس بار پہلے سے بھی زیادہ بری طرح گھبرا گیا۔

''نہیں.....تو میں کیوں.....اس پر حملہ کراؤں گا.....آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں'' فارس کی گھبراہٹ نے رحمٰن کو اور شک میں ڈال دیا

''اگر یہ تم نے نہیں کیا تو پھر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

''نہیں نہیں میں گھبرا تو نہیں رہا ڈیڈ یہ تو بس روٹین ہے میرا۔ آپ سے ڈر لگتا ہے اس لیے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے'' فارس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ خدا کرے تم سچ بول رہے ہو'' بے خیالی میں رحمٰن کے منہ سے نکل گیا اور فارس کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اس نے شاید اپنے باپ سے جھوٹ بول کر اچھا نہیں کیا۔ مگر اب تو وہ بول چکا تھا۔ اور اب اس کو اپنے جھوٹ کو نبھانا تھا۔

باپ بیٹے کی یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ فارس باپ کے کمرے سے نکل کر ٹیرس کی طرف بڑھنے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ کس سے اصل بات کا پتا کروں کیا سچ ہے۔ کہیں صابو نے تو کوئی دھمکی نہیں دی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صابو نے زیادہ پیسے کے لالچ میں اسے غائب کرا دیا ہو۔

اس طرح کی باتیں سوچتا ہوا وہ ٹیرس کی طرف جاتے جاتے بالکونی میں آ گیا۔ اس کے پاس سے صابو کا نمبر کہیں مس ہو گیا تھا اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ شاہجہاں کو ہی صابو کے بارے میں معلوم تھا اور شاہجہاں صابو سے سخت ناراض ہو چکا تھا۔ تو اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کافی دیر تک وہ ٹہل ٹہل کر سوچتا رہا اور پھر گاڑی نکال کر بنا کسی ارادے کے سلمان کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے کے باہر پہنچ کر اس نے سلمان کو فون کیا یہ اس کی قسمت ہی تھی کہ اس کا فون سلمان نے ریسیو کر لیا۔

''ہاں کہو کیا بات ہے؟'' سلمان نے جیسے اکتاہٹ سے کہا۔

''تمہارے گھر کے باہر ہوں۔ کیا تم سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' فارس کے لہجے میں اپنائیت اور تہذیب رچاؤ گرچہ مصنوعی تھا لیکن اس وقت وہ کام کر گیا اور کچھ ہی دیر بعد سلمان سفید ٹی شرٹ اور بلیو ٹراؤزر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اتنا اچانک کیسے؟'' سلمان نے اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بس یونہی تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔ سوچا تمہیں کال کروں گا تو کہیں تم منع نہ کر دو۔'' فارس کے لہجے کی عاجزی پر سلمان حیران ہونے لگا۔

''یہ شیرہ کیوں بہہ رہا ہے تمہارے لہجے میں جو بات تم پوچھنے آئے ہو وہ میں تمہیں ویسے بھی بتا نہیں سکوں گا، یا یوں کہہ لو کہ پہلے ہی بتا چکا ہوں'' سلمان نے رکھائی سے کہا۔

''لگتا ہے تم اب تک ناراض ہو۔ چلو کلب چلتے ہیں وہاں چل کر بیٹھیں گے'' فارس نے یہ کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور وہ دونوں دس منٹ کے بعد اپنے پوش علاقے کے کلب میں داخل ہو رہے تھے۔

''تم کون سی بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے؟'' فارس نے کرسی کو سیدھا کر کے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہی کہ صنوبر والی بات۔ وہ تم سے کبھی شادی کرنے کے لیے نہیں مانے گی یہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں'' سلمان کے لہجے میں خشکی اور روکھا پن اب بھی برقرار تھا۔

''ارے یار تم تو بہت ہی معصوم ہو اب تک اسی بات کو لے کر ناراض ہو۔ وہ تو میں کب کی بھول چکا ہوں اور تم شاید بھول چکے ہو میں تم سے کئی بار اس بات کے لیے معافی بھی مانگ چکا ہوں۔'' فارس نے پھر سے شیریں اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا لو گے؟''

''کچھ خاص نہیں کوئی بھی جوس آرڈر کردو یوں بھی میرا کچھ بھی دل نہیں چاہ رہا۔ تم اس طرح گھر کے باہر آ کے کھڑے نہ ہو جاتے تو میں بھی تمہارے ساتھ اس وقت گھر سے باہر نہ آتا'' سلمان نے ایسے کہا جیسے وہ بہت زیادہ بیزار ہو۔

''تمہاری اس مہربانی کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ رکا اور پھر بولا ''لیکن بات کیا ہے تم اتنے بیزار تو کبھی نہیں ہوتے ہمیشہ بہت چل کرتے ہو۔ زندگی کو انجوائے کرنا تو میں نے خود تم سے ہی سیکھا ہے'' فارس کی اس بات کو سن کر سلمان کو یقین نہیں آیا کہ یہ شخص اس قدر گر کے بھی بات کرسکتا ہے جو ہمیشہ گھمنڈ اور تکبر کے نشے میں خود کو جانے کیا سمجھتا رہا ہے۔ سلمان کو یاد تھا کہ اس کے گروپ میں شامل ہونے کی اسے کتنی چاہ تھی اسی لیے اس نے اپنے گھر اس رات وہ تقریب رکھی تھی جس کا غبار اب تک بھی اس کی زندگی میں اڑ رہا تھا۔

''اصل میں گھر میں شرجیل کے یوں اچانک غائب ہونے سے کافی عجیب سی فضاء بنی ہوئی ہے، سب ہی پریشان ہیں۔ صنوبر تو جیسے جینا ہی بھول گئی ہے۔ مجھے اس کا شرجیل کے لیے اس طرح بے سدھ ہونا ذرا بھی پسند نہیں ہے مگر ماما کو اس کے دکھ کا ضرورت سے زیادہ ہی احساس ہے وہ ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگی رہتی ہیں۔''

سلمان کی بات سن کر فارس کے کان کھڑے ہو گئے وہ اسی بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ صنوبر کی کیا حالت ہے اور وہ شرجیل کے یوں اچانک چلے جانے کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔

''کیا لگتا ہے تمہیں شرجیل یوں اچانک کہاں گیا ہوگا۔ اس کے فادر نے اسے سب ہی امکانی جگہوں پر تلاش کرلیا ہے مگر اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ پتا نہیں وہ اس طرح کہاں غائب ہو گیا۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اسی وقت دو لڑکے جو ٹینس کھیلنے آئے ہوئے تھے ان کے قریب رکے اور پوچھنے لگے۔

''سلمان کیا رہا شرجیل کا کچھ پتا چلا'' دونوں نے باری باری ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں ابھی تک تو نہیں۔ لیکن تم لوگ یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' سلمان نے جواب تو دے دیا مگر ساتھ ہی ایک سوال بھی کر دیا۔ اسے شاید ان کا شرجیل کے بارے میں پوچھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''برا مت مانو یار۔ آج کل جہاں بھی جاؤ اس کے یوں اچانک غائب ہونے کی باتیں ہو رہی ہیں تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔'' ان میں سے بلیک ٹراؤزر پہنے ہوئے لڑکے نے کہا جس کا نام عباد تھا۔ اس کے بعد وہ رکے نہیں، تھے سلمان کا موڈ مزید خراب ہو چکا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' ان کے جانے کے بعد فارس نے کہا۔ سلمان نے گھورتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''پوچھو؟''

''میرے پیرنٹس شاید آج کل میں تمہارے گھر آنے والے ہیں۔ باقاعدہ رشتا مانگنے۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔ دیکھو یار رشتا ملے نہ ملے مگر میں تمہیں کبھی کھونا نہیں چاہتا۔ ہمیں تو ہمیشہ دوست رہنا چاہیے۔ کیوں کیا کہتے ہو؟'' سلمان اس کی بات سن کر ایک دم ہی ہنس پڑا جو فارس کے لئے توقع کے قطعی خلاف تھا۔

''تم ویسے ہی ہو کافی ڈھیٹ! جانتے ہو کہ ہمارے ہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔ پھر بھی تم شرجیل کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے دوست۔ یہ تو ایک بہت رسمی اور باقاعدہ ہونے والا معاملہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ تمہارے والدین اور صنوبر کو دونوں کو انکار اور اقرار کا پورا حق حاصل ہے۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے'' فارس بہت نارمل ہوتے ہوئے بولا۔ ''پہلے تو اتنے نارمل نہیں تھے۔ بلکہ دھونس دھمکی

سے کام لے رہے تھے اب کیا ہوا؟'' سلمان کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

''ایک بات اچھی طرح سمجھ لو جتنا میں صنوبر کو جانتا ہوں۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس وقت بھی نہیں جب میرے پیرنٹس راضی ہو جائیں۔'' سلمان نے سفاکی سے اپنی رائے دی۔'' ویسے بھی مجھے تو شک ہے کہ شرجیل کے غائب ہونے میں تمہارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

یاد رکھنا اگر اس بات میں ذرا سی بھی صداقت ہوئی تو صنوبر تمہیں کبھی معاف نہیں کرنے والی۔'' سلمان نے ایسے کہا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

''میں قسم کھاتا ہوں۔ بخدا اس معاملے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ تم کہو تو میں قران اٹھا سکتا ہوں۔ میں نے شرجیل کو غائب نہیں کیا۔ بلکہ میں تو جانتا بھی نہیں ہوں کہ یہ سب کیوں اور کب ہوا۔''

دونوں اسی طرح کی باتیں کچھ دیر تک کرتے رہے پھر جیسے فارس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ صنوبر اب بھی شرجیل کا غم منا رہی ہے اور اس کے ماں باپ کو اس کے گھر سے سوائے انکار کے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات اس نے اپنے باپ کو بھی بتا دی کہ وہ اس طرح سے بات کریں جیسے وہ یہ بات کرنے نہیں بلکہ یوں آپسی تعلقات کو بڑھاوا دینے کی خاطر آئے ہیں۔ رحمن نے ایسا ہی کیا۔ اور گفتگو کے آخری سرے پر پہنچ کر صنوبر کے رشتے کی بات کی۔

جس کا جواب آصف نے یہ کہہ کر دیا کہ ہم اپنی بیٹی پر کسی بھی قسم کی زور زبردستی نہیں کرنا چاہتے اور ہم جانتے ہیں وہ کیا چاہتی ہے اس لیے یہ بات آپ نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔''

''میں مانتا ہوں۔ بلکہ تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ پھر بھی آصف اگر آپ میرے اطمینان کی خاطر ایک بار میری موجودگی میں صنوبر بیٹی سے پوچھ لیں گے تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ میں آپ کے گھر سے کبھی یہ خوشی حاصل کرنے کے بارے میں سوچوں تک نہیں''

آصف نے فارس کے باپ کی یہ بات سننے کے بعد درشہوار کی طرف ایسے دیکھا کہ کیا کہتی ہو؟ درشہوار نے کہا۔

''ویسے تو مجھے اپنی بیٹی کا جواب معلوم ہے پھر بھی آپ کے اطمینان کے لیے میں ایک بار اور اس سے پوچھ لیتی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اسے مزید تکلیف پہنچانے کا باعث بن رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر درشہوار چلی گئی اور کچھ دیر کے جان گسل انتظار کے بعد جب وہ واپس آئی تو آصف نے اس کے بات کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''مجھے معلوم ہے کیا کہا ہو گا میری بیٹی نے''

''نہیں..... آصف ہم ٹھیک نہیں سوچ رہے..... صنوبر اس رشتے پر راضی ہے!!!''

ایک دھماکہ تھا جو اس وقت اس کمرے میں اس طرح ہوا کہ سماعتوں کا توازن درہم برہم ہو گیا۔ کسی کو بھی درشہوار کی بات کا یقین نہیں آیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے درشہوار نے جو مذاق کیا ہے وہ اس پر کچھ دیر بعد سنجیدگی سے کہے گی کہ یہ تو بس ایک جوک تھا ورنہ ہم سب جانتے ہیں صنوبر کیا چاہتی ہے۔ اس کا جواب کیا ہو گا۔

مگر کئی بار پوچھنے پر بھی درشہوار نے اپنا بیان نہیں بدلا اور وہ اس بات پر قائم رہی کہ ان کی بیٹی صنوبر، رحمن کے بیٹے فارس سے شادی کرنے پر تیار ہے..... حیرت کا پورا سمندر تھا جس میں ہلچل مچی اور سب کے چہروں پر ناقابل یقین تاثر نے ڈیرا سا جما لیا۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ اکتوبر میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرد ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

بچو!

اللہ تم سب کو صحت کے ساتھ ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ جب یہ سطور آپ پڑھ رہے ہوں گے تو ماہ ذوالحج شروع ہو چکا ہوگا۔ یہ اسلامی مہینہ ہمیں قربانی کا درس دیتا ہے۔ جب زندگی کے ہر معاملے میں قربانی کا شعار اپنایا جاتا ہے تو زندگی بھی سہل ہو جاتی ہے اور آخرت کے لیے توشہ تیار ہو جاتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو نصیحت کروں گا کہ خود نمائی سے بچنے کی کوشش کریں اور نیکی صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کریں۔ دنیاوی معاملات دنیا میں ہی رہ جائیں گے۔ عبادت بھی اس وقت قبول ہوتی ہے جب نیت خالص ہو ورنہ زمین پر سر مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا...... ہر خوشی کے موقع پر اُن لوگوں کو ضرور یاد رکھیں، خوشیاں جن کی دسترس سے باہر ہیں۔ چلتے پھر'یا قہار' کا ورد ضرور کریں۔ سورۃ رحمٰن کی تلاوت کو اپنی عادت بنالیں۔ سادہ پہنیں، سادہ کھائیں۔ کیونکہ اس بدن کو بالآخر کیڑے مکوڑوں کی خوراک ہی بننا ہے۔

☐ افضالہ۔ منڈی وار برٹن

○ پیارے بابا جی! میں آپ کو پہلے بھی دو بار خط لکھ چکی ہوں۔ آپ نے مجھے جو وظیفہ بتایا تھا اس سے کچھ حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے اور بھی کچھ مسئلے ہیں پلیز بابا جی' ان کے لیے ہماری مدد کیجیے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے بابا جی! ہمارے سر پہ قرضہ بہت زیادہ ہے۔ جو ایک بار کسی سے پیسے لیں تو دوبارہ ادا نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔ دوسرا مسئلہ بہت شدید ہے بابا جی! جب بھی دسمبر کا ماہ آتا ہے ہم پہ بہت بھاری گزرتا ہے ہمارے پورے گھر پہ۔ ہمارا اپنا کوئی خاص یا تو وفات پا جاتا ہے یا بہت دور چلا جاتا ہے۔ ایسا اس ماہ میں ہمارے ساتھ ہر سال ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ۔ ہمیں کرائے کا مکان میں رہتے ہوئے 10 سال ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس اپنا گھر نہیں ہے۔ اور نا ہی ہم دو بہنوں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ پلیز بابا جی! ہمیں کوئی اچھا سا اور جلالی وظیفہ بتا دیں۔ جس سے ہمارے یہ سارے مسئلے حل ہو جائیں۔ پلیز بابا جی! ہمارے یہ سارے مسئلے حل کر دیں۔ ہم آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔ بابا جی! ہم پانچ وقت نماز بھی پڑھتے ہیں۔ فجر کے بعد یٰسین کی سورۃ بھی پڑھتے ہیں۔ اور عشاء کے بعد سورۃ واقعہ بھی پڑھتے ہیں۔ ہم نے یہ ایک ماہ پورا وظیفہ بھی کیا ہے اور اب بھی پڑھتے ہیں۔ پلیز بابا جی! ہماری مدد کرنا۔ بابا جی! ہماری چھوٹی بہن جس کی عمر 17 سال ہے۔ اُسے مرگی کی بیماری ہے۔ جس کا ہم نے بہت علاج کروایا ہے۔ کہیں سے بھی آرام نہیں آیا۔ وہ ایک گولی کھاتی ہے۔ اگر کھاتی رہے تو ٹھیک رہتی ہے اگر نہ کھائے تو بیمار ہو جاتی ہے۔ اور رات کو سوتے ہوئے اُس کی

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121 - 021

حالت خراب ہوتی ہے۔ باباجی! ہمیں اس کے لیے دوا چاہیے۔

☆: بیٹی افضالہ! مسئلے اللہ کے کرم سے حل ہوتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا' انسان تو وسیلہ ہے۔ تم کچھ عرصے کے لیے سورۃ یٰسین پڑھنا ترک کردو اور صرف درود شریف پڑھو۔ بعد فجر تین تسبیح اور بعد عصر تین تسبیح۔ انشاء اللہ ایک ایک کر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ مرگی کی دوا میں تیار نہیں کرتا۔ اس کے لیے تمہیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا ہوگا۔

□ ریحانہ درانی۔ میانوالی

○ باباجی میں بہت پریشان ہوں۔ میری ایک جاننے والی خاتون نے آپ کے بارے میں بتایا اور میں اس امید پر خط لکھ رہی ہوں کہ آپ اللہ کے نیک بندے میری پریشانی کا کچھ حل ضرور نکالیں گے۔ باباجی میں شادی شدہ عورت ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ شوہر اچھا کماتے ہیں بظاہر کوئی پریشانی نہیں بس ذرا غصے کے تیز ہیں اور غصے میں بہت گالم گلوچ کرتے ہیں۔ چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔ مجھے اُن کی یہ عادت بہت بری لگتی ہے بہت بار سمجھانے کی کوشش کی کبھی نرمی سے کبھی ناراض ہو کر مگر اُن کو سمجھ نہیں آتی۔ اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے مجھے اپنے شوہر سے بہت نفرت سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اُن کا گھر میں موجود رہنا یا مجھ سے بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتی ہوں کہ رشتے میں بھی رہوں اور وہ نظر بھی نہ آئیں۔ باباجی شاید آپ کو میرا مسئلہ اتنا سنگین نہ لگے مگر یقین کیجیے میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ رہتی ہوں جس سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے اور اس لیے میں بہت چڑچڑی اور بدتمیز ہوگئی ہوں۔ بہت بدزبانی کرتی ہوں جس کا اثر بچوں پر پڑ رہا ہے۔ اللہ کے واسطے مجھے اس مشکل سے نکال دیجیے۔ مجھے تعویذ دیجیے گا بچے چھوٹے ہیں وظیفہ کرنا ممکن نہیں۔

☆ بیٹی ریحانہ! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم نے بہت سنبھل کر خط لکھا ہے اور مار پیٹ کا تذکرہ قصداً نہیں کیا۔ تمہاری کیفیت میں بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ کسی انسان کو بھی بے عزت کرنے والے رویے اچھے نہیں لگتے، میں یہ بات اس بڑھاپے میں بھی سمجھ نہیں پایا کہ لوگ بیویوں کو محبت اور حسن سلوک کے ساتھ کیوں نہیں سمجھاتے۔ ہاتھ اٹھانے یا برے الفاظ استعمال کرنے سے کیا سکون ملتا ہے۔ بیٹی اصل میں تمہارے شوہر نے اپنے گھر میں یہی سب دیکھا ہے۔ یہ وہ بچپن کا غصہ اور بے بسی ہے جواب نکل رہی ہے۔ اپنے باپ کو ماں سے ساتھ ایسا رویہ رکھتے دیکھا ہوگا۔ مگر میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ تم زبان درازی مت کیا کرو۔ کیونکہ نہ چاہتے ہوئے تم بھی اُن جیسی بن جاؤ گی اور پھر بچے بھی برا رویہ ہی اختیار کریں گے۔ لہٰذا برائی کو روکنا چاہتی ہو تو اپنی زبان کو روک لو۔ شوہر جب غصے میں ہوں تو سامنے مت آیا کرو۔ بکثرت لاحول ولا قوۃ پڑھا کرو۔ میں تعویذ ضرور تیار کردوں گا اُس کے لیے تم جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھو۔ بیٹی صبر کرو ساری توجہ بچوں کی تربیت پر مرکوز رکھو۔ انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔

□ شازیہ زمان۔ لاہور

○ باباجی میں آپ سے اکثر اپنے گھر کے مسائل شیئر کرتی ہوں اور آپ کی وجہ سے بہت سے مسئلے حل بھی ہو گئے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اس مسئلے کا بھی حل بتائیں۔ یہ بات میں کسی اور کو نہیں بتا سکتی۔ آپ ناراض مت ہوئیے گا۔ باباجی مجھے اپنے کزن سے بہت محبت ہے۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہم لوگ چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ میں نے یہ بات آپ کو پہلے بھی بتائی تھی مگر پوری طرح نہیں بتائی تھی۔ میرے گھر والے اور اس کے گھر والے ہمیں کبھی بھی ایک نہیں ہونے دیں گے۔ وجہ کوئی دشمنی نہیں بلکہ میری سگی بڑی بہن ہے۔ میرا یہ کزن میرا بہنوئی بھی ہے ڈیڑھ سال پہلے میری بہن سے

نکاح ہوا تھا تب وہ مجھے اتنا پسند نہیں تھا مگر جب گھر میں آنا جانا شروع ہوا تب وہ مجھے بہت اچھا لگنے لگا۔ اس عید کے بعد میری بہن کی رخصتی ہے یہ سوچ سوچ کر میرا برا حال ہے۔ بابا جی کچھ ایسا کردیں کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور میری شادی اُس سے الگ ہوجائے۔ آپ کچھ بھی کریں جتنا خرچا ہوگا میں کروں گی مگر میرا کام کردیں میں وظیفہ نہیں کرسکتی۔

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ اگر تمہاری بہن کو وہ شخص طلاق دے دے تو کیا تمہارے والدین اسی گھر میں دوسری بیٹی دیں گے؟ بالکل نہیں! ساری رشتہ داری بھی ختم ہوجائے گی۔ تمہارے پاس بہت پیسے ہیں تو بیٹی اللہ کے نام پر صدقہ خیرات کردیا کرو تاکہ یہ جو شیطان تم پر حاوی ہے اس سے چھٹکارا مل سکے۔ ایک بات اور بتادوں وہ شخص صرف تمہیں بے وقوف بنارہا ہے۔ وہ جلد ہی تمہاری بہن کو رخصت کروالے گا اور اس کے بعد بھی تمہیں اسی طرح بے وقوف بنائے گا۔ تمہاری نجات صرف اسی میں ہے کہ اللہ سے توبہ کرو اور عہد کرلو کہ آئندہ اس شخص سے تنہائی میں نہیں ملوگی میں تمہیں تعویذ ضرور دوں گا مگر جب تم یہ وعدہ کروگی۔ کہ غلط راستے پر اب نہیں چلوگی۔ بیٹی یاد رکھو دھوکا دینے والا شخص کسی اور کو نہیں دراصل اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے اور یہ بات وقت ثابت کردیتا ہے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

□ سلمیٰ احمد۔ یو کے

○ بابا صاحب! اللہ آپ کو صحت اور تندرستی کے ساتھ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ تین ماہ قبل آپ سے بیٹی کی شادی کے لیے تعویذ منگوایا تھا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ بچی کی بات طے ہوگئی جہاں ہم لوگ چاہ رہے تھے۔ عید کے بعد اس کی شادی ہے۔ لڑکا بیلجیئم میں رہتا ہے اور بہت اچھا گھرانہ ہے۔ بابا صاحب میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق صدقہ نکال دیا تھا آپ سے گزارش ہے کہ میری بہن سچی کہانیاں کے دفتر آکر آپ کے لیے لفافہ دیں گی قبول کیجیے گا اور بابا صاحب وہ ایک ماہ پاکستان میں ہی ہیں۔ اُن کے ہمراہ میری چھوٹی بیٹی اور بیٹے کے لیے بھی تعویذ ارسال کردیجیے گا۔ یہ میں آپ کو بھجوادوں گی۔ بیٹے کی جاب کا مسئلہ ہے اور بیٹی کی شادی اچھے گھر میں ہو اس کے لیے تعویذ درکار ہے۔ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیج دیں شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی سلمیٰ! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کرم فرمایا بس اس کی راہ میں حسب استطاعت رقم نکالتی رہا کرو۔ تعویذ میں تیار کردوں گا بڑی بچی کا تعویذ اب تلف کردو اس کے لیے بھی دوسرا تیار کردوں گا۔ بیٹی میں بوڑھا آدمی کہاں بینکوں کے چکر لگاؤں گا اسی لیے اکاؤنٹ ہی نہیں تم ویسٹرن یونین کے ذریعے نیکیوں کا حصہ ڈال سکتی ہو۔ خوش رہو۔

□ بانو۔ کراچی

○ بابا جی! میں ایک بیوہ عورت ہوں شادی کے صرف چار سال بعد بیوہ ہوگئی۔ میرے دو بچے ہیں۔ شوہر کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے سسرال والے چاہتے ہیں کہ میں اپنے دیور سے شادی کرلوں وہ لوگ بچوں سے دور ہونا نہیں چاہتے۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ اپنے والدین پر بوجھ بنوں۔ مگر بابا جی میں اپنے دیور سے شادی نہیں کرنا چاہتی وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی ہے پھر اس کے ساتھ کیوں زیادتی ہو کہ وہ ایک بیوہ اور دو بچوں کی ذمہ داری اٹھائے۔ میں ایسے ہی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنے ساس سسر کی خدمت کرکے، بچوں کی پرورش کرکے میں کسی جذباتی فیصلے کی وجہ سے پچھتانا نہیں چاہتی اور بابا جی سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی جگہ کسی اور کو دے بھی نہیں سکتی۔ لہٰذا دھوکے والی زندگی میرے لیے گزارنا بہت مشکل ہے۔ مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟

☆ بیٹی بانو! اللہ تمہیں صبر اور ہمت عطا فرمائے۔ بیٹی تمہارے سسرال والوں کی سوچ بھی بالکل درست ہے۔ جوان بیوہ بہو کو گھر میں رکھنے

سے مشکلات پیدا ہوتے ہیں۔ نکاح کروانے سے تمہارا اس گھر میں رہنے کا شرعی جواز بن جائے گا۔ وگرنہ تمہارے سسر بھی تمہارے لیے نامحرم ہیں۔ تمہاری سوچ بھی اپنی جگہ درست ہے مگر بیٹی معاشرتی اقدار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے دیور کی اگر کہیں اور شادی کردی جائے تو وہ لڑکی تمہیں اور بچوں کو برداشت نہ کرے پھر کیا ہوگا؟ تم سمجھدار لڑکی ہو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ ساس سسر کی بات مان لو اور معاملات اللہ کے سپرد کردو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور حسب قدر ممکن ہو پڑھا کرو 'سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم' مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔

□ ریاض خان۔ پشاور

○ باباجی میرے دوست نے آپ سے رابطہ کرنے کو کہا میں کراچی بھی آیا لیکن پتہ چلا آپ ملتے نہیں ہیں اسی لیے یہ خط سچی کہانیاں کے دفتر میں دے کر جارہا ہوں۔ میرا مسئلہ نوکری کا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل میں اور میرا بڑا بھائی سعودیہ میں تھے۔ بڑا بھائی عرصہ 12 سال سے اور میں 8 سال سے وہاں نوکری کررہے تھے۔ اچانک ہماری نوکریاں بھی ختم ہوگئیں اور تنخواہ بھی پھنس گئی۔ میں تو پاکستان آگیا کیونکہ شادی تھی مگر بھائی ابھی اُدھر ہی ہے۔ نہ کام ہے نہ تنخواہ دیتے ہیں نہ واپسی کا کوئی سبب بن رہا ہے۔ بہت پریشانی ہے۔ بھائی کے بیوی بچے گاؤں میں ہیں۔ میں کراچی میں کام کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ بوڑھے والدین، چھوٹے بہن بھائی اور میری بیوی سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ سوچ سوچ کر سر پھٹتا رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں اپنے ساتھ کچھ غلط نہ کرلوں۔ میری مدد کریں کچھ ایسا پڑھنے کو دیں کہ یہ مسائل ہوجائیں۔

☆ بیٹے ریاض! یقیناً حالات بہت مشکل میں مگر ناممکن نہیں۔ مشکل وقت سدا نہیں رہتا جیسے اچھا وقت بھی ہمیشہ نہیں رہتا زندگی نام ہی نشیب وفراز کا ہے۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھو۔ مایوس بالکل مت ہو۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ رزق کا وعدہ اس کا ہے لہٰذا پریشان مت ہو۔ کوشش ضرور کرتے رہو مگر یقین کے ساتھ اور بیٹے یہ بات بہت بری ہے۔ اللہ نے تمہیں پیدا کیا جوان کیا مکمل اعضاء عطا کیے صحیح دماغ دیا ہے اگر زندگی کے چند سال تکلیف دہ ہوگئے۔ تو تم اللہ کے ساتھ خیانت کرنے کا سوچ رہے ہو۔ یہ بہت بری بات ہے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اُس کی قدر کرو حفاظت کرو خوشی میں شکر ادا کرو دکھ میں صبر کرو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو۔ بکثرت درود شریف پڑھو راستے خود بخود کھلتے چلے جائیں گے انشاءاللہ۔

□ علیشہ۔ سیالکوٹ

○ بیٹی علیشہ! تمہارا مسئلہ یقیناً بہت تکلیف دہ ہے مگر اس کا حل بہت آسان ہے۔ تمہیں یہ وہم رہتا ہے کہ تمہاری تصویریں بے لباس آتیں ہیں اس لیے تم تقریبات میں جاتے ہوئے گھبراتی ہو تو بیٹی تم شرعی پردہ شروع کردو۔ مکمل حجاب لیا کرو پھر کسی بھی تقریب میں کوئی بھی تصویر کھینچے گا تو تمہیں پریشانی نہیں ہوگی۔ شروع میں لوگ اعتراض کریں گے کیونکہ لوگ اچھائی سے گھبراتے ہی۔ مگر تم مستقل مزاجی سے پردہ جاری رکھنا جب گھر سے کہیں جانے کے لیے نکلو 7 بار پڑھ لیا کرو 'نصر من اللہ وفتح قریب' تم خود اپنے میں مثبت تبدیلی محسوس کروگی۔ مجھے صورت حال سے ضرور آگاہ کرنا۔

□ سعادت علی۔ وزیرآباد

○ باباجی میں یہ خط اپنی والدہ کے کہنے پر لکھ رہا ہوں۔ 2013ء میں میری شادی والدین کی رضا مندی سے سگی خالہ کے گھر ہوئی۔ میں پڑھا لکھا اچھی نوکری پر فائز ہوں۔ اور میری بیوی واجبی سی تعلیم حاصل کرکے گھرداری میں مشغول ہوگئی۔ باباجی میں پڑھائی اور پھر نوکری کی وجہ سے اپنے رشتے داروں سے ذرا دور ہی رہا۔ میری والدہ کو لڑکی پسند تھی میں نے شادی کے لیے حامی بھرلی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میری بیوی میری ماں اور اپنی سگی خالہ کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرتی۔ میں اپنی والدہ سے بے انتہا

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب......وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے......آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم......ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

محبت کرتا ہوں۔ طبیعتاً صلح پسند ہوں لیکن اُس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی والدہ کے لیے الٹی سیدھی باتیں برداشت کرتا رہوں۔ پچھلے سال میں نے بیوی کو اس کے گھر بھجوادیا کیونکہ وہ میری بات سمجھنے کو تیار نہیں باباجی میں اس لڑاکا عورت کے ساتھ گزارا نہیں کرسکتا ابھی تو اولاد بھی نہیں ہے بعد میں شاید فیصلہ کرنا مشکل ہوجائے۔ دراصل اب وہ عورت میرے دل سے مکمل طور پر اتر گئی ہے۔ میں سمجھوتہ کو کرسکتا ہوں مگر خوشی سے اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ والدہ تو یہ بات بار بار بتاچکا ہوں اب وہ کہتی ہیں کہ باباجی سے مشورہ لے لو باباجی وہ ایک جاہل اور مغرور عورت ہے میرا گزارہ ناممکن ہے۔ آپ سے بالکل سچ بات کررہا ہوں بتائیں کیا فیصلہ کروں؟

○ بیٹے سعادت! تمہارا تفصیلی خط پڑھا حالات کا اندازہ ہوا۔ موجودہ صورت حال میں یہی مشورہ دوں گا کہ بڑوں کو بٹھا کر فیصلہ کرلو کیونکہ جو عورت گھر بسانا چاہتی ہے وہ معمولی باتوں پر بڑائی جھگڑے نہیں کرتی پھر ماں سے حسد رکھنا تو بہت ہی افسوس ناک فعل ہے۔ تم سمجھدار ہو اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کررہے ہو گے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ بچی کا سامان اور زیور اس کے گھر بھجوادو۔

□ سمیرا ارشد۔ چوکی

○ باباجان 4 سال قبل آپ سے شادی کے لیے تعویذ لیا تھا جہاں چاہتی تھی وہاں شادی ہوگئی۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو مطلع نہیں کرسکی۔ اللہ کا احسان ہے بہت خوش ہوں باباجان یہ خط میں اپنی نند کے لیے لکھ رہی ہوں وہ بیوہ ہیں اور دو بیٹے ہیں۔ عمر بہت کم ہے۔ ہم سب گھر والے چاہتے ہیں کہ ان کی دوبارہ شادی ہوجائے۔ میرے ساس سسر چاہتے ہیں کہ اچھے اور شریف لوگ ملیں کیونکہ وہ پہلے ہی بہت بڑے دکھ سے گزری ہیں اور باباجان یہ خط میں اپنی ساس کی اجازت سے لکھ رہی ہوں۔ اللہ آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔

☆: بیٹی سمیرا! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ مجھے اچھا لگا کہ تمہیں اپنے سسرال کے مسائل میں دلچسپی ہے۔ یہ اچھی بچیوں کی نشانی ہوتی ہے۔ تم اپنی نند کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو طریقہ تم جانتی ہو۔ رشتہ آنے پر پہلے مجھے مطلع کرنا میں استخارہ کروں گا ایک بات کا اور خیال رکھنا کہ تعویذ کے بارے میں کسی کو پتا مت چلنے دینا۔ جو کام بھی رازداری اور احتیاط سے ہوتا ہے وہ پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ تعویذ کے ہمراہ ورد بھی دوں گا جو بچی بھی کرے گی اور والدہ بھی انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔

□ آمنہ سلیم۔ جہانیاں

○ باباجی میں بہت پریشان عورت ہوں میرے چار بچے ہیں۔ جو ذہنی طور پر مفلوج ہیں۔ بڑے دونوں ذرا بہتر ہیں مگر چھوٹی بیٹیاں بالکل معذور ہیں۔ ان کے سارے کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔ شوہر ان بچوں کی حالت کا الزام مجھے دے کر گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ وہ پنڈی میں رہتے ہیں اور شادی بھی کرلی ہے۔ باباجی میرے لیے اس وقت سب سے اہم چیز بچوں کی کفالت ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نارمل بچوں کو پالنا ہی کتنا مشکل ہے پھر یہ تو ذہنی اور جسمانی معذور بھی ہیں۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ اپنے شوہر کی ضرورت تھی جب انہوں نے ہی اپنی اولاد کو چھوڑ دیا تو کسی اور سے کیا گلہ کروں۔ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات سے کیسے نمٹوں۔

○: بیٹی آمنہ! اللہ تمہیں ہمت اور طاقت دے یقیناً بہت مشکل وقت ہے تمہارے شوہر کے بارے میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ وہ اس وقت سے ڈرے جب اُس کے اللہ کو جواب دینا ہوگا۔ بیٹی تم معلوم کرو تمہارے علاقے میں ذہنی معذور بچوں کا ادارہ ضرور ہوگا۔ وہاں کی انتظامیہ سے ملو اور بچوں کو داخلہ دلوانے کی کوشش کرو۔ اس طرح اُن کی نگہداشت بھی بہتر انداز میں ہوگی اور تم بھی مطمئن رہو گی۔ مناسب ہوگا کہ ایسے کسی ادارے میں تم خود بھی نوکری کی کوشش کرو۔ اس طرح تمہیں بہت سہولت ہوجائے گی۔ بیٹی بہت مختصر سا ورد تمہیں دے رہا ہوں۔ کیونکہ جانتا ہوں کہ تمہارے لیے تو فرض

نمازیں بھی ادا کرنا مشکل ہوتا ہوگا۔ بس چلتے پھرتے اللہ اکبر کا ورد کیا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا بھی اہتمام کروں گا اللہ تمہیں اس آزمائش میں سرخرو فرمائے۔

□ توصیف احمد۔ اٹک

 o: بابا جی کئی سالوں سے گھر والوں سے دور روزگار کے سلسلے میں رہ رہا ہوں۔ بوڑھے والدین' بچے سب سے دور ہوں مہمانوں کی طرح گھر جاتا ہوں۔ سفر کی تھکن ہی نہیں اترتی کہ واپس آنا پڑتا ہے۔ بابا جی میں چاہتا ہوں کہ اپنوں کے درمیان رہوں' والدین کی خدمت کروں، بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتا دیکھوں۔ مگر لاکھ کوشش کے بعد بھی گھر کے قریب نوکری نہیں ملتی ہر بار ٹوٹے دل کے ساتھ واپس لوٹ جاتا ہوں۔ بابا جی آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ مجھے ایسا تعویذ عطا کیجیے جس کی برکت سے میں اپنے وطن میں ہی نوکری کرسکوں۔ وظیفہ نہیں کرسکوں گا نوکری بہت سخت ہے۔

☆ بیٹے توصیف! تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں پردیس میں رہنا کتنا مشکل ہے یہ وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس نے پردیس میں زندگی گزاری ہو۔ تم مجھے اپنا مکمل پتا ارسال کردو تاکہ تعویذ تیار کرکے تمہیں ارسال کیا جاسکے۔ مختصر سی دعا بھی دوں گا جو تم بھی پڑھنا اور اپنی بیگم سے کہنا وہ بھی پڑھے۔ اللہ ضرور اسباب پیدا کرے گا۔

□ چوہدری نزاکت، مانچسٹر (انگلینڈ)

o: جناب بابا جی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے اپنے جس کام کے لیے آپ سے براہِ راست وظیفہ منگوایا تھا، وہ دوسری بار وظیفہ پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے حسب مرضی ہوگیا ہے۔ آپ کا شکریہ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو نیک صلہ دے (آمین) میرا ایک مسئلہ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ میرا ایک کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کے لیے مجھے آپ سے تعویذ درکار ہے۔ جواب رسالے میں دے دیں۔ شکریہ۔

☆: بیٹے نزاکت! رب کریم نے تم پر کرم فرمایا، اس کا شکریہ ادا کرتے رہنا اور نماز میں بھی غفلت نہ برتنا۔ تعویذ کے لیے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔ مسئلے کیلئے صرف پندرہ دنوں کا وظیفہ دے رہا ہوں۔ بارہ روز تک روزانہ بارہ سو مرتبہ پڑھو اول وآخر سات سات مرتبہ درود شریف۔ انشاء اللہ تعالیٰ کرم ہوگا۔ یا بدیع العجائب بالخیر یا بدیع

□: رفیعہ بی بی، مظفر گڑھ

o: جناب بابا جی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! میں نے آپ سے اپنی بچیوں کے رشتے کے لیے جو تعویذ منگوایا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری دو بچیوں کے رشتے ہوگئے ہیں۔ اب ایک باقی ہے۔ اللہ پاک نے چاہا تو اس کا بھی جلدی ہوجائے گا۔ پروردگار آپ کو بھی حیاتی دے تاکہ آپ ہم سب جیسے لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ آمین۔ آپ کا بہت شکریہ بابا جی۔

☆: بیٹی رفیعہ! جو کچھ بھی ہوتا ہے غفور الرحیم ہی کی رضا سے ہوتا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتی رہنا اور نماز کی پابندی جاری رکھنا۔ بیٹیوں کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔ ہمیشہ سکھی رہیں گی۔

□: شمیم بانو، حیدرآباد

o: بیٹی شمیم! رب رحیم تمہارے مسائل حل فرمائے، آمین۔ بیٹی تم نے تو بہت سے مسائل لکھ دیے ہیں جب کہ صرف دو مسئلے لکھنا چاہیے تھا۔ جو حالات تم نے لکھے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ تمہارے گھرانے میں نہ نماز روزے کی پابندی کی جاتی ہے، نہ عبادت الٰہی۔ بیٹی! سب سے پہلے تو سب لوگ پابندی سے نماز ادا کریں۔ رزق روزی کی کشادگی اور برکت کے لیے وظیفہ دے رہا ہوں۔ نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ جھوٹ، حسد اور غیبت سے پرہیز ضروری ہے۔ نماز فجر کے بعد سورۃ رحمٰن کی تلاوت کرو اور نماز عشاء کے بعد گیارہ تسبیح یا معز اول وآخر گیارہ مرتبہ درود شریف، مدت ایک ماہ ہے۔ پھر مجھے مطلع کرنا۔

☐: شاہ محمد ۔ جام پور

○: جناب بابا جی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے آپ سے اپنے مقدمے کے لیے جو وظیفہ منگوایا تھا۔ سے مکمل کیا مگر تاریخیں بڑھتی رہیں اور فیصلہ نہ ہوا تو میں نے یہی وظیفہ دوبارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا جس کے لیے آپ کا شکریہ! اللہ تعالیٰ آپ کو نیک اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بیٹے شاہ محمد! میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک عاجز و عاصی بندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر کرم فرمایا ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرو اور کرتے رہنا اور نماز ہمیشہ پابندی سے پڑھنا۔

☐: نذیراں بی ۔ کراچی

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! مجھے کافی عرصے سے دادکی مکروہ بیماری تھی۔ میں نے اس کا بہت علاج کروایا مگر وہ کسی دوا سے ٹھیک نہ ہوئی تو کسی نے آپ کی دوا کے بارے میں بتایا۔ میں نے آپ کی دوا منگوائی تو اس کے استعمال سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ دوسری بار دوا کے استعمال سے بفضل خدا مجھے اس مکروہ بیماری سے نجات مل گئی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو خلق خدا کی خدمت کا نیک اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بیٹی نذیراں! شفا دینے والی ذات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے بس اسی کا ہمیشہ شکر ادا کرتی رہو اور نماز میں کبھی غفلت نہ برتنا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہر بیماری سے محفوظ رہو گی۔

☐: ہمینہ گل ۔ پشاور

○: اچھے بابا جی! اسلام علیکم آج میں کوئی مسئلہ لے کر نہیں بلکہ ایک خوشخبری سنانے حاضر ہوئی ہوں۔ میں نے جس کام کے لیے آپ سے براہِ راست تعویذ منگوایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ غیر برادری میں شادی نہیں کرتے مگر اللہ تعالیٰ کے کلام کی برکت سے میرے والدین راضی ہو گئے اور میری شادی اسی سے ہو گئی جسے میں دل سے چاہتی تھی۔ اب جلد ہی میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکا چلی جاؤں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے تاکہ آپ اسی طرح ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہیں۔ آمین۔ مجھے اور میرے شوہر کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆: بیٹی ہمینہ! باری تعالیٰ تمھیں شاد و آباد رکھے۔ (آمین) کوئی کام خالق و مالک کائنات کی رضا کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہمیشہ اس کا شکر ادا کرتی رہنا اور نماز سے کبھی غفلت نہ برتنا۔ اپنے شوہر کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔

☐: یاسمین ۔ گجرات

○: بیٹی یاسمین! جو خط مجھ تک پہنچ جاتا ہے اس کا جواب ضرور دیتا ہوں۔ البتہ باری کی وجہ سے دیر ہو سکتی ہے کیونکہ جواب باری آنے پر دیتا ہوں۔ جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے تو باری تعالیٰ تمہاری جائز خواہش پوری فرمائے۔ آمین۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

☐: قاری محمد انور ۔ چیچہ وطنی

○: بیٹے محمد انور! باری تعالیٰ تمھیں ہر مرض سے محفوظ رکھے۔ (آمین) بیٹے! سورۃ فاتحہ اپنے اندر شفا کی بڑی تاثیر رکھتی ہے۔ یہ اچھا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے نماز کے پابند ہیں۔ نماز فجر کے بعد اگر یہ سورۃ اس کے حروف کی تعداد کے برابر یعنی 125 مرتبہ پڑھی جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہتری ہو گی۔ گھر میں جسے بھی تکلیف ہو، وہ بھی یہی عمل کرے۔ مدت کا کوئی تعین نہیں۔ جب تک افاقہ نہ ہو، یہ عمل جاری رکھنا چاہیے۔

☐: محمد عالم ۔ لاہور

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! مجھے اکثر گلے کی تکلیف رہتی تھی۔ میں علاج کروا کروا کے تھک گیا تھا۔ وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا تھا مگر مکمل طور پر شفا نہیں ہوتی تھی۔ کسی کے مشورہ دینے پر میں نے آپ کی دوا آزمائی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے گلوں کی تکلیف بالکل ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت خلق کا نیک

اجر اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بیٹے عالم! باری تعالیٰ تمھیں صحت مند رکھے۔ آمین۔ اس رب عظیم کا شکر ادا کرو اور ہمیشہ کرتے رہنا جس نے تمھیں شفا بخشی ہے۔ نماز کی بھی پابندی جاری رکھنا۔

□: نور مہدی۔ راولپنڈی

 o: جناب باباجی! السلام علیکم! میں نے اپنے والد صاحب کی بیماری کے لیے آپ سے جو تعویذ منگوایا تھا۔ اس کی برکت سے بفضل خدا میرے والد صاحب صحت یاب ہو گئے ہیں۔ آپ کا شکریہ بابا جی! اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں ان کا مہنگا علاج کروا سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا نیک اجر دے اور لمبی زندگی عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح مخلوق خدا کی مدد کرتے رہیں۔ آمین۔

☆: بیٹے مہدی! میں تو اللہ تعالیٰ کا نہایت عاجز اور عاصی بندہ ہوں۔ شفا دینے والی ذات تو اس رحیم و کریم کی ہے جو مالک کائنات ہے۔ اس کا شکر ادا کرو اور ہمیشہ کرتے رہنا۔ نماز میں کبھی غفلت نہ برتنا اور ہاں، والد کی صحت یابی پر حسب توفیق صدقہ و خیرات بھی دے دینا۔

□: محمد تغلق۔ کوہاٹ

o: بیٹے تغلق! باری تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ آمین۔ پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لو کہ رب کریم کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ہم عاجز بندے اللہ تعالیٰ سے صرف دعا ہی کر سکتے ہیں جو درخواست ہوتی ہے۔ وہ کب منظور ہوتی ہے یا کیوں منظور نہیں ہوئی، یہ صرف مالک کائنات ہی جانتا ہے۔ دونوں مسئلوں کے لیے ایک بہت سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ نماز کی مکمل پابندی کرنا۔ کسی بھی نماز کے بعد ایک ہزار مرتبہ ''یابدیع السموات والارض'' پڑھ کر پورے یقین اور یکسوئی کے ساتھ گڑگڑا کر حاجات کی قبولیت کے لیے دعا مانگو۔ کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

کمزور عشق

مولانا رومیؒ ایک دن خرید وفروخت کے سلسلے میں بازار تشریف لے گئے۔ ایک دکان پر جا کر رک گئے۔ دیکھا کہ ایک عورت کچھ سودا سلف خرید رہی ہے۔ سودا خریدنے کے بعد اس عورت نے جب رقم ادا کرنا چاہی تو دکان دار نے کہا۔ ”عشق میں پیسے کہاں ہوتے ہیں، چھوڑو پیسے اور جاؤ۔“ اصل میں یہ دونوں عاشق اور معشوق تھے۔ مولانا رومیؒ یہ سن کر غش کھا کر گر پڑے۔ دکان دار سخت گھبرا گیا۔ اس دوران میں وہ عورت بھی وہاں سے چلی گئی۔ خاصی دیر بعد جب مولانا رومیؒ کو ہوش آیا تو دکان دار نے پوچھا۔ ”مولانا! آپ کیوں بے ہوش ہوئے؟“ مولانا نے جواب دیا۔ ”میں اس بات پر بے ہوش ہوا کہ تم میں اور اس عورت میں عشق اتنا قوی اور مضبوط ہے کہ دونوں میں کوئی حساب کتاب نہیں جبکہ اللہ کے ساتھ میرا عشق اتنا کمزور ہے کہ میں تسبیح گن کر کرتا ہوں۔“

مولانا رومیؒ کی تصنیف ”حکایاتِ رومیؒ“ سے اقتباس

انتخاب: شہزاد خان، پشاور۔

فیصلے کا لمحہ

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسے لمحات نہیں آتے، ٹھیک وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی غلط فیصلہ ہو بھی جائے تو اس کی ذمے داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہیں جو بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں، ان کی حفاظت کو کرنا ہوگی۔ دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر تاریخی فیصلے غلط تھے لیکن تاریخی تھے۔ تاریخ اپنا بیشتر کام انسان کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے۔ انسان راہ چلتے چلتے دوزخ جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے جنت میں جا پہنچتا ہے۔ جنت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

واصف علی واصف کی تصنیف سے رضوانہ کوثر، لاہور کا انتخاب۔

تلاش گم شدہ

☆ رشوت کی گلی میں ہمارا ایمان کھو گیا ہے، کہاں ملے گا؟

☆ گھر سے اخلاق گم ہو گیا ہے، کہاں ملے گا؟

☆ دہشت گردی کی آگ بجھانے والا اسپرے گم ہو گیا ہے، کہاں سے ملے گا؟

☆ بے حسی کی بیماری میں لگانے والا خلوص و محبت کا انجکشن گم ہو گیا ہے، کہاں سے ملے گا؟

☆ شرافت ہمیں چھوڑ کر کہیں فرار ہو گئی ہے، کہاں سے ملے گی؟

مرسلہ: انور شیخ۔ حیدرآباد

محبت

تمہیں پتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ جنوں کی حد تک محبت کرتا ہوں کیونکہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ بے شک تم نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں اتنا بھی پاگل نہیں کہ تمہاری خوبصورت آنکھوں میں اپنے لیے محبت نہ دیکھ سکوں تم چاہو بھی تو اس بات سے انکار نہیں کر سکتی کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔

انتخاب: رفعت، بہاولنگر

وٹامن ڈی کے فوائد اور حصول کے ذرائع

اصل میں وٹامن ڈی ایک ہارمون ہے جو مسلز کو مضبوط بناتا ہے اور کیلشیئم کو نہ صرف جسم میں جذب کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ جہاں ضرورت ہوتی ہے' وہاں پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ وٹامن ڈی کی معقول مقدار جسم میں نہیں ہوگی تو کیلشیئم سے مالا مال غذا یا سپلی منٹ کا بہترین استعمال نہیں ہو سکے گا۔

اگرچہ یہ جلد میں دھوپ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے مگر ڈاکٹرز یہ مشورہ دیتے ہیں کہ جو لوگ 40 سال سے اوپر کے ہو گئے ہیں' انہیں وٹامن ڈی سپلی منٹ لینی چاہیے کیونکہ عمر کی بڑھوتری کے ساتھ جلد کی کارکردگی ہلکی ہو جاتی ہے۔

اس کے دیگر ذرائع میں فورٹی فائڈ فوڈ اور چکنائی والی مچھلی مثلاً سالمن' کیلشیئم کی طرح وٹامن ڈی کو جسم میں اسٹور کیا جا سکتا ہے اس لیے اس کی سطح ہمیشہ اوپر رکھی جا سکتی ہے۔

مرسلہ۔ عمر العطاس' حیدر آباد

قابلیت کی ویلیو

جناب کیسی ہے یہ یونیورسٹی؟ ایک اسٹوڈنٹ نے ایم بی اے کا فارم فل کرتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔

''بہت اچھی ہے میں نے بھی یہاں سے ہی ایم بی اے کیا تھا۔'' چوکیدار بولا۔

حسن انتخاب: کرن شبیر، کراچی

غزل

آتے ہیں روز گھر میں جو مہمان بے شمار
ہم نے اٹھائے ان سے بھی نقصان بے شمار

اس شہر انتشار میں جینا محال ہے
چاروں طرف ہیں موت کے سامان بے شمار

صحرا نگل گیا ہے مسافر کو رات میں
مل جائیں یوں نہ خاک میں انسان بے شمار

اس شہر اجنبی میں پہنچ کر لگا مجھے
واقف بہت ہی تھوڑے ہیں انجان بے شمار

عامر جفا وجور کے قصے طویل ہیں
بننے لگے جو جنگ کے عنوان بے شمار

شاعر: عامر ثانی

سرکاری ملازم

ایک سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے ایک صاحب وقفے وقفے سے فون کر رہے تھے۔ صبح سے دوپہر تک انہیں مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔

''صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔ کچھ دیر پہلے صاحب کا فون آیا تھا کہ انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ جی ہاں' وہ آئے تھے لیکن ابھی بڑے صاحب نے انہیں میٹنگ کے لیے بلالیا ہے۔ جی' وہ ابھی میٹنگ سے نہیں آئے۔ اب تو وہ لنچ کے لیے چلے گئے ہیں۔''

دوپہر دو بجے کے بعد ان صاحب کو مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ''بس وہ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ نہیں' وہ ابھی تک نہیں آئے' آپ پیغام دے دیجیے۔ وہ بلڈنگ میں ہی کہیں ہیں۔ ان کی واسکٹ کرسی پر لٹکی ہوئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں' مجھے پکا پتا نہیں ہے کہ وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟ جی ہاں' ان کا موبائل آف ہے۔

ارے جناب! وہ آئے تھے لیکن بس دو منٹ پہلے ہی چھٹی کر گئے ہیں۔ اب تو ویسے بھی آفس بند ہی ہو رہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں تالا ہے۔"

حسنِ انتخاب: سلمان عمرانی' سجاول

ضعیف ترین

بے نیاز اور لاابالی فلسفی نے اپنے کسی شاگرد کو خط کے جواب میں لکھا۔ "تم نے پوچھا ہے کہ دنیا کا ضعیف ترین آدمی کون ہے؟ یوں تو اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن میں بات کو طول دینا نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک دنیا کا ضعیف ترین انسان وہ ہے جو اپنی خواہشات پر غالب نہیں آپاتا۔"

مرسلہ۔ فیصل بخت۔ پشاور

رائل سعودی لینڈ فورسز (RSLF)

سعودی عرب کی بری یا زمینی افواج کا آفیشل نام رائل سعودی لینڈ فورسز (RSLF) ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر ملک کے شمال میں کویت کی سرحد کے قریب کنگ خالد ملٹری سٹی' حفرالباطن میں واقع ہے۔ سعودی زمینی فوج کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے اور یہ دنیا کی 15 ویں بڑی آرمی سمجھی جاتی ہے۔ سعودی بری فوج کئی جنگیں لڑنے کا تجربہ رکھتی ہے۔ 1902ء سے 1933ء تک مملکتِ سعودیہ کی تشکیل کے دوران لڑی گئی طویل جنگ کے علاوہ سعودی آرمی نے 1948ء میں اسرائیل کے خلاف عربوں کی جنگ میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور تین ہزار سے زیادہ فوجیوں کی شہادت کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ 1967ء میں سعودی آرمی کے 20 ہزار اہلکاروں نے اُردن میں خدمات انجام دیں۔ 1969ء میں جنوبی یمن کی فوج نے سعودی عرب کے سرحدی شہر الوادیہ پر حملہ کیا' تاہم سعودی آرمی نے حملہ آور فوج کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ 1973ء میں جنگِ اکتوبر کے دوران امریکی مداخلت کے خلاف سعودی عرب نے خلیج کے دیگر ممالک کے ساتھ مل کر احتجاج کرتے ہوئے تیل کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا اور شام کے محاذ پر لڑنے کے لیے اپنے تین ہزار فوجیوں کو اُردن میں تعینات کر دیا۔ 1990-91ء میں کویت پر عراقی فوج کے قبضے کے بعد سعودی بری فوج نے امریکا اور دیگر اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگِ خلیج میں حصہ لیا اور کویت کو آزاد کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مرسلہ۔ نازلی عمر۔ جاتی' سندھ

غزل

نہ طلب ہے مجھ کو زمین کی نہ نئے مکاں کی تلاش ہے
جہاں ایک بار جھکا تھا سر اُسی آستاں کی تلاش ہے
نہیں مال و زر کی ہے جستجو نہ دیارِ غیر کی آرزو
جہاں نیند آئے سکون سے مجھے اس جہاں کی تلاش ہے
جو گلوں کا حسن نکھار دے جو فضا کو رنگ بہار دے
جو چمن کو پھر سے سنوار دے اسی باغباں کی تلاش ہے
میرا حال سب سے جدا سہی مری بات سب سے الگ سہی
جو قریب سے مجھے سن سکے اسی مہرباں کی تلاش ہے

شاعرہ: سمیعہ نسیم۔ پٹنہ بہار۔ بھارت

زندگی

ہر انسان زندگی کو اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ یہ سات رنگوں میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ زندگی خوابوں کا خوبصورت جزیرہ ہے جبکہ کوئی اس کو ٹوٹے خوابوں کا قبرستان کہتا ہے۔ کسی کی نظر میں یہ پھولوں کی سیج ہے تو کسی کی نظر میں کانٹوں کا بستر ہے۔ کوئی اس کو محبت کا پھول کہتا ہے تو کوئی اس کو نفرت اور جدائی کے کانٹوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ غم کا دریا ہے اور کوئی اس کو خوشیوں کا جھرنا کہتا ہے۔ کوئی اس کو تاریکی اور کوئی روشنی کہتا ہے۔ کسی کی نظر میں یہ آنسو اور کسی کی نظر میں دل آویز مسکراہٹ ہے۔ کوئی اس کو محبت کا نغمہ اور کوئی اس کو جدائی اور غم کا مرثیہ کہتا ہے لیکن میری نظر میں زندگی سخت سردی میں تھر تھر کانپتے اس معصوم بچے کے سر پر دستِ شفقت رکھنا ہے جو ماں باپ کی محبت سے محروم ہو چکا ہو۔

مرسلہ۔ شہزادی بانو' بدین



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

مقصود شاہانی......حیدرآباد

میں اک اداس پرندے کے پاس بیٹھی تھی
پھر ایک دم ہی میرے ہاتھ پھڑ پھڑانے لگے

ابوہریرہ بلوچ......بورے والا

جبر ہوتا نہیں محبت میں
جب مناسب ہو میرے ہو جانا

عبدالعزیز جی آ......چکوال

اک مری ہی یاد سے پرہیز ہے آپ کو
نہ جانے کس طبیب سے دوا لیتے ہو

آریان خان......کراچی

عشق ٹوٹا تو استخارہ کیا
پھر اسی عشق کو دوبارہ کیا

رانا حبیب الرحمٰن......ٹوبہ ٹیک سنگھ

وہ ایک خط جو اس نے کبھی لکھا ہی نہیں
میں روز بیٹھ کے اس کا جواب لکھتا ہوں

حمزہ خان......کراچی

کس مسافت کے بعد پہنچا ہے
تیرے رخسار تک مرا آنسو

احسن عمرانی......سجاول

نازک لگتے تھے جو حسین لوگ
واسطہ پڑا تو پتھر کے نکلے

احسن رضوی......کراچی

تم بہت جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں

نہ کرو بحث ہار جاؤ گے
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

ابوذر غفاری......بہاول نگر

ایک سائل کو مرے دل کی ضرورت ہے مگر
ہائے گھر والے سخاوت نہیں کرنے دیتے

محمد فیاض محمود......کراچی

میں حادثوں کو عجب مشکل میں ڈال دیتا ہوں
سفر سے پہلے ہی صدقہ نکال دیتا ہوں

کرن شہزادی......راولپنڈی

ہوئی جو صبح تو وہ مجھ سے لڑنے آئے
کہ تم ہوتے کون ہو مرے خوابوں میں آنے والے

محمد جواد انور......اسلام آباد

صرف تصویر رہ گئی باقی
جس میں ہم ایک ساتھ بیٹھے ہیں

عبدالستقیم قریشی......کراچی

ہر کسی کے ہاتھوں بک جانے کو تیار نہیں
یہ میرا دل ہے شہر کا اخبار نہیں

عظیم الدین......حیدرآباد

محبت واجب تھی ہم پر جو ہم نے کرلی
وفا فرض ہے تم پر، دیکھتے ہیں ادا کرتے ہو یا قرض......

غیاث الدین......پشاور

شوقِ تعبیر کی پڑی ہوئی ہے
دکھ کی تاثیر کی پڑی ہوئی ہے
پہلے مسمار کیوں کیا تھا مجھے

اب جو تعبیر کی پڑی ہوئی ہے

رضوانہ کوثر.........لاہور

زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا ملا
اجنبی دیوار و در، ویران گھر، تنہائیاں

فیضان خورشید.........حیدرآباد

رکی ہوئی ہیں گردشیں، نظام چل نہیں رہا
گیا وہ جب سے چھوڑ کے سے بدل نہیں رہا
ہر ایک شے ہے آس پاس جوں کی توں رواں دواں
پر مری گرفت میں وہ ایک پل نہیں رہا

اسامہ بلال اعوان.........داروغہ والا، لاہور

ہم نے تاخیر سے سیکھے ہیں محبت کے اصول
ہم پہ لازم ہے کہ عشق دوبارہ کرلیں

اشعر عتیق.........کراچی

دیواریں چھوٹی ہوتی تھیں لیکن پردہ ہوتا تھا
تالے کی ایجاد سے پہلے صرف بھروسا ہوتا تھا
شکر کرو تم اس بستی میں بھی اسکول کھلا ورنہ
مرجانے کے بعد کسی کا سپنا پورا ہوتا تھا

عبدالغفار عابد.........چیچہ وطنی

جب تک ماتھا چوم کے رخصت کرنے والی زندہ تھی
دروازے کے باہر تک ہی منہ میں لقمہ ہوتا تھا

نور زمان.........پشاور

خدا کرے کہ وہم ہو خدا کرے کہ خیر ہو
بہت دنوں سے اس طرف چراغ جل نہیں رہا

شبانہ زمان.........سکھر

کیا خبر اگلے سفر میں نہ زمیں مجھ کو ملے
مشت بھر خاک اٹھانے کی تو مہلت دے دے

نور العین.........اسلام آباد

جا رہا ہے وہ ریل گاڑی میں
بجھ رہا ہے دماغ میں سورج
اس نے صدقہ کیا تھا اک آنسو
بن گیا وہ چراغ میں سورج

نسیم سحر.........اسلام آباد

اک قطرہ کہیں سمندر تھا
اور مری دسترس سے باہر تھا
دھوپ کی مہربانیوں کے سبب
میرا سایہ میرے برابر تھا

حاشم وقاص.........لاہور

ساتھی تھی ہم سفر تھی شریکِ سخن تھی وہ
تاریکوں میں رات کی صبح کرن تھی وہ

برہان الدین.........پشاور

جب پلکوں کے روزن سے جھانکا ایک بار
اس لمحے میری آنکھوں کو اک خواب لگا تھا
کیوں کاتبِ تقدیر نے کھینچی ہیں لکیریں
جب غور سے دیکھا تو تیرا نام لکھا تھا

شاہدہ ناز.........کاموکے

کتابِ زیست کے صفحے وفا سے خالی ہے
وہ چاہتوں کا فسانہ تلاش مت کرنا
تمہارے ذکر سے تم کو کہیں نہ زک پہنچے
میرا کلام پرانا تلاش مت کرنا

سدرہ نور.........بٹ گرام

تم میری آنکھوں میں بن کے تصویر رک گئے ہو
یا سارے عالم پہ کوئی لمحہ ثبات کا ہے

کوپن برائے

تیر نیم کش

اکتوبر 2016ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: